حدیث اور علوم حدیث کے تعارف تدوین و حفاظت
اور اسلام میں اس کی حجّیت و استنادی حیثیت، نیز
اس بارے میں پیش کردہ شکوک و شبہات اور مغالطوں
کے ازالے پر گرانقدر علمی مقالات کا مجموعہ۔

ناشر:
دارُالعِلم
۶۹۹ - آبپارہ مارکیٹ، اسلام آباد | پاکستان

عظمتِ حدیث

تالیف:

مولانا عبدالغفار حسن

سابق استاذِ حدیث، اسلامی یونیورسٹی، مدینہ منورہ

رکن، اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

ان حضرات کے مقالات بھی شامل ہیں:

مولانا عبدالجبار عمرپوری رحمہ اللہ ، مولانا حافظ عبدالستار حسن عمرپوری رحمہ اللہ

مولانا صہیب حسن

ایم اے، ایم فل، فاضل اسلامی یونیورسٹی، مدینہ منورہ،

صدر، قرآن سوسائٹی، لندن

ناشر:

دارالعلم

۶۹۹، آب پارہ مارکیٹ

اسلام آباد — پاکستان

فون نمبر: ۸۱۵۳۷۱

طبع اوّل ——— ذوالقعدہ ۱۴۰۹ھ
جون ۱۹۸۹ء

تعداد ——— ۱۱۰۰

قیمت :- ۷۲/- روپے

طابع :- ——— ایس ۔ ٹی پرنٹرز گوالمنڈی
راولپنڈی

04954

ملنے کے پتے

یہ کتاب "دارالعلم" اسلام آباد کے علاوہ ان کتب خانوں سے بھی مل سکتی ہے :-

(۱) سبحانی اکیڈمی اردو بازار لاہور ۔

(۲) نعمانی کتب خانہ ، اردو بازار لاہور

(۳) اسلامی اکادمی ، اردو بازار لاہور

(۴) فاروقی کتب خانہ اردو بازار لاہور

(۵) آزاد بک ڈپو ، اردو بازار لاہور

(۶) آزاد بک ڈپو ، اردو بازار سرگودھا ۔

(۷) فاروقی کتب خانہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان ۔

(۸) قدیمی کتب خانہ مقابل آرام باغ ۔ کراچی

(۹) اسلامک پبلشنگ ہاؤس شیش محل روڈ لاہور ۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

عرصہ سے تمنا تھی کہ خاندان عمر پور کے اہل علم واصحاب قلم کی ان علمی اور تحقیقی خدمات کو یکجا طور پہ شائع کر دیا جائے جو دفاع عن السنۃ اور حمایت حدیث کے لئے انہوں نے انجام دی ہیں۔

"وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کی روشنی میں اس خاندان کی خوش بختی کا اظہار مناسب بلکہ مستحسن ہے۔ جس کی چار پشتیں! اس مقدس فریضہ کے انجام دینے میں مشغول رہی ہیں۔

عمر پور یہ ایک مختصر سا گاؤں ہے، جو ضلع مظفر نگر یوپی (ہند) میں واقع ہے۔ واضح رہے کہ مظفر نگر، میرٹھ، اور سہارن پور کے درمیان آباد ہے۔ یہ تینوں اضلاع علمی لحاظ سے مردم خیز سمجھے جاتے ہیں، اس علاقہ کی بہت سی نامور ہستیوں نے نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام میں اپنی دینی اور علمی خدمات کی بنا پہ شہرت وعظمت حاصل کی ہے۔

اس کتاب میں خاندان عمر پور کے حسب ذیل افراد کے مقالات بسلسلہ حمایت حدیث جمع کئے گئے ہیں۔

۱۔ حضرت مولانا عبد الجبار محدث عمر پوریؒ ثم الدھلوی، مدیر ماہنامہ ضیاء السنۃ

۲۔ حضرت مولانا حافظ عبد الستار حسن " " مؤلف، اثبات الخبر فی ردّ منکری الحدیث والاثر"

۳۔ عاجز خاکسار عبد الغفار حسن " فارغ التحصیل دار الحدیث رحمانیہ دہلی۔

۴ - عزیزی صہیب حسن سلمہٗ ایم اے عربی، فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ، ایم فل (حدیث) برمنگھم یونیورسٹی انگلینڈ، صدر قرآن سوسائٹی لندن۔

ان افراد کے علاوہ خاندان کے حسب ذیل چشم وچراغ کا تذکرہ بھی افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ ان میں سے اکثر حضرات کی بھی دینی اور علمی خدمات کچھ کم نہیں۔

۱ - مولانا عبدالرحمٰن معین الدین صاحبؒ والد مولانا عبیدالرحمٰن صاحبؒ

۲ - مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب عمرپوری نگران مسئول ماہنامہ ضیاء السنۃ، کلکتہ، برادر خورد مولانا عبدالجبار محدّث مرحوم۔

۳ - مولانا حکیم عبیدالرحمٰن عمرپوریؒ ثم الدھلوی، مدیر ماہنامہ "ریاض التوحید" دھلی، عم زاد مولانا عبدالجبار عمرپوری۔

۴ - مولانا عبداللہ سلفی صاحبؒ، سابق استاذ اسلامیات، حلیم مسلم ہائی اسکول کان پور۔

۵ - مولانا عبیداللہ بن مولانا عبیدالرحمٰن۔ ساری عمر درس وتدریس میں گذاری۔

۶ - مولانا عبدالوکیل خطیب۔ سابق استاذ اسلامیات مقبول عام ہائی اسکول کراچی، فاضل دارالحدیث رحمانیہ دھلی۔

۷ - مولانا عبدالجلیل فیصل ندوی۔ سابق استاذ اسلامیات مقبول عام ہائی اسکول کراچی۔

۸ - ڈاکٹر محمد عثمان عمرپوری خلف الرشید مولانا ضیاء الرحمٰن مرتب ترجمہ قرآن مجید مع حواشی مفیدۃ بہ اسلوب جدید

۹ - عزیزی سہیل حسن سلمہ۔ ایم اے (حدیث) از جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ۔ حال استاذ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، مؤلف "السنن والآثار فی النہی عن التشبہ بالکفار"۔

۱۰ - عزیزی راغب حسن سلمہ، حامل شہادہ ثانویہ علیا از کلیۃ الحدیث، جامعہ

اسلامیہ مدینہ طیبہ، و فاضل جامعہ تعلیمات[1] اسلامیہ فیصل آباد
مرتب بترتیب جدید "ذخائر المواریث فی الدلالۃ علی مواضع الحدیث"
(غیر مطبوع) -

تفصیلی تعارف

۱- مولانا عبدالجبار عمرپوری

۱ - مولانا عبدالجبار عمرپوری محدث کبیر و شاعر عظیم، نام و ولدیت - عبدالجبار بن الشیخ منشی بدرالدین مرحوم عمرپوری، سنہ پیدائش ماہ جمادی الاخریٰ ۱۲۷۷ھ

۱- مشاہیر اساتذہ کرام کے اسماء گرامی

۱ - قاری عبدالعلی، نزیل امرتسر و دیگر علمائے امرتسر
۲ - مولانا الشیخ محمد مظہر النانوتوی رح، سے فقہ، اصول فقہ، اور چند کتب حدیث کا درس لیا -
۳ - مولانا الشیخ احمد علی سہارن پوری سے فقہ، اصول فقہ اور چند کتب حدیث کا درس لیا -

---

[1] جامعہ تعلیمات اسلامیہ اس دور کی منفرد درس گاہ ہے جس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا ہے - اس کے بانی اور مہتمم مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ہیں، جو شب و روز اس درس گاہ کی توسیع و ترقی کیلئے کوشاں رہتے ہیں جزاہ اللہ احسن الجزاء -
یہ درس گاہ ۱۹۵۷ء میں قائم ہوئی تھی، جب سے برابر ترقی کی منازل طے کر رہی ہے
(ع ح)

۴ - مولانا الشیخ فیض الحسن سہارن پوری سے عربی ادب اور علوم بلاغت کا درس لیا -

۵ - مولانا الشیخ احمد حسن، سے منطق فلسفہ وغیرہ کا درس لیا -

۶ - مولانا الشیخ السید نذیر حسین سے طویل عرصہ تک علمی استفادہ کیا اور ان سے کتب تفسیر و حدیث، مثلاً: بخاری و مسلم، نسائی، ابن ماجہ پڑھیں، اور سندِ حدیث حاصل کی - (۱۲۹۷ھ)

۲ - مشہور تلامذہ

۱ - علامہ محقق، ادیب کبیر عبد العزیز میمنی مرحوم -

۲ - مولٰنا عبد الجبار کھنڈیلوی (جے پوری) مرحوم

۳ - مجاہد عظیم مولٰنا حافظ عبد الستار حسن خلف الرشید مولانا مرحوم مغفور -

۳ - علمی خدمات

۱ - مدرسہ دارالہدیٰ کشن گنج (حسن گنج) دہلی میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم کیا -

۲ - عوام و خواص کو روزانہ صبح کو نماز فجر کے بعد پابندی سے درسِ قرآن مجید سے مستفید کرتے رہے -

۳ - ماہنامہ "ضیاء السنۃ" جاری کیا، جو اس دور میں بلند پایہ مجلات میں شمار ہوتا تھا، اس رسالہ کے لئے مولانا (جدّ محترم) نے مولوی عبد اللہ چکڑالوی کے نظریہ کا رد کیا کہ: دین کے اصول و فروع، کلّیات و جزئیات، سب قرآن میں واضح طور پر موجود ہیں، لہذا سنت کی ضرورت نہیں ہے - جدّ محترم نے دلائل و براھین کے ساتھ کئی اقساط میں اس نظریہ کا ابطال کیا، دینی حلقوں میں یہ مضامین بہت زیادہ پسند کئے گئے - یہ رسالہ تقریباً تین سال ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۲ء سے ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۶ء تک جاری رہا - اس رسالہ

کی طباعت و اشاعت اور ترتیب و تہذیب کی نگرانی جدِ محترم کے برادرِ خورد مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب مرحوم کرتے رہے اور نہایت آب و تاب کے ساتھ کلکتہ سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے اہم مضامین جو قسط وار شائع ہوتے رہے، ان کے عنوان حسبِ ذیل ہیں۔

الف۔ خلافت اسلامی، ب۔ ولادت باسعادت (ج) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مبعوث ہونا (د) شعر و سخن (ہ)، ہندوستان میں عربی کے نامور شعراء، ردِّ قادیانیت، نبوت خلافت، فیصلہ آرہ، فصاحت و بلاغت، عصمتِ نبوی، معجزات نبوی، برکات ندوہ زبانِ عربی کی خصوصیت و فوقیت، ایام قربانی، باب الفتاوی، حرمت متعہ، تصوف وغیرہ۔

اس رسالہ میں حسبِ ذیل نامور اہل علم کے مقالات شائع ہوتے رہے۔

(الف)۔ امام العصر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رح شارح جامع ترمذی رح یعنی مؤلف تحفۃ الاحوذی۔

(ب) عالم کبیر مولانا عبدالسلام، مؤلف سیرۃ البخاری۔

(ج) خطیب خوش الحان مولانا حکیم عبیدالرحمٰن عمرپوری مدیر ماہنامہ ریاض التوحید

(د) مولانا حافظ حکیم ابویحییٰ محمد صاحب شاہ جہاں پوری۔

(ہ) مولانا ابوالنعمان اعظم گڑھی۔

(و) مولانا ضیاء الرحمٰن عمرپوری برادرِ خورد مولانا عبدالجبار محدث عمرپوری۔

۴۔ تصانیف

(الف) صمصام التوحید

(ب) ارشاد السائلین الی مسائل الثلاثین۔

(ج) تذکیر الاخوان فی خطبۃ الجمعۃ بکل لسان۔

(د) تبصرۃ الانام فی فرضیۃ الجمعۃ فی کل مقام۔

(ہ) ارشاد الانام فی فرضیۃ "الفاتحۃ" خلف الامام۔

تفسیر و حدیث اور دوسرے دینی علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری میں بھی یگانہ

زود گو تھے، عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں ان کے قصائد عوام و خواص میں مقبول ہوئے۔ ماہنامہ ضیاء السنۃ کلکتہ کے اوراق گواہ ہیں۔ اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے درو دیوار بھی اس پر شاہد ہیں، ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں جد محترم نے عربی قصائد سنائے، جو بہت پسند کئے گئے۔ متعدد قصائد میرے پاس محفوظ ہیں، جن میں سے بعض اہم قصائد جو ندوۃ العلماء کے جلسوں میں پڑھے گئے، مولانا ابوالحسن ندوی کی کاوش سے مجھ تک پہنچے۔

جزاہ اللہ جزاءً موفوراً وشکر اللہ سعیہ۔

وفات ماہ شوال ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء میں علم و تقویٰ کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ اور اپنے استاذ محترم شیخ مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا سید نذیر حسین رح کے قریب سیدی پورہ قبرستان دہلی میں مدفون ہوئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

محترم ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مرحوم نے جد محترم کے حالات ان الفاظ میں تحریر کئے ہیں:

"مرحوم بہت ذکی الحس تھے کہ اواخر عمر میں مکفوف البصر ہو جانے پر بھی درسیات عمدگی سے پڑھاتے، وعظ عالمانہ اور مؤثر ہوتا، نماز فجر کے بعد بلا ناغہ ترجمہ قرآن پڑھاتے، شعر و سخن میں بھی ملکہ تھا۔ اور شاعرانہ تعلیوں سے مبرا ۷۵ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنی یادگار ایک الولد الصالح مولوی حافظ عبدالستار چھوڑا، جو اسی سن میں آغوش پدری میں جا سوئے۔"

مولوی عبدالرحمن مئوی نے ذیل کی رباعی میں مادۂ تاریخ وفات نکالا:

مجی آہ چوں رحلت نمود ۔۔۔ بجستم سال تاریخ وفاتش
بحسن سعی اس مشکور با ۔۔۔ ندا زد ہاتفے، مغفور باد!

۱۳۳۴ھ

دوسری تاریخ وفات نکلی ہے، رضوان من اللہ الملک ۱۳۳۴ھ

۲ - مولانا حافظ عبدالستار عمر پوری

ولدیت: خلف الرشید مولانا حافظ عبدالجبار عمر پوری محدث دہلوی،

سن پیدائش: ۱۳۰۱ھ۔

اساتذہ کرام

۱ ۔ مولانا عبدالرحمٰن معین الدین صاحب عمرپوری (یعنی والد محترم کے نانا)

۲ ۔ مولانا عبیدالرحمٰن صاحب عمرپوری (یعنی والد محترم کے ماموں ۔

۳ ۔ مولانا محمد بشیر سہسوانی، محدث کبیر مصنف صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ الدحلان (عربی)

۴ ۔ مولانا عبدالجبار صاحب محدث عمرپوری ۔ درس نظامی کی تکمیل مدرسہ احمدیہ وسلفیہ، آگرہ میں کی، اور کلام پاک تین ماہ میں حفظ کرلیا ۔

علمی خدمات

تعلیم وتدریس کا مشغلہ رہا، رسالہ اثبات الخبر فی ردّ منکری الحدیث والأثر اور ایک رسالہ مرزا قادیانی کی تردید میں تحریر فرمایا:

اخلاق وکردار

"مرحوم خلوص وکرم کا نمونہ، اور اس شباب میں زہد وپارسائی کے مرقع تھے ۔ واحسرتا! کہ باغ عالم کی ۴۲ ویں بہار دیکھ رہے تھے کہ خود اپنا نخلِ حیات کٹ گیا، ایک صاحبزادہ مولوی عبدالغفار فارغ التحصیل دارالحدیث رحمانیہ، چھوڑا جنہیں راقم الحروف نے ۱۳۵۱ھ میں ایک بار دیکھا، اور پھر دیکھنے کی ہوس ہے"

ماخوذ از تراجم علماء حدیث ہند ص ۱۶۶ ج ۱

تلامذہ

والدِ محترم کے تلامذہ میں سے صرف نامور خطیب اور محقق مولانا محمد اسماعیل سلفی (گوجرانوالہ) مرحوم ومغفور کا نام معلوم ہوسکا ۔ مولانا موصوف نے خود مجھے بیان فرمایا کہ "میں نے آپ کے والدِ محترم سے تفسیر ابن کثیر درسًا درسًا پڑھی تھی" اور اسی تعلّق کی بنا پر مولانا موصوف نے مجھے "الروضۃ الندیّۃ"، مصنفہ نواب صدیق الحسن خان مرحوم بطور تحفہ

عنایت فرمائی، جزاہ اللہ خیر الجزاء وعفا عنہ وغفرلہ واُجزل مثوبتہ، مولانا کا یہ علمی تحفہ (قدیم مطبوعہ) ابھی تک میرے پاس بطورِ یادگار محفوظ ہے ۔

شوقِ جہاد

والدِ محترم مرحوم ومغفور کو جہاد فی سبیل اللہ کا بہت شوق تھا ۔ شہادت کی تمنّا ہر وقت دل میں موجزن رہتی تھی ، اس سلسلے میں ورزش ، تیراکی ، گھوڑسواری ، گتکا ، پٹا ، یعنی اس وقت کی رائج ورزشوں میں اچھی خاصی مہارت حاصل کی ہوئی تھی ، اور وقت کے نامور پہلوان خلیفہ عبدالقادر دھلوی سے لاٹھی چلانے کی مشق کی تھی ۔

خفیہ طور پر سرحد کے بقیۃ السیف مجاہدین یعنی سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے جانشینوں کی مالی اعانت بھی فرمایا کرتے تھے ۔ ان کے اخلاص اور ایثار کی بنا پر دہلی کے تاجر حضرات بھی ان سے تعاون کرتے تھے ، اور اس بنا پر حسبِ ذیل تاجر حضرات گرفتار ہوئے اور انگریز کی جیل میں ، شدید ترین عقوبتوں سے دوچار ہوئے ، نام یہ ہیں :

۱ ۔ ملاّ محمد اسحاق صاحب مرحوم ومغفور جن کے صاحبزادے ملاّ محمد اسماعیل مُسلم مرحوم نے کلکتہ سے ہجرت کے بعد کراچی میں رباط العلوم الاسلامیہ کے نام سے ایک عظیم علمی لائبریری قائم کی ، جس میں ہزاروں کی تعداد میں عربی ، اُردو ، انگلش کی مستند اور مفید کتابیں موجود ہیں ۔ ان کے علاوہ ملک کے مشہور رسائل وجرائد اور روزنامے بھی تازہ بتازہ برائے مطالعہ دستیاب رہتے ہیں ۔ آج کل جناب محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم کے صاحبزادے محمد یوسف صاحب اور ان کے برادران اس ادارے کی ترقی میں کوشاں رہتے ہیں ۔

اس وقت یہ عظیم لائبریری عالمگیر روڈ سوسائٹی ، کراچی کی شاندار عمارت میں واقع ہے ۔

۲ ۔ جناب عبداللہ صاحب لوہیا ، جن کی زندگی سادہ اور درویشانہ تھی ، ہر وقت غلبۂ دین اور نصرت دین کے جذبات سے سرشار رہتے تھے ۔

۳ ۔ ۴ ، خلیفہ محمد اسحاق صاحب برادر حافظ حمید اللہ صاحب یہ دونوں بھائی بھی مجاہدین کی اعانت میں سرگرم تھے ۔

۵ - جناب بشیرالدین صاحب تاجر کفش، مرحوم حاجی صاحب بھی بڑے استقلال و ایثار کے ساتھ والدِ مرحوم کے پروگرام میں ہمہ تن شریک رہے ۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی منتقل ہو گئے تھے وہیں وفات پائی ۔

۶ - مجاہدین کی اعانت کے سلسلے میں دہلی کے مشہور تاجر حاجی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم بانی مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی ۔

۷ - اور ان کے برادر مکرم شیخ عطاء الرحمٰن صاحب مرحوم، مہتمم مدرسہ مذکور بھی بڑھ چڑھ کر حصے لیتے رہے ۔

اَللّٰھُمَّ اغفرلھم وارحمھم وارفع درجاتھم فی المھدیین ، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ۔ سرگذشتِ مجاہدین ص۶۲۱ ، مصنّفہ جناب غلام رسول صاحب مہر مرحوم و مغفور ۔

والدِ محترم مرحوم بھی ہر وقت جذبہ جہاد سے سرشار رہتے تھے اور ہر لمحہ اللہ کی راہ میں شہادت حاصل کرنے کی دُھن سر پر سوار رہتی تھی ۔ اس راہ میں دوڑ دھوپ نے انگریزی حکومت کو بھی چوکنّا کر دیا تھا ۔ آخر ایک دن شام کو گرفتاری کا وارنٹ آ ہی گیا ، گھر والوں نے پولیس کو بتایا کہ آج صبح اللہ تعالےٰ کی طرف سے مولانا مرحوم و مغفور کا بلاوا آ گیا اور انہوں نے صبر و رضا کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی ۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وارفع درجتہ فی المھدیین ،

یہ سب معلومات میری دادی صاحبہ محترمہ مرحومہ نے بتائی ہیں ۔ جن کی وفات ۱۹۲۸ء میں ہوئی ۔ اللّٰھم اغفرلھا وارحمھا وارفع درجتھا فی علّیین ، مرحومہ اپنے دور میں صبر و استقامت کا پہاڑ اور زہد و تقویٰ کا نمونہ تھیں ، انہوں نے مولانا عبدالواحد غزنویؒ سے بیعت ارشاد کی ہوئی تھی ،

والدِ محترم کے انتقال پُر ملال کی خبر وحشت اثر سُن کر مولینا موصوف نے میری دادی صاحبہ کو حسبِ ذیل آیت تحریر فرمائی تھی وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا

اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۔ اور نہایت موثر انداز میں صبر کی تلقین فرمائی ۔

سنہ ۱۹۱۶ء ہمارے خاندان، خاص طور پر میری جدّہ محترمہ مرحومہ کے لئے عامِ حُزن تھا۔ اس سال جدّ محترم مولانا عبدالجبار محدّث عمر پوری نے رحلت فرمائی، اور اسی سال والدِ محترم اللہ تعالےٰ کو پیارے ہوئے، اور والدہ محترمہ بھی دُنیا سے رُخصت ہوئیں، اور اسی سال میرے برادر خورد عبدالقہار نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کی ۔ اس عامِ حزن میں راقم الحروف کی عمر چار سال کی تھی، یہ دادی صاحبہ مرحومہ کی تربیت اور ان کی مخلصانہ دعاؤں کا اثر تھا کہ زندگی کا سفر بغیر کسی کڑی آزمائش کے خوشگوار ماحول میں طے ہوتا رہا ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ آخرت کے سفر میں بھی کامیاب و کامران بنائے، اور وہاں کی ابدی سعادت سے سرفراز فرمائے ۔

اللّٰھم لا تحرمنا اجرھم ولا تفتنّا بعدھم ۔

۳۔ عبدالغفار حسن

۱ ۔ نام مع ولدیت : عبدالغفار حسن ولد مولانا حافظ عبدالستار حسن مرحوم ۔

۲ ۔ تاریخ و سنہ پیدائش : ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۱۳ء ۔

۳ ۔ **تعلیم** : درس نظامی کی مکمل طور پر تعلیم دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں حاصل کی ۔ سنہ فراغ دسمبر ۳۳ ۱۹ء

نیز سنہ ۳۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب (عربی) اور سنہ ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل (عربی) کے امتحانات پاس کئے ۔

۴ ۔ تدریسی مشاغل :

(الف) مدرسہ رحمانیہ بنارس میں سات سال، سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک تفسیر و حدیث، ادب عربی اور دیگر علوم عربیہ اسلامیہ کی تدریس کے فرائض انجام دیئے۔

(ب) مدرسہ کوثر العلوم مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں اگست ۴۲ء سے مئی ۱۹۴۸ء تک دینی علوم کی تدریس اور خطابت کا مشغلہ جاری رہا۔

(ج) جون ۱۹۴۸ء سے اکتوبر ۱۹۶۴ء تک، لاہور، سیالکوٹ، راولپنڈی، فیصل آباد، ساہیوال، کراچی، میں تدریس، تربیت، تبلیغ و دعوت کا سلسلہ جاری رہا، اور اس عرصہ میں فتویٰ نویسی کا مشغلہ بھی رہا۔

واضح رہے کہ راقم الحروف اگست ۴۱ء سے مئی ۴۸ء تک جماعت اسلامی متحدہ ہندوستان سے وابستہ رہا اور جون ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک جماعت اسلامی پاکستان کی رکنیت اختیار کی، اس دوران متعدد بار مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب ہوا، اور ۵۲ء میں جماعت کے فیصلے کے مطابق ارکان مجلس شوریٰ کے ایک وفد نے مشرقی پاکستان کا دعوتی دورہ کیا جسمیں راقم الحروف بھی شریک تھا، اور دو مرتبہ بانیٔ جماعت مولانا مودودی مرحوم ومغفور کی غیر حاضری میں امارت جماعت کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی - اور اس کے بعد طریق کار سے اختلاف کی بنا پر جماعت سے مستعفی ہو گیا۔ یعنی ستمبر ۵۷ء میں۔

(د) **تربیت**: ۱۹۵۳ء مارچ سے فروری ۵۴ء تک بسلسلۂ تحریک ختم نبوت ۱۱ ماہ سیالکوٹ اور ملتان کی سرکاری تربیت گاہوں میں گزارے۔

(ہ) اکتوبر ۱۹۶۴ء میں تدریس کے لئے اسلامی یونیورسٹی مدینہ طیبہ سے بغیر کسی درخواست کے بلاوا آگیا، جہاں ۱۶ سال، ۱۹۸۰ء تک، حدیث، علوم حدیث اور اسلامی عقائد پر محاضرات (لیکچرز) دیئے۔

اسلامی یونیورسٹی کے ماتحت متعدد کالج ہیں، راقم الحروف نے شریعت کالج، اصول الدین کالج، اور حدیث کالج میں تدریس اور محاضرات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۸۱ء سے ۸۵ء تک جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں حدیث کی مشہور اور مستند کتاب صحیح بخاری اور دوسرے علوم اسلامیہ کا درس دیتا رہا۔ دو سال سے اعزازی طور پر مدیر تعلیم کی حیثیت سے کسی نہ کسی حد تک جامعہ کے تعلیمی شعبوں کی نگرانی ہو رہی ہے۔

۸۱ء سے اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن کی حیثیت سے اہم دینی مسائل کی تحقیق کا سلسلہ قرآن وسنت کی روشنی میں جاری ہے۔

شجرۂ علمِ حدیث

رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۔ انس بن مالک رضؓ — وفات — ۹۳ھ

۲۔ حمید الطویل ابن ابی حمید ۔ ۶۸ھ تا ۱۴۳ھ

۳۔ محمد بن عبد اللہ الانصاری ۱۱۸ھ تا ۲۱۵ھ

۴۔ محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ ۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ

۵۔ محمد بن یوسف الفربری ۲۳۱ھ تا ۳۲۰ھ

۶۔ عبد اللہ بن احمد السرخسی ۳۸۱ھ

۷۔ عبد الرحمن بن مظفر الداودی ۳۷۴ھ تا ۴۶۷ھ

۸۔ عبد الاول بن عیسیٰ السجزی ۴۵۸ھ تا ۵۵۳ھ

۹۔ حسین بن مبارک الزبیدی ۵۴۶ھ تا ۶۳۱ھ

۱۰۔ احمد بن ابی طالب الحجار ف ۷۳۰ھ

۱۱۔ ابراہیم بن احمد التنوخی ف سنہ ۸۰۰ھ — ۱۱۔ عبد الرحیم بن حسین العراقی ۷۲۵ھ تا ۸۰۶ھ

۱۲۔ احمد بن علی بن حجر العسقلانی شارح بخاری ۷۷۳ھ تا ۸۵۲ھ

۱۳۔ احمد زکریا الانصاری ف ۹۲۵ھ

۱۴۔ محمد بن احمد الرملی ف ۱۰۰۴ھ

۱۵۔ احمد بن عبد القدوس الشناوی ف ۱۰۲۸ھ

۱۶۔ احمد بن محمد القشاشی ف ۱۰۷۱ھ

۱۷۔ ابراہیم بن حسن الکردی المدنی ۔ ۱۰۲۵ھ تا ۱۱۰۱ھ

۱۸۔ محمد بن ابراہیم ابو طاہر المدنی ۔ ف ۱۱۴۵ھ (۱۸) عبد اللہ بن سالم البصری ۔ ف سنہ ۱۱۳۴ھ

۱۹۔ الشاہ ولی اللہ ۔ ۱۱۱۴ھ تا ۱۱۷۶ھ (۱۹) احمد بن محمد شریف الاہدل ۔ ف سنہ ؟

۲۰۔ الشاہ عبدالعزیز ۱۱۵۹ھ تا ۱۲۳۹ھ — ۲۰۔ [illegible] الیمنی ... ف ۱۱[illegible]ھ

۲۱۔ الشاہ اسحاق الدہلوی [illegible] سنہ ۱۲[illegible]ھ — ۲۱۔ عبدالقادر بن احمد الکوکبانی سنہ ۱۱[illegible]ھ تا سنہ ۱۲[illegible]ھ

عبدالرحمٰن بن سلیمان سنہ ۱۱[illegible]ھ تا سنہ ۱۲[illegible]ھ

۲۲۔ السید نذیر حسین الدہلوی سنہ ۱۲۲۵ھ تا ۱۳۲۰ھ — ۲۲۔ محمد بن علی الشوکانی مؤلف نیل الاوطار سنہ ۱۱۷۳ھ تا سنہ ۱۲۵۰ھ

۲۳۔ احمد بن محمد الشوکانی ف سنہ ۱۲۸۱ھ

۲۴۔ حسین بن محسن الانصاری ف سنہ ۱۳۲۷ھ

۲۳۔ مولانا احمد اللہ شیخ الحدیث رحمانیہ دہلی ف سنہ ۱۳۶۲ھ (بعمر ۶۵ سال تقریباً)

۲۴۔ عبدالغفار حسن تاریخ حصولِ سندِ حدیث ۲۰ شعبان سنہ ۱۳۵۴ھ

توضیح (۱) استاذ محترم مولانا احمد اللہ صاحب مرحوم نے حدیث کا علم اپنے زمانے کے دو مشہور اساتذہ حدیث سے حاصل کیا ہے: (الف) مولانا سید نذیر حسین مرحوم (ب) علامہ حسین بن محسن الانصاری مرحوم اوّل الذکر چار واسطوں سے شیخ محترم ابراہیم بن حسن کردی کے شاگرد ہیں اور ثانی الذکر چھ واسطوں سے۔ قاضی محمد بن علی شوکانی کے صاحبزادے احمد بن محمد نے اپنے والد محترم سے بھی علم حدیث حاصل کیا ہے۔ اور علامہ عبدالرحمٰن بن سلیمان سے بھی۔ علامہ موصوف اپنے والد سلیمان بن یحییٰ سے براہِ راست فیض یاب ہوتے ہیں۔ اس صورت میں شیخ محترم حسین بن محسن انصاریؒ اور ابراہیم بن حسن کردیؒ کے درمیان بجائے چھ کے پانچ واسطے رہ جاتے ہیں۔ مولانا سید نذیر حسین مرحوم اور علامہ حسین بن محسن انصاری کے اسنادی سلسلے اوپر جا کر علامہ ابراہیم بن حسن کردیؒ سے ایک ہو جاتے ہیں۔ (۲) یہاں شجرۂ علم حدیث کے نام سے صرف صحیح بخاری کا سلسلۂ سند پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حدیث کی دوسری اہم کتابوں کی سندیں علیحدہ ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ امام بخاریؒ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سند کے بہت سے سلسلے ہیں یہاں کم سے کم رواۃ پر مشتمل سندوں میں سے ایک سند کو درج کیا گیا ہے۔ (۳) راقم الحروف نے مولانا احمد اللہ صاحب مرحوم کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگر نہسوی مرحوم، مولانا محمد صاحب سورتی مرحوم، مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی مبارکپوری مدظلہ سے بھی حدیث کی بعض کتابیں پڑھی ہیں۔ نیز مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارکپوریؒ شارح ترمذی سے بھی جزوی طور پر استفادے کا موقع ملا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِہٖ تَتِمُّ الصّٰلِحٰتُ۔

عاجز

عبدالغفار حسن رحمانی۔ عمرپوری

۴۔ عزیزی صہیب حسن سلّمہ بن عبد الغفار حسن

ولادت : نومبر ۱۹۴۲ء

تعلیم : میٹرک کے بعد عالم عربی، فاضل عربی، ایف اے، بی اے، ایم اے عربی کے امتحانات میں اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کی، نیز چار سال کا عرصہ مدینہ طیبہ میں گذارا، جہاں اسلامی یونیورسٹی (شریعت کالج) سے ۱۹۶۶ء میں سندِ فراغت حاصل کی اور چند سال کے بعد برمنگھم یونیورسٹی (انگلستان) سے علم حدیث اور فنّ جرح و تعدیل کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ انگلش میں تحریر کرنے پر ایم اے کی سند حاصل کی،

اساتذہ

۱ ۔ راقم الحروف سے عالم عربی اور فاضل عربی (پنجاب یونیورسٹی) کی کتبِ نصاب کی تعلیم حاصل کی، اور جامعہ تعلیمات کے دوسرے اساتذہ سے استفادہ کیا ۔

۲ ۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب ویروو الوی (امرتسری) مہتمم دار القرآن والحدیث سے کتب حدیث کا سبق لیا ۔ اور انکے مدرسہ میں دو سال تعلیم حاصل کی ۔

۳ ۔ مولانا عبداللہ صاحب شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ، ساہیوال ۔

۴ ۔ فضیلۃ الشیخ مولانا محمد امین الشنقیطیؒ شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ مدینہ طیّبہ

۵ ۔ محترم مولانا المکرم شیخ الحدیث حافظ محمد گوندلویؒ استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ مدینہ طیّبہ ۔

۶ ۔ فضیلۃ الشیخ مولانا محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ مدینہ طیّبہ ۔

ان کے علاوہ مدینہ طیّبہ کے قیام کے دوران حسب ذیل مشائخ عظام سے استفادے کا موقع ملا ۔

الف ۔ فضیلۃ الشیخ مولانا حماد الانصاری استاذ توحید جامعہ اسلامیہ مدینہ طیّبہ

ب ۔ سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ تعالیٰ ومتعنا اللہ بطول حیاتہ ۔

رئیس الجامعۃ الاسلامیہ۔
ج۔ فضیلۃ الشیخ محمد عمر فلاتہ مدرّس مسجد نبوی۔

دینی خدمات

اسلامی یونیورسٹی مدینہ طیبہ سے سندِ فراغ (لیسانس) حاصل کرنے کے بعد مملکتِ عربیہ سعودیہ کی طرف سے دعوت و تدریس کے لئے نیروبی (کینیا) میں تقرر ہوا۔ وہاں تقریباً نو سال گذارے، اس کے بعد لندن میں تقرر کر دیا گیا جہاں اب تک دعوتِ دین کا کام پورے تسلسل اور ذمہ داری کے ساتھ جاری ہے۔

تصنیف و تالیف

دعوت و تدریس کے ساتھ تصنیفی مشاغل بھی پورے انہماک اور پابندی کے ساتھ انجام پا رہے ہیں۔ اب تک حسب ذیل تصنیفات اور تراجم منصہ شہود پر آچکے ہیں:

۱۔ اثبات ختم نبوت (رد قادیانیت) Truth about Ahmadiyyat (a refutation of Qadiyaniat) (انگریزی میں)۔

۲۔ قرآنی قصص کی سلسلہ وار اشاعت The study of Al-Quran (Correspondence Course): Lesson 1-20 (انگریزی میں)۔

۳۔ محدثین کا معیار جرح و تعدیل Criticism of Hadith among Muslims. with reference to Sunan Ibn Maja. (انگریزی میں)۔

۴۔ اسلام اور اشتراکیت، مؤلفہ مولانا مسعود عالم رحمہ اللہ زبان اردو کا ترجمہ عربی میں

۵۔ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" مؤلفہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا عربی ترجمہ بعنوان (ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن)

۶۔ عقیدۃ طحاویہ کے متن اور "تقدیر" پر ایک عربی کتابچے کا انگریزی ترجمہ مع مختصر حواشی۔
1. The Muslim Creed.
2. Faith in Predestination

ان کے علاوہ ماہنامہ "صراط مستقیم" میں قسط وار سفرنامہ اندلس شائع ہوتا رہا ہے۔ اردو کے علاوہ حسب ذیل زبانوں میں تقریر و تحریر کی مہارت حاصل ہے۔

۱ - عربی ، ۲ - انگلش ، ۳ - سواحلی (دوران قیام کینیا)

توقع ہے کہ آئندہ دینی دعوت کے کام میں توسیع ہو گی، اور فکری طور پہ مزید پختگی حاصل ہو گی، اور عملی تجربات سے دینی جد وجہد کے لئے نت نئے امکانات روشن ہوں گے۔ وبیدہ التوفیق ، انشاء اللہ العزیز ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حدیث کے بارے میں مختلف نظریات

حدیث نبوی ﷺ کے بارے میں چند قسم کے نظریات یا خیالات پائے جاتے ہیں:

۱ - ہر وہ بات جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی جائے، خواہ اس کے راوی ثقہ ہوں یا ناقابل اعتماد، اُسے قبول کر لیا جائے۔

۲ - دوسرا نظریہ یا طرزِ عمل یہ ہے کہ صرف قرآن کافی ہے۔ قرآن مجید میں تمام اُصول و فروع اور کلیات و جزئیات موجود ہیں، لہٰذا قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔

سوچ کا یہ انداز پہلے طرزِ عمل کے بالکل برعکس ہے۔

۳ - ا - قرآن مجید کے ساتھ ساتھ، حدیث بھی حُجّت ہے اور شریعت کا سرچشمہ ہے۔ لیکن اگر کوئی روایت (خبرِ واحد) قرآن مجید کے خلاف ہو، یا عقل و قیاس کے منافی ہو تو اُسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

ب - ایسی روایات جو قرآن کے اجمال کی تشریح کرتی ہوں یا ایسا حکم دیتی ہوں جس کے بارے میں قرآن خاموش ہے تو وہاں حدیث قبول کی جائیگی، لیکن قرآن نے اگر کوئی قاعدہ کلیّہ یا عام حکم بیان کر دیا ہے، تو پھر حدیث کے ذریعے سے اس قاعدہ کلیّہ کو، یا اس حکم عام کو بدلا نہیں جا سکتا۔ یعنی کسی عام کی تخصیص، یا کسی مطلق کی تقیید، حدیث کے ذریعے

نہیں ہو سکتی ۔

مثلاً : قرآن میں حکم آگیا ہے کہ " زانی اور زانیہ کو سو کوڑے لگاؤ ۔ اب اگر ان احادیث کو قبول کر لیا جائے جن میں شادی شدہ زانی مرد و عورت کے لئے رجم کا حکم ہے ۔ تو اس سے قرآن کے حکم میں تبدیلی آجائیگی ۔ یہ صورت حال برداشت نہیں کی جا سکتی "

یعنی سنت کی کہاں مجال کہ وہ قرآن کے حکم کو بدل دے ۔

ج ۔ قرآن مجید کے ساتھ ساتھ ، تعاملِ اُمّت ، اور سنّت متواترہ کو حجّت مانا جائے اور خبر واحد پر اعتماد نہ کیا جائے ۔

د ۔ ایک خیال یہ ہے کہ ایسا عالم دین جو قرآن مجید اور سنت کے گہرے مطالعہ سے مزاج شناس رسول بن جاتا ہے تو وہ ضعیف اور منقطع روایات میں ہیرے کی جوت دیکھ لیتا ہے ۔ تو اس بنا پر وہ صحیح الاسناد حدیث کے مقابلے میں ضعیف روایات کو ترجیح دیتا ہے " یعنی : محدّث کے فیصلے کے مقابلے میں مجتہد فقیہ کی رائے مقدّم ہو گی ۔

(دیکھیے " مسلک اعتدال " تفہیمات ج ۱ ، از مولانا مودودی) ۔

۴ ۔ جو اَحادیث ، صحیح اسناد کے ساتھ منقول ہیں ، اُن کو قبول کیا جائے ، اور ایسی کوئی روایت ، جس کی سند صحیح ہو ، قرآن مجید ، یا قیاس و عقل کے خلاف نہیں ہو سکتی ۔ خاص طور پر وہ روایات جن کا تعلّق عملی زندگی سے ہے ایسی روایات کو قبول کرنا ضروری ہے ۔ لیکن ایسی روایات ، جن کا تعلّق فضائل و مناقب سے ہے یا ترغیب و ترہیب پر مشتمل ہیں ، ان کے بارے میں کوئی صحیح تاویل نہ ہو سکے تو توقف کیا جا سکتا ہے ۔

امام احمد کا قول ہے :

" اذا جاء الحلال والحرام ، شدد نافی الأسانید وإذا جاء الترغیب والترھیب تساھلنا فی الأسانید " علم الحدیث ابن تیمیہؒ ص ۵۵

ہم حلال و حرام سے متعلق احادیث قبول کرنے میں اسانید کی خوب جانچ پڑتال کرتے ہیں یعنی تنقید کا معیار اونچا رکھتے ہیں ' اور جب ترغیب و ترہیب کا معاملہ ہو تو اسناد کے بارے میں نرمی برتتے ہیں ۔

اس سے معلوم ہوا کہ فقہی اور عملی مسائل میں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی، جو صحیح بھی ہو اور اس کے باوجود وہ قرآن یا عقل و قیاس کے منافی ہو کیونکہ محدثین کرام نے حلال و حرام سے متعلق احادیث کے پرکھنے میں بہت زیادہ چھان بین کی ہے۔ اور تحقیق اور جرح و تعدیل کا بہت ہی اونچا معیار قائم کیا ہے۔ اگر کوئی حدیث بظاہر قرآن یا عقل و قیاس کے خلاف نظر آئے تو بلا تکلف، اس کی موزوں توجیہ اور تطبیق ہو سکتی ہے۔

قوی مسلک

ان چاروں نظریات اور مسالک میں سے یہ آخری نظریہ دلائل کے لحاظ سے زیادہ قوی ہے، پہلا نظریہ یا طرزِ عمل انتہائی غلط ہے، جس کی بنا پر بہت سی بدعات اور غلط قسم کے عقائد، مسلم معاشرے میں رواج پا گئے ہیں۔ ہر قسم کی رطب و یابس روایات کا قبول کر لینا، واعظین، فقہاء، مؤرخین، عام مفسّرین اور اصحابِ تصوّف کا شیوہ رہا ہے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے۔

ههنا طبقة خامسة منها : ما اشتهر على ألسنة الفقهاء و الصوفية والمؤرخين و نحوهم، وليس له أصل في هذه الطبقات الأربع، ومنها ما دسه الماجن في دينه العالم بلسانه، فأتى باسناد قوى لا يمكن الجرح فيه، و كلام بليغ لا يبعد صدوره عنه صلى الله عليه وسلم فأثار في الاسلام مصيبة عظيمة، لكن الجهابذة من اهل الحديث يوردون مثل ذلك على المتابعات والشواهد فتهتك الأستار ويظهر العوار .

(حجة الله البالغة ج ۱، ص ۱۰۵) مطبوعة مطبعة خيرية، مصر

"اب یہاں ایک پانچواں طبقہ ہے۔ اس طبقہ کی احادیث وہ ہیں جو فقہاء، صوفیاء، اور مؤرخین وغیرہ کی زبانوں پر مشہور ہیں، مگر ان چاروں طبقات میں ان کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔ اس طبقہ میں ایسی روایات بھی پائی جاتی ہیں جنہیں بے دین اہل زبان لوگوں نے اختراع کیا اور انہیں ایسی قوی اسناد سے بیان کیا جن

پر جرح نہیں کی جا سکتی اور ایسے بلیغ کلام سے روایت کیا جس کا صدور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بعید نہیں ہے۔ یوں ان لوگوں نے اسلام میں بڑی آفت برپا کی۔ مگر ماہر علماءِ حدیث ایسی روایات کو متابعات و شواہد پر پرکھتے ہیں تو پردے کھل جاتے ہیں اور عیب ظاہر ہو جاتا ہے۔"

اسی طرح طبقہ رابعہ کی کتبِ حدیث کی حیثیت ہے۔ اس طبقہ کی کتابوں میں اُن کے مصنّفین نے بہت سی موضوع احادیث جمع کر دی ہیں۔ یہ زیادہ تر مناقب و معائب، تفسیری روایات، اسبابِ نزول اور انبیاءِ سابقین کے حالات پر مشتمل ہیں۔ طبقات کتبِ حدیث کی پوری تفصیل کتاب کے آخری صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کے بارے میں پہلا نظریہ یا طرزِ عمل ایسا ہے کہ جس سے اصل دین کا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے۔ یہ ایک انتہا ہے جس کو غلو اور افراط سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا نظریہ ہے کہ تمام احادیث کو "لہو الحدیث" قرار دیکر دریا برُد کر دیا جائے، اس کا نام تفریط ہے۔ یہ حدیث سے نفرت و عداوت میں غلو ہے۔ اور پہلا طرزِ عمل، عقیدت و محبت میں غلو ہے۔ اس لئے یہ دونوں نظریے یا خیالات مکمل طور پر مسترد کرنے کے قابل ہیں۔ پہلے خیال سے بدعات اور شخصیت پرستی کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسرے خیال سے کفر و الحاد اور شکوک و شبہات کا دروازہ کھلتا ہے۔ باقی رہی نظریۂ حدیث کی تیسری قسم تو اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص یا گروہ چند اخبارِ آحاد کو اس بنا پر رَد کر دیتا ہے کہ وہ قرآن یا عقل و قیاس کے خلاف ہیں تو ایسے افراد کی نہ تکفیر کی جا سکتی ہے اور نہ اُنہیں فاسق قرار دیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن قیمؒ نے "الصواعق المرسلة" میں تحریر کیا ہے۔

ان من ردّ الخبر الصحيح اعتقادا لغلط الناقل او كذبه
او لاعتقاد الراد ان المعصوم لا يقول هذا او
لاعتقاد نسخه ونحوه فرده اجتهادا وحرصا على نصرة الحق

فانه لا یکفر بذلك ولا یفسق، فقد رد غیر واحد من الصحابة بعض الأخبار الصحیحة، کما رد عمر حدیث فاطمة بنت قیس فی اسقاط نفقة المطلقة ثلاثا وکما ردت عائشة حدیث ابن عمر فی تعذیب المیت ببکاء أهله علیه وغیر ذلك (الصواعق المرسلة ج ۲، ص ۳۷۰)۔

مطلب یہ ہے کہ "اگر کوئی شخص کسی خبرِ صحیح کو اس بنا پر رَد کرتا ہے کہ راوی سے غلطی ہوئی ہے یا اسنے غلط بیانی کی ہے۔ یا یہ بات ہو کہ رد کرنے والا یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ: معصوم یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات نہیں فرما سکتے یا اُس حدیث کے منسوخ ہونے کا اعتقاد ہو یا اس قسم کا کوئی اور عذر ہو تو ایسی صورت میں یہ رَد کرنا ایک اجتہادی شکل ہوگی، اور نصرتِ حق کی خواہش کی بنا پر ایسا ہو سکتا ہے تو اس صورت میں نہ تکفیر ہوگی اور نہ تفسیق، اور اُس کی دلیل یہ ہے کہ ایک سے زیادہ صحابہ نے بعض صحیح اخبار کو قبول نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت کو رد کر دیا، جس میں ایسی عورت کے لئے نفقہ ساقط کیا گیا ہے جس کو تین طلاقیں ملی ہوں اور جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کو رَد کر دیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔" اس وضاحت کے بعد، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ بڑے زور دار انداز میں قوی اور راجح مسلک کی نشاندھی کرتے ہیں۔ اُن کے اصل الفاظ یہ ہیں:

ونحن نقول قولا کلیا تشهد الله تعالیٰ علیه وملائکته أنه لیس فی حدیث رسول الله ما یخالف القرآن، ولا ما یخالف العقل الصریح بل کلامه بیان للقرآن وتفسیر له، وتفصیل لما اجمله، وکل حدیث رده من رد الحدیث لزعمه انه یخالف القرآن، فهو موافق للقرآن مطابق له

وغايته أن يكون زائدا على ما في القرآن، وهذا الذي أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بقبوله ونهى عن رده.

(الصواعق المرسلة ج ۲ ص ۵۲۹)

ترجمہ: ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کو گواہ بناتے ہوئے اعلان کرتے ہیں، ایسا اعلان جس میں کوئی استثنا نہیں ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں سے کوئی روایت ایسی نہیں ہے جو قرآن کے مخالف ہو اور نہ کوئی ایسی حدیث ہے کہ جو عقل صریح کے منافی ہو، بلکہ آپ کے ارشادات قرآن کا بیان اور اس کی تفسیر ہیں اور جو احکام قرآن میں اجمال و اختصار کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اُن کی تفصیل و تشریح احادیث میں ملتی ہے۔ ہر وہ حدیث جس کو کسی نے اس خیال سے رد کر دیا ہے کہ وہ قرآن کے مخالف ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ وُہ قرآن کے مطابق اور موافق ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ حدیث قرآن سے زائد حکم بیان کرتی ہے اور یہ حدیث کی وہ قسم ہے جس کے قبول کرنے کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے اور اس کے رد کرنے سے منع فرمایا ہے۔

تاریخ فتنۂ انکارِ حدیث

انکارِ حدیث کی آواز انفرادی طور، امام شافعی کے زمانے میں اُٹھی تھی۔ امام شافعی نے ایسے افراد سے مناظرہ بھی کیا تھا۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ (جماع العلم علی حاشیہ کتاب الام، ج ۷، ص ۲۷۳)

لیکن یہ آواز منظم نہ ہو سکی اور یہ فتنہ اس وقت اپنی موت آپ مر گیا۔ ماضی قریب میں انکارِ حدیث کی آواز مختلف افراد نے بلند کی۔ عالم اسلام خاص طور پر عالمِ عرب مثلاً مصر وغیرہ میں اس فتنہ کو جگانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ سب کوششیں انفرادی تھیں، کوئی فرقہ کی شکل یا کوئی منظم تحریک وجود میں نہ آ سکی۔ برّصغیر میں متعدد افراد نے انکارِ حدیث کیلئے دوڑ دھوپ کی۔ لیکن منظم تحریک کی شکل میں دو افراد نظر آتے ہیں:۔

۱۔ مولوی غلام نبی عُرف مولوی عبد اللہ چکڑالوی ضلع میانوالی، اسکی پیدائش انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں اور وفات ۱۹۱۴ء میں ہوئی۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی نے سُنّت کا بالکلیہ انکار کیا ہے اور "حسبنا کتاب اللہ القرآن" کی صدا بلند کی ہے۔ یعنی ہمیں صرف قرآن کافی ہے۔" اسلامی تاریخ میں مسیلمہ کذاب کے حامی گروہ نے یہ اعلان کیا تھا۔ اس گروہ نے مسیلمہ کی نبوت ثابت کرنے کیلئے قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی تھی:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ یعنی ہم نے تمہاری طرف ایک رسول مبعوث کیا ہے، تمہارے اوپر گواہی دیتے ہوئے جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔

اس آیت میں حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور آنحضورؐ کی بعثت کی تشبیہ حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کیلئے حضرت ہارونؑ معاون تھے۔ اسی طرح میں یعنی مسیلمۃ الکذاب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاون نبی ہوں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الفصل بین الملل والنحل للعلامہ محمد بن عبد الکریم الشہرستانی ف ۵۴۸ھ)

مولوی عبد اللہ چکڑالوی کے عقائد و افکار کے بارے میں تفصیلی بحث جدّ امجد مولانا عبد الجبار صاحب عمر پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین میں ملے گی۔ جو اس کتاب کا اہم جزء ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسان سنت کا انکار کرنے کے بعد کیسی مضحکہ خیز تاویلات کرتا ہے۔ اور حدیث کی روشنی کو چھوڑ

کر باطل کی تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے۔ مزید کچھ مثالیں اور عینی مشاہدات کتاب کے آخر میں درج کئے جائیں گے، جن سے ثابت ہوگا کہ انکار حدیث سے عقل کیسے خبط ہو جاتی ہے۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی کے ایک شاگرد محمد رمضان نے (وفات ۱۹۴۶ء) اس انکارِ سنت کی تحریک کو تقویت دینے کیلئے اُمت مسلمہ، اہل الذکر والقرآن کے نام سے اپنی جماعت بنائی، لیکن بہت جلد یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔ اسی طرح خواجہ احمد دین وفات ۱۹۳۶ء نے "اُمت مسلمہ" کے نام سے جماعت بنائی۔ لیکن یہ سلسلہ بھی قائم نہیں رہ سکا۔ اس وقت اس نظریہ کے حامی بغیر کسی تنظیم کے مختلف شہروں میں منتشر طور پر پائے جاتے ہیں۔

۲۔ تحریک طلوعِ اسلام، اس تحریک کے بانی غلام احمد پرویز صاحب ہیں۔ پرویز صاحب نے مولوی عبداللہ چکڑالوی اور اُن کے ہمنواؤں کی مضحکہ خیز تاویلات سے بیزار ہو کر دوسرا نظریہ پیش کیا۔ یعنی قرآن مجید میں صرف اصول اور بنیادی باتیں بیان ہوئی ہیں۔

باقی رہا جزئیات کا معاملہ تو اُن کی تفصیل ہر زمانے کا مرکزِ ملت طے کرے گا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اجتہاد سے نماز، روزہ، حج، زکاۃ میں بھی حالات کے لحاظ سے کمی بیشی کر سکتا ہے۔ یہ نظریہ انکارِ سنت اور اشتراکی افکار کا ملغوبہ ہے یہ تحریک جدید تعلیم یافتہ طبقوں کے ایسے افراد میں زیادہ مقبول ہوئی جو شریعت کی پابندیوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ اور سنت سے بے نیاز ہو کر قرآن کی من مانی تشریح کرنے کے خوگر ہیں۔ اس تحریک کو زیادہ تقویت حافظ اسلم صاحب جیراجپوری کے تعاون سے حاصل ہوئی۔ حافظ اسلم صاحب اچھے خاصے عالم تھے۔ ان کے والد مولانا سلامت اللہ صاحب اعظمی جیراجپوری حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ اور حضرت مولانا محمد نذیر حسین صاحب مرحوم و مغفور کے شاگرد تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُن کے یہ صاحبزادے اپنی عمر کے آخری دور میں انکارِ سنت میں پرویز کی قیادت فرمانے لگے۔ پرویز صاحب کا زیادہ تر

علمی مواد جناب حافظ اسلم صاحب سے ماخوذ ہے۔ پرویز صاحب کی عبارت آرائی اور طلاقت لسانی جدید تعلیمیافتہ طبقہ کے لئے بڑی اثر انگیز ہے۔ لیکن اُن کی ساری تصانیف معنویت اور ٹھوس پن سے خالی ہیں۔

صدر ایوب خاں مرحوم کے زمانے میں پرویز صاحب کے ماہنامہ "طلوع اسلام" کو بہت وسعت اور ترقی حاصل ہوئی۔ لیکن پرویز صاحب کے انتقال کے بعد اب یہ تحریک رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتی جارہی ہے۔

قادیانیت اور پرویزیت کے درمیان فرق

ان دونوں باطل تحریکات کے درمیان بہت سی باتوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً:۔

ا۔ معجزات کا انکار،

ب۔ قرآن مجید کی من مانی تاویلات۔ لیکن ایک نمایاں اور عجیب فرق یہ پایا جاتا ہے کہ قادیانیت نے اُمتی کو نبی بناڈالا ہے۔ اور پرویزیت کے نظریۂ مرکزِ ملّت نے نبی کو اُمّتی کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔

انکارِ حدیث کے نتائج

ذیل کے چند واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کے نظریہ انکارِ سنت اور یہ کہ قرآن مجید میں تمام اُصول اور جزئیات موجود ہیں نے قرآن مجید کی تفسیر کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے۔ مثلاً:

ا۔ عمرپور ضلع مظفر نگر کے ایک بزرگ ممتاز حسین صاحب جو ہمارے

خاندان عمر پور کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے مولوی عبداللہ چکڑالوی کے بہت زیادہ گرویدہ تھے بلکہ اُن کے خلیفہ سمجھے جاتے تھے۔ ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے کہ اُن سے ایک مکان میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اُسی زمانے میں رسالہ "محدث" (شائع کردہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی) اُن کی نظر سے گذرا، جس میں میرا ایک مضمون "سیرۃ البخاری" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ جس کو دیکھ کر وہ بہت ناراض ہوئے۔ اور فرمانے لگے: بخاری پر ہم کیوں ایمان لائیں؟ کیا قرآن ناقص ہے؟ میں نے بڑے ادب سے اُن کے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کی زبان کی روانی پورے عروج پر رہی اتنے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے نماز شروع کرنے سے پہلے یہ آیات بلند آواز سے پڑھیں:-

"إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝"

افسوس ہے کہ اُنکی پوری نماز کا نظارہ نہ کر سکا، اور نہ وضو کی کیفیت کا مشاہدہ ہو سکا۔ اصل بات یہ تھی کہ جہاں میں گیا تھا اُس مکان میں ایک مریض کی عیادت کے لئے لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس لئے فرقہ اہل قرآن کی نماز کا براہ راست مشاہدہ پوری طرح نہ ہو سکا (لیکن نزھۃ الخواطر ج ۸ میں چکڑالوی نماز کا پورا خاکہ نقل کیا گیا ہے جو اس تحریر کے آخر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)۔

جب وہ بزرگ نماز سے فارغ ہو گئے۔ تو میں نے گذارش کی کہ آپ نے نماز شروع کرنے سے پہلے مذکورہ بالا آیات کیوں تلاوت فرمائیں؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا: اور کیا پڑھیں؟ میں نے عرض کیا، کہ میں نے پہلے سوال کیا ہے اُس کا جواب دیجئے لیکن وہ اپنے سوال پر اَڑے رہے۔ اور بار بار یہی کہتے رہے کہ اور کیا پڑھیں؟ اور میں بھی اپنے سوال پر اَڑا رہا کہ آپ نے یہ آیات کیوں پڑھیں؟ آخر اس ردّوکد کے دوران دوسرے مہمان آگئے اور یہ گفتگو یہیں ختم ہو گئی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ممتاز حسین صاحب گھما پھرا کر مجھ سے یہ کہلوانا چاہتے تھے۔ کہ جو حدیث میں

لکھا گیا ہے وہ پڑھا جائے، اس کے جواب میں وہ فرمائے کہ کیا قرآن ناقص ہے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح اصل سوال کے ٹالنے کی راہ مل جاتی منکرین حدیث کا یہ خاص طریقہ ہے اُن سے گفتگو کرتے ہوئے اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۲۔ سراوہ۔ ضلع میرٹھ کے ایک بزرگ عالم حافظ کبیر احمد صاحب تھے۔ اُن کا شمار ہمارے بزرگوں میں ہوتا ہے۔ وہ عابد و زاہد ہونے کے باوجود خوش مزاج بھی تھے۔ اُن سے ممتاز حسین صاحب کی نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی جگہ ملاقات کے موقع پر مولانا کبیر احمد صاحب نے ممتاز حسین صاحب سے دریافت کیا کہ قرآن مجید سے ظہر و عصر کی چار رکعات، مغرب کی تین اور فجر کی دو رکعات کا ثبوت پیش کیجئے؟ جواب میں انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ" ترجمہ: سب حمد و ثنا زمین و آسمان پیدا کرنے والے کے لئے ہے، جس نے فرشتے پیدا کئے، جو دو دو، اور تین تین اور چار چار پروں والے ہیں"

تو فرماتے ہیں دو دو، چار چار، تین تین سے نماز کی رکعات مراد ہیں۔ مولانا حافظ کبیر احمد صاحب یہ انوکھا استدلال سُن کر مسکراتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ اور ایک دوسرے موقع پر جب سرِ راہ ملاقات ہوئی اور جناب ممتاز حسین صاحب نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا، تو کبیر احمد صاحب نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بازو اور بغل سے ملا لیا، ممتاز حسین صاحب نے ازراہ تعجب پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ سمٹ کیوں رہے ہیں؟ حافظ کبیر احمد صاحب نے جواب دیا قرآن میں ہے: (وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ) یعنی اپنا ہاتھ اپنے بازو کے ساتھ ملا لو تو ممتاز حسین صاحب نے فرمایا: کہ اس میں مصافحہ کا ذکر کہاں ہے؟ تو کبیر احمد صاحب نے جواب دیا کہ: (اولی اجنحة مثنی وثلاث وربٰع) والی آیت میں نماز کا ذکر کہاں ہے؟ اس پر وہ لاجواب ہو گئے۔ (بُهِتَ الَّذِي جحد بالسنة)۔ ان دونوں واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ انکارِ سنت کا نتیجہ مخبوط الحواسی کی صورت میں نکلتا ہے اور کوئی بات بھی عقل و دانش کے مطابق

نہیں ہوتی صرف تیر تکے ہوتے ہیں یہ ہے خواہشِ نفس کی پیروی ۔

اسی طرح اگر آپ پرویز صاحب کے لٹریچر کا مطالعہ کریں گے تو وہاں بھی اس قسم تفسیری عجائبات نظر آئیں گے ۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

ا ۔ سورۂ نساء میں ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ) کہتے ہیں کہ اللہ ورسول سے مراد مرکز ملت Central Authority ہے ۔

اور اُولی الأمر سے مفہوم افسران ماتحت ہیں ۔ (معارف القرآن از پرویز صاحب جلد ۴ صـ ۶۲۶) ، دوسری جگہ تحریر ہے : اللہ اور رسول سے مراد مسلمانوں کا امام ہے ۔ معارف القرآن جلد ۴ صـ ۶۲۴

ب ۔ رسول کو قطعاً یہ حق نہیں کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کروائیں ۔

معارف القرآن ، جلد ۴ صـ ۶۱۶

ج ۔ رسُول کی اطاعت اس لئے نہیں کہ وہ زندہ نہیں ہے عربی زبان میں اطاعت کے معنیٰ ہی کسی زندہ کے احکام کی تابعداری ہے ۔ اسلامی نظام میں اطاعت صرف امام موجود ہی کی ہوگی ، جو قائم مقام ہوگا خدا اور رسول کا ، یعنی مرکزِ نظام حکومت اسلامی ملاحظہ ہو : اسلامی نظام (صـ ۱۱۲)

آخرت سے مراد مستقبل ہے ۔ قرآن میں آتا ہے (وَ بالآخرۃ ھم یوقنون) یعنی : اس زندگی میں بھی مستقبل پہ اور اُس کی بعد کی زندگی میں بھی ۔ (ملاحظہ ہو سلیم کے نام اکیسواں خط (صـ ۱۲۴)

د ۔ کم از کم دو وقت کی نماز ، جیسے کہ سورۂ نور میں ہے ، ملاحظہ ہو ۔ لغات القرآن ۔ از پرویز صاحب جلد ۳ ص ۱۰۴۳)

نماز اور زکوٰۃ کی رکعات اور مقادیر میں ردو بدل ہو سکتا ہے ۔

(قرآنی فیصلے ، صـ ۱۴ ، ۳۷)

ھ ۔ شریعت میں صرف چار چیزیں حرام ہیں ، جیسے کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے ، یعنی : ا ۔ مردار ، ۲ ۔ بہتا خون ، ۳ ۔ لحم خنزیر ، اور ۴ ۔ غیر اللہ کے نام پہ نذر کی ہوئی چیزیں ، ان کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں ہے ۔ ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت ماہ مئی ۵۲ء ، صـ ۶۹)

اصطلاحاتِ حدیث

حدیث : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قول، فعل اور تقریر[1] کا نام حدیث ہے
اثر : صحابہؓ کے قول اور فعل کو اثر کہا جاتا ہے، اس کی جمع آثار ہے۔
سند : حدیث کے راویوں کے سلسلہ کو سند کہتے ہیں۔
متن : حدیث کی عبارت کو متن کہا جاتا ہے۔
خبر متواتر[2] : جس کے راوی ہر دور میں اتنے زیادہ رہے ہوں کہ ان کا جھوٹ پر متفق ہو جانا عادۃً ناممکن ہو۔
خبر واحد یا آحاد : جس کے راوی تعداد میں تواتر کے درجہ کو نہ پہنچتے ہوں۔ محدثین کے نزدیک ان کی تین قسمیں ہیں۔

(الف) مشہور۔ صحابہؓ کے بعد جس کے راوی کسی دور میں تین سے کم نہ ہوں۔

(ب) عزیز۔ جس کے راوی ہر دور میں دو سے کم نہ ہوں۔

(ج) غریب۔ جس کا راوی کسی دور میں ایک ہی رہ گیا ہو۔

مرفوع : جس حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف ہو۔

---

[1] تقریر کا یہ مطلب ہے کہ آپؐ کے سامنے کوئی کام کیا گیا ہو لیکن اس پر آپؐ نے انکار نہ فرمایا ہو۔

[2] تواتر کی چند قسمیں ہیں: (۱) ایک دور سے دوسرے دور کی طرف نسلاً بعد نسلٍ پوری وسعت اور عموم کے ساتھ نقل و روایت کا سلسلہ جاری رہے۔ مثلاً قرآن مجید (۲) تواترِ علی، نماز کے اوقات اذان اور نماز کی بنیادی ہیئت (۳) تواترِ اسناد۔ مثلاً مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ صرف صحابہؓ کے دور میں اس کے سَو سے زیادہ راوی ہیں۔ اسی طرح ختمِ نبوت کی روایات (۴) تواترِ معنوی۔ یعنی قدرِ مشترک تمام روایات میں درجۂ تواتر کو پہنچا ہوا ہو۔ مثلاً معجزاتِ نبویؐ۔ دعا میں ہاتھ اٹھانا وغیرہ۔

(مقدمہ فتح الملہم)۔

موقوف : جس روایت کی نسبت صحابہ کی طرف ہو، یعنی ان کا قول و فعل ہو۔

متّصِل : جس کے سلسلۂ سند میں کوئی راوی ساقط نہ ہو۔

منقطِع : متصل کے برعکس۔

معلّق : سند کی ابتدا سے راوی چھوڑ دیا جائے یا پوری سند ہی حذف کر دی جائے۔ اس حذف کرنے کو تعلیق کہتے ہیں۔

مُعْضَل : سند میں مسلسل دو یا دو سے زیادہ راوی غائب ہوں۔

مُرسَل : تابعیؒ اور آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے درمیان صحابیؓ کا ذکر نہ ہو۔

شاذ : وہ روایت جس میں ثقہ راوی اپنے سے قوی تر راوی کی مخالفت کرتا ہو۔ قوی تر کی روایت کو محفوظ کہا جاتا ہے۔

منکَر : اگر ضعیف راوی دوسرے ثقہ راوی کی مخالفت کرے تو ضعیف کی روایت کو منکَر اور اس کے بالمقابل ثقہ کی روایت کو معروف کہتے ہیں۔

مُعلّل : ایسی روایت جس میں ایسا مخفی نقص موجود ہو جسے علمِ حدیث کے ماہرین ہی بھانپ سکتے ہیں۔ مثلاً کسی وہم کی بنا پر مرفوع کو موقوف یا اس کے برعکس کر دینا۔

صحیح : جس روایت میں مندرجہ ذیل امور پائے جاتے ہوں :

(الف) سند متصل ہو۔ (ب) راوی عادل یعنی سیرت و اخلاق کے اعتبار سے قابلِ اعتماد ہوں۔ (ج) حافظہ درست ہو۔ (د) شاذ نہ ہو۔ (ہ) معلّل نہ ہو۔

حَسَن : جس میں مذکورہ بالا تمام اوصاف پائے جاتے ہوں صرف حافظہ کے اعتبار سے ہلکا پن ہو، اگر ایسی حَسَن روایت کی دوسری اسی قسم کی روایات مؤید ہوں تو اسے صحیح لِغَیرِہٖ کہتے ہیں۔

ضعیف : وہ روایت جس کے مندرجہ بالا تمام اوصاف یا بعض میں نمایاں کمی پائی جائے۔ کئی ضعیف روایات حَسَن لِغَیرِہٖ کے حکم میں ہو جاتی ہیں۔ بشرطیکہ یہ ضعف سیرت و کردار میں فساد کی وجہ سے نہ پیدا ہوا ہو۔ (قواعد التحدیث ص ۹۰)۔

موضوع : ضعیف روایت کا انتہائی ناقابلِ اعتماد درجہ یہ ہے کہ اس کے راویوں کا تقویٰ ہی مشتبہ ہو کر رہ جائے۔ ایسی روایت موضوع کہلاتی ہے۔

مقالات

از

حضرة مولینا عبد الجبّار

عمر پوری رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شانِ حدیث

کہاں ہے صبح کاذب۔ صبح صادق اب درخشاں ہے
شبِ تیرہ بکے غائب نیرِ توحید تاباں ہے
حدیثِ مصطفےٰ کی برق جب شعلہ دکھاتی ہے
حدیثِ مصطفےٰ سے کل جہاں میں خیر و برکت ہے
یہ ہے تریاق روحانی سراسر اس میں صحت ہے
گریزاں ہیں جو سنت سے وہ دشمن اپنی جاں کے ہیں
حدیثِ مصطفےٰ گلزار انعام خدائی ہے
یہ شاخ سدرہ ہے جو عالمِ بالا سے آئی ہے
جدا ہے جو حدیثوں سے وہ قرآں سے ہے برگشتہ۔
یہ وہ دریا ہے جسمیں مچھلیاں ہیں لطف یزداں کی
جو غوطہ زن ہے اس میں ہے بشارت اسکی ایماں کی
نہیں ہے، ڈوبنے کا ڈر نہ خطرہ ہے، درندے کا
بہار باغ قرآں ہے حدیث شافع محشر
کلام حق صدف ہے لیک ہے لبریز از گوہر
حدیث احمدی ہے شرح قرآں متن ہے کامل

حدیث احمدیؐ سارے جہاں میں گوہر افشاں ہے
کڑک سے ہے شیر سنت کی گریزاں فوج شیطاں ہے
جلاکر خرمن بدعت کو خاکستر بناتی ہے
جو ہیں توحید کے شیدائی ان پر ظلِ رحمت ہے
غضب ہے ان پہ جنکو اس شفا خانے سے نفرت ہے
سدا مطرود درگاہ خداوند جہاں سے ہیں
عجیبہ ہے یہ پھلواری جو احمدؐ نے لگائی ہے
مزا پاتے ہیں اس کا جن کو قرآں سے رسائی ہے
گیا ہے ٹوٹ اسکے مذہب و ایمان کا تختہ
سدا اس میں جھلکتے ہے ذکر رب کے درِ مرجاں کی
وہ اس میں کیفیت پاتا ہے نہر باغ رضواں کی
قدم رکھے جو اس میں وہ سراسر لطف پائے گا
بغیر اس کے مزا قرآن کا پانا ہے مشکل تر
چمک اس کی دکھاتی ہے حدیث احمدیؐ اطہر
سمجھنا متن کا بے شرح ہوتا ہے بہت مشکل

حدیثِ مصطفیٰ وحی الٰہی مثلِ قرآں ہے — نہ مانے اس کو جو کوئی نہ وہ ہرگز مسلماں ہے
یہ دونوں پتلیاں ہیں چشمِ خالی دین و ایماں ہے — جو ہو بے مردمک دیدہ تو دن اور رات یکساں ہے
غذائے جان و دل قرآں ہے سنت آبِ شیریں ہے — نہ ہو گر ایک دونوں سے تو روحِ پاک غمگیں ہے

خدا نے وعدہ فرمایا کہ میں حافظ ہوں قرآں کا — ذرا بھی دخل اس میں ہو نہیں سکتا ہے شیطاں کا
قیامت تک رہے گا جلوہ گر یہ نسخہ ایماں کا — نہیں پوشیدہ ہو سکتا ہے نور اس مہرِ تاباں کا
زمین و آسماں بدلیں نہ بدلے گا کلامِ پاک — گروہِ دشمنانِ دین اگرچہ جل کے ہوویں خاک

حدیثِ پاک کا بھی ہے محافظ خالقِ عالم — کہ قرآن و حدیثِ مصطفیٰ ہیں منضم توام
کتاب و سنتِ احمد ہیں چوں شیر و شکر باہم — جدائی گر ہو دونوں میں تو ہیں دشواریاں پیہم
اگر دل ہے کتابِ حق جگر ہے سنتِ نبوی — نہ ہو گر ایک دونوں سے نہ زندہ رہ سکے کوئی

کیا آیاتِ قرآنی کو یکجا اہلِ ایماں نے — جوانمردانِ دین نے لشکرِ جبار و رحماں نے
محمد کے صحابہؓ نے گروہِ پہلوانان نے — خردمندانِ عالم قاتلانِ فوجِ شیطاں نے
جو تھے بکھرے ہوئے موتی کیا کوشش سے انکو جمع — فروزندہ ہوئی دنیا میں اس سے لطفِ رب کی شمع

حدیثوں کو بھی کرتے تھے بیاں وہ خادمانِ دیں — کہ معلوم ہو قرآن کی تفسیر کے آئیں
بجا لاتے تھے سنت کی بہت تعظیم اور تمکیں — تہِ تیغ اس کو کرتے تھے جو ہو سنت سے خشم آگیں
گروہِ تابعیں نے نقلِ سنت کو کیا پیہم — ہوا شاداب و تر اس چشمۂ رحمت سے کل عالم

کیا جمع احادیثِ نبی اہلِ شریعت نے — نبیؐ کے عاشقوں نے دانایانِ علم و حکمت نے
بہت کی محنت و کوشش خردمندانِ خلقت نے — خدا کے نیک بندوں نے امامانِ طریقت نے
امام شافعیؒ و مالکؒ و احمدؒ بخاریؒ نے — امام مسلمؒ و داؤدؒ مقبولانِ باری نے

حدیثوں کی کتابیں سیکڑوں عالم میں ہیں مشہور — عرب میں اور یورپ میں مدارس ان سے ہیں معمور
عجم میں جابجا ان کے مضامین ہوتے ہیں مذکور — مواعظ و نصائح کی مجالس اُن سے ہیں بھرپور
جو اقوالِ محمدؐ ہیں وہ پھیلے کل جہاں میں ہیں — وہ بندوں کے دلوں میں جیسے تارے آسماں میں ہیں

بخاری اور مسلم کی کتابیں ہیں مگر برتر — پسِ قرآں ہیں، جملہ کتب پر افضل و افسر
صداقت اور عدالت کے ہیں دونوں بے بہا گوہر — فصاحت اور بلاغت کے فلک پر ہیں قمر اختر
یہ ہے فضلِ الٰہی چاہتا ہے جسکو دیتا ہے — کسی کو جان دیتا ہے کسی کی جان لیتا ہے

خدایا کل جہاں میں پھیل جائے سُنّتِ احمدؐ　　حدیثوں کی دلوں میں ہووے پیدا الفت بیحد
ہمیشہ بدعتوں سے دور ہو ہر ابیض و اسود　　جہاں سے معصیت کی دور ہو جائے بلائے بد
دُعائے عاجزِ خستہ ہے درگاہِ الٰہی میں
جو ہے سنت کا دشمن وہ سدا ہووے تباہی میں

★

حدیثِ نبویؐ

پروردگارِ قادرِ مطلق نے انسان کو دو قسم کی زندگی و تندرستی عطا فرمائی ہے۔ ایک جسمانی دوسری رُوحانی۔ جسمانی زندگی کیا شے ہے گوشت و پوست اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کا قائم و صحیح و سالم رہنا اور بدن میں خون صالح کا پیدا ہونا اگر یہ بات نہ ہوگی تو انسان لکڑی اور پتھر وغیرہ کے مانند ہو جائے گا۔ اور دنیا میں کوئی کام اُس سے نہ ہو سکے گا اور رُوحانی زندگی کیا شے ہے؟ روح اور دل کا تر و تازہ و شگفتہ ہونا اور اُس میں صلاحیت اور عمدگی و خوبی کا پیدا ہونا اگر یہ امر نہ ہوگا تو خیالات نیک اور مفید پیدا نہ ہوں گے بلکہ سب کاروبار پراگندہ اور رزلوں و ناموزوں ہو جائیں گے اور انسان وحشی جانوروں اور درندوں کے مانند ہو جائیگا اُس کی عاقبت و آخرت برباد ہو جائیگی۔ جسمانی زندگی کے لئے کھانے اور پینے کی ضرورت ہے نہ بغیر غذا کے زندگی قائم رہ سکتی ہے نہ بغیر پانی کے۔ رُوحانی زندگی کے لئے اللہ تعالےٰ کی عبادت اور رسول برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی سخت ضرورت ہے اللہ کی عبادت رُوح کے لئے ایسی ہے جیسے بدن کے لئے غذا اور رسول کی اطاعت ایسی ہے جیسے غذا کے ساتھ پانی۔ جو شخص غذا کو ضروری سمجھتا ہے اور پانی کو فضول اور بے فائدہ تصوّر کرتا ہے اس کی زندگی کا جہاز ہلاکت اور مصیبت کے بھنور میں گھرا ہوا ہے قریب ہے کہ غرق ہو کر تباہ ہو جائے۔ اللہ پاک نے اسی لئے اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی فرمانبرداری کو ضروری فرمایا اور اپنی عبادت کی صحت

و درستی کو رسول کی پیروی پر موقوف قرار دیا یعنی عبادت وہی ٹھیک ہے جو حکم رسولؐ کے موافق ہو۔ فرمایا اللہ تعالےٰ نے :

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ ۔ آل عمران (۳۱)

کہو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔

اور فرمایا :

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ النساء (۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالےٰ کی اطاعت کی ۔

پس ضروری ہوا کہ قرآن وحدیث دونوں کو دستور العمل اور حرز جان بنایا جائے۔ کیونکہ ان دونوں میں وہی نسبت ہے جو غذا اور پانی میں وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن مجید ایک متن متین ہے جس میں بہت سے احکام اجمال واختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور دریا کو کوزہ میں بند کیا گیا ہے اور حدیث اُس کی شرح وتفصیل کرنے والی ہے بغیر اس کے قرآن کے مجمل احکام اور آیتوں کے موقع ومحل کا پہچاننا ایسا دشوار ہے جیسے بغیر پانی کے تشنگی کا فرو ہونا یا بغیر جہاز کے سمندر کے پار جانا یہ خیال کرنا کہ قرآن کے ہوتے ہوئے حدیث کی کوئی ضرورت نہیں نہایت بیہودہ اور جاہلانہ خیال ہے کیونکہ قرآن پر ایمان لانے والے کو بغیر اس کے کہ حدیث پر ایمان لائے کوئی چارہ نہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ[1]۔ یعنی اے محمدؐ ہم نے قرآن تم پر نازل کیا تاکہ تم لوگوں کے روبرو اُس کو بیان کرو اور شرح وتفصیل کے ساتھ سناؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شرح وبیان کرنے والے ہیں اور شرح وبیان کا نام حدیث ہے اور فرمایا۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ[2]۔ یعنی قرآن کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں جمع کرنا اور اُس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے پھر اُس کا بیان وشرح وتفصیل بھی ہمارے ذمہ ہے۔ اول قرآن کا سینہ میں جمع کرنا اُس کے بعد بیان کرنا صاف طور پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن وحدیث دو شے مستقل ہیں۔ گرچہ حکم الٰہی ہونے کے اعتبار سے دونوں بجائے خود ایک شے ہیں لیکن کیفیت وحالت کے اعتبار سے دو شے جدا جدا ہیں اور فرمایا: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ[3]۔ یعنی اللہ وہ ذات پاک ہے جس نے ناواقفوں میں رسول انہیں میں سے بھیجا

(۱) النحل ۴۴ (۲) القیامۃ: ۱۷، ۱۸، ۱۹ (۳) الجمعۃ: ۲

وہ اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھکر سناتا ہے اور گناہوں سے پاک کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی اُن کو تعلیم دیتا ہے۔ اس آیت میں ایک امر قابل غور ہے یعنی آیتیں پڑھکر سُنانا ان کی تعلیم دینا۔ یہ امر ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے جب اُن کے روبرو قرآن پڑھا جائیگا تو وہ مضمون اور ترجمہ سمجھ جائیں گے پھر تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تعلیم کی ضرورت اسی لئے ہے کہ آیتوں کو واضح اور مفصل کیا جائے وہ موقع اور محل کو بتایا جائے سو یہ تعلیم بغیر حدیث کے نہیں ہو سکتی۔ پس معلوم ہوا کہ فہم قرآن کے لئے حدیث کی سخت ضرورت ہے اور جس طرح یہ وردگار قرآن کا حافظ و نگہبان ہے اسی طرح حدیث کا بھی ہے۔ فرمایا اللہ تعالےٰ نے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ[1] یعنی ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم اُس کے نگہبان ہیں جبکہ قرآن وحدیث دونوں کی ضرورت ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ خدا صرف قرآن کی حفاظت کرے اور حدیث کو بغیر حفاظت کے چھوڑ دے۔ اُس نے حفاظت کے لئے امامانِ محدثین کو پیدا کیا جنہوں نے ایک ایک حدیث کے لئے دُور دراز سفر طے کئے اور راویوں کی جانچ پڑتال میں بہت کوششیں فرمائیں لفظ لفظ کی تحقیق میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ بڑی بڑی کتابیں اس بارے میں تالیف فرمائیں، صحیح کو ضعیف سے اور ناسخ کو منسوخ سے الگ کر دکھایا غرض حدیث پر عمل کرنے کے لئے کوئی عذر وحیلہ باقی نہ چھوڑا۔ دنیا میں لوگوں کی شہادتوں پر بہت کچھ اعتماد کیا جاتا ہے یہاں تک کہ شہادت کی وجہ سے بڑے بڑے جُرم ثابت کئے جاتے ہیں اور اُن کے لئے سخت سزائیں، قتل اور قید اور پھانسی وغیرہ تجویز کی جاتی ہے کیا وجہ ہے کہ محدثین کی خبر اور شہادت اس بارے میں قبول نہیں کی جاتی۔ اہل اسلام جس طرح قرآن کو اصل اصول اور واجب العمل سمجھتے ہیں اسی طرح حدیث کو بھی وجوب عمل میں اُس کے مانند یقین کرتے ہیں۔ جس طرح قرآن کو وحی والہام جانتے ہیں اسی طرح حدیث کو بھی وحی والہام مانتے ہیں۔ فرق اسقدر ہے کہ قرآن کو بالالفاظ خدا کی طرف سے نازل سمجھتے ہیں اور حدیث کی نسبت خیال کرتے ہیں کہ وہ بلفظہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل نہیں ہوتی صرف اُس کے معنی ومضمون کا نزول بالالقا ہوا ہے۔ نیز وہ قرآن کو قطعی الثبوت مانتے ہیں۔ حدیث کو جو کہ تواتر کی حد تک نہیں پہنچی ظنی الثبوت تسلیم کرتے ہیں۔

حدیث کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک شبہ یہ کیا جاتا

[1] الحجر: ۹

ہے کہ حدیث کے راوی و ناقل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خویش و اقارب ہیں اس لئے اُن کی روایت و بیان کا چنداں اعتبار نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ دنیا میں جو ملت و مذہب ہے اور جو ہو چکا ہے اُس کے ناقل و محافظ اُس مذہب اور اُس کے بانی کے دوست و مصاحب خواہ قرابتی ہوں یا اجنبی، ہوتے ہیں وہ کونسا مذہب یا ملت ہے جس کے رواج دینے اور بیان کرنے والے محض دشمن اور مخالف ہی ہوتے ہیں۔ اس قسم کا شبہ زیادہ تر عیسائی کرتے ہیں لیکن وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ انجیل اور حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات و مقالات کے ناقل و راوی سب انکے مخالف یعنی یہود و ہنود و مسلمان وغیرہ ہیں۔ کیا مریم اور یوسف نجار اور حواریین، اُن کے صحبتی و قرابتی نہیں ہیں۔ نقل و روایت ہر مذہب و ملت کے باب میں عقل و انصاف کی رو سے دارومدار قبولیت و اعتبار ناقل کا چال چلن یعنی عدالت وغیرہ ہے۔ اصل بانی مذہب کی صداقت بھی اُس کے چال چلن سے دیکھی جاتی ہے اس میں مجرد قرابت و مغائرت وغیرہ نہیں دیکھی جاتی۔ جب چال چلن کی عمدگی کے ساتھ صحبت و قرابت بھی ملجاوے تو وہ اصل مذہب کے دریافت حال کے لئے عمدہ ذریعہ ہے کیونکہ گھر والا اپنے گھر کی چیزوں کو خوب جانتا ہے۔ ایک شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ کتب حدیث کے مؤلفین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات و مقالات کو بچشم خود نہیں دیکھا اور نہ اپنے کان سے سُنا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کی سُنی سُنائی باتوں کو قلمبند کر دیا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جب نقل و بیان میں قبولیت و اعتبار کا مدار ناقل کے چال چلن کی عمدگی پر ہے تو اس صورت میں ایک شخص کا یہ کہنا کہ میں نے فلاں امر کو بچشم خود دیکھا اور یہ کہنا کہ میں نے وہ امر ایسے شخص سے سنا ہے جس نے اس کا مشاہدہ کیا ہے سچ اور جھوٹ ہونے میں یکساں ہے اور ایک حکم رکھتا ہے۔ اگر ناقل سچا ہے تو اس کے وہ دونوں قول صحیح و درست اور قابل اطمینان ہیں اور اگر جھوٹا ہے تو دونوں قول غلط اور لغو ہیں اور وثوق و اعتماد کے قابل نہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص اپنی روایت کے بیان میں سچا اور سماع کے بیان میں جھوٹا ہو۔ بنا بریں علیہ امام مالکؒ کا یہ کہنا کہ میں نے فلاں حدیث نافع سے جو کہ ابن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں سنی اور انہوں نے حضرت ابن عمرؓ صحابی سے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی۔ اور امام بخاری کا یہ کہنا کہ میں

نے فلاں حدیث مکی بن ابراہیم سے سُنی اُس نے یزید بن ابی عُبید سے اُنہوں نے سلمہ بن اکوع صحابی سے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ ایسا ہے جیسے کوئی صحابی کہے کہ میں نے یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے۔ اگر ان راویوں کی عدالت وصداقت ثابت ہے، تو اُن کا کہنا بہ سچ اور مفید طمانیت ہے ورنہ جھوٹ اور غلط۔ اور سلسلہ اسناد کا قائم ہونا اور راویوں کے حالات کی تنقیح وتحقیق اور ولادت و وفات اور موضع قیام و سفر وغیرہ کی تفتیش مذہب اسلام کا حصہ ہے اس کی نظیر کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ ایسی حالت میں حدیث کی نسبت شک کرنا آفتاب پر خاک ڈالنا ہے۔

حدیث قرآن مجید کی تفسیر ہے

انسان کی ذات میں دو چیزیں اس قسم کی پائی جاتی ہیں کہ اُن میں ایک کی حالت دوسرے کی حالت وکیفیت سے بالکل علیحدہ وجُدا گانہ ہے لیکن بایں ہمہ دونوں میں تعلق وارتباط اس قسم کا ہے کہ اُس کو دیکھ کر جُدائی وعلیحدگی کا وہم وگمان بھی نہیں ہو سکتا وہ دو چیزیں کیا ہیں دل وزبان، روح وجسم، دل تمام بدن میں بادشاہ اور فرمانروا اور زبان اس کیلئے ایسی ہے جیسے اعلیٰ درجہ کا وزیر۔ بادشاہ قانون وقاعدہ مقرر کرتا ہے اور وزیر اُس کو جا بجا پھیلاتا ہے اور تشریح وتفصیل کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ روح سے زندگی کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور جسم سے کام لیا جاتا ہے اور زندگی سے جو فائدہ ونتیجہ ہے اُس کو ظاہر کیا جاتا ہے، دل وزبان دونوں اگرچہ گوشت کے ٹکڑے ہیں لیکن ایک پوشیدہ دوسرا ظاہر ایک بات کو چھپانے والا دوسرا ظاہر کرنے والا۔ ایک ایسا ہے جیسے مال وزر کے لئے خزانہ اور صندوق اور دوسرا ایسا ہے جیسے روپیہ پیسے کو اِدھر اُدھر تقسیم کرنے والا۔ دل کی کوئی بات بغیر زبان کے ظاہر نہیں ہو سکتی اور زبان بغیر دل کے اشارہ وارادہ کے حرکت نہیں کر سکتی، یہی کیفیت قرآن وحدیث کی ہے۔

قرآن تمام جہاں میں ایسا ہے جیسے انسان کے اندر دل اور حدیث ایسی ہے جیسے مُنہ میں زبان۔ قرآن قانون وقاعدہ کلی مقرر کرنے والا اور حدیث اس کی شرح وتفصیل کرنے والی اور اُس کی جزئیات وفروعات کو کھولنے والی۔

مثلاً حق تعالےٰ نے فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ الخ[1] یعنی اگر اللہ کا دوست اور بندہ ہونا منظور ہے تو محمد رسول مقبول کی پیروی کرو اور فرمایا مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ الخ[2] یعنی جس امر کے لئے تم کو فرما دے اُس کو قبول کر د۔ یہ حکم اور قانون دریائے عظیم کوزہ کے اندر بند ہزاروں جزئیات وفروع کو شامل ہے۔ کتب حدیث میں جس قدر احادیث صحیحہ پائی جاتی ہیں وہ قانون مذکور اور حکم مستور کی عمدہ طور پر شرح وتفصیل کرتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیاوی امور کو تم خوب جانتے ہو اور فرمایا اِذَا اَخْبَرْتُكُمْ بِرَاْيِيْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ یعنی جب میں تم کو کوئی بات اپنی رائے اور اندازہ سے بتاؤں تو اس قسم کے اُمور میں دیگر انسانوں کی طرح میں بھی ایک انسان ہوں یعنی اُس میں بھول چوک کا احتمال ہے رسُول مقبولؐ نے یہ بات بطور قاعدہ کلیہ کے فرمائی ہم کو قبول کرنا چاہیئے آیۂ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ کے تحت وہ بات بھی داخل ہے جو آنحضرتؐ نے دُنیاوی اُمور کے متعلق فرمائی یعنی اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ وغیرہ اور امورِ دینیہ کے بارہ میں جو احکام فرماتے وہ بھی بخوبی شامل ہیں۔ نماز و زکوٰۃ، حج وصوم، بیع وشرا، رہن اجارۂ حوالہ کفالہ وغیرہا کے متعلق جسقدر مسائل وجزئیات احادیث صحیحہ میں پائی جاتی ہیں وہ سب آیہ مذکورہ کے تحت بخوبی داخل ہیں۔

اس زمانہ میں بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اوّل بے سوچے سمجھے انہوں نے حدیث سے صاف انکار کیا جب چاروں طرف سے سوالات واعتراضات کی اُن پر بھرمار ہوئی تو بہت گھبرائے اور حیران ہوئے کہ بغیر حدیث کے کسی طرح کام نہیں چل سکتا آخر کروٹ بدل کر کہنے لگے کہ وہ احادیث قابل تسلیم وتصدیق ہیں جو قرآن کے الفاظ کا مطلب بیان کریں یعنی قرآن کے الفاظ وعبارت سے جو احکام ومسائل اجمالاً سمجھے جائیں اور حدیث انکی شرح وتفصیل کرے تو وہ حدیث قبول کرنے

---

(۱) آلِ عمران: ۳۱ (۲) الحشر: ۷

کے لائق ہے اور جس حدیث میں اس قسم کی شرح و تفصیل نہ پائی جائے اور اس سے قرآن مجید کے لفظ و عبارت کا مطلب مفہوم نہ ہو وے تو وہ قبول و تسلیم کے لائق نہیں۔ معلوم نہیں لفظ و عبارت کی شرح و تفصیل سے کیا مراد ہے اگر وہ بات مراد ہے جو ابھی بیان کی گئی یعنی قرآن مجید میں جو قواعد کلیہ مذکور ہیں احادیث اُن کے جزئیات و مسائل کو بیان کرتی ہے تو ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں اور غالباً سب مسلمان اس کو قبول کریں گے لیکن اس صورت میں احادیث کے متعلق یہ تفصیل و تفریق کہ جو لفظ و عبارت کی تشریح کرے وہ قابل قبول اور جو نہ کرے وہ لائق رد و انکار بالکل لغو و فضول ہے۔ اس لئے کہ جسقدر احادیث صحیحہ پائی جاتی ہیں وہ سب آیہ کریمہ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ الخ کے تحت داخل اور اُس کی شرح کرنے والی اور لفظ ما جو عام ہے اس کے افراد و جزئیات کو کھولنے والی ہیں اور اگر یہ مراد ہے کہ قرآن میں قاعدہ کلیہ کے ساتھ جزئیات و مسائل کا بیان بھی اجمالاً پایا جاتا ہے پس جن احادیث میں اُن جزئیات مجملہ کی تفصیل پائی جاوے وہ قابل قبول ہیں ورنہ ہرگز نہیں تو یہ سراسر غلط اور مردود مخدوش ہے۔ اس لئے کہ قرآن میں بہت سے احکام عام طور پر فرمائے گئے لیکن اُن کی جزئیات کو بالکل بیان نہیں فرمایا گیا صرف حدیث سے انکا علم حاصل ہوا مثلاً فرمایا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا[1] اس میں بیع و ربا کو خواہ عام کہا جاوے یا مجمل قرار دیا جاوے لیکن اُس کی جزئیات اور صورتوں کا بیان نہیں پایا جاتا۔ بیع کے معنی خرید و فروخت اور ربا کے معنی بڑھوتری کے ہیں یہ امر ظاہر ہے کہ جس طرح ہر قسم کی خرید و فروخت جائز نہیں اسی طرح ہر قسم کی بڑھوتری ناجائز نہیں دوسری جگہ فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً[2] (آل عمران ۱۳۰) آیت سے بظاہر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بڑھوتری کی صرف وہ مقدار حرام ہے جو کہ زائد اور کثیر ہے کم مقدار حرام نہیں لیکن اس کی پوری کیفیت حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح آیہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کے لفظ و عبارت سے اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح نہیں معلوم ہوتا کہ ظہر و عصر و عشاء کی چار رکعات اور مغرب کی تین اور صبح کی دو رکعت ہیں۔ اسی طرح قرآن سے نہیں معلوم ہوتا کہ نماز کے لئے قبلہ رُو ہونا ضروری ہے کیوں کہ آیت میں اس قدر مذکور ہے۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (البقرہ آیت ۱۵۰) یعنی جہاں کہیں تم ہو تو اپنے چہرے اس کی جانب پھیر دو یعنی بیت اللہ کی طرف۔ اس میں نماز کا نہ اجمالاً ذکر پایا جاتا ہے نہ صراحۃً نیز

---

[1] اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام۔ (البقرہ : ۲۷۵)

[2] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو۔

دوسری آیت یعنی فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ آیت ۱۱۵) یعنی جدھر بھی تم رُخ کرو گے ادھر ہی اللہ کا رُخ ہے اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ قبلہ رُخ ہونا ضروری نہیں بلکہ جس طرف رُخ کیا جاوے کافی ہو سکتا ہے۔ اب اس کی نسبت بتایا جاوے کہ بغیر احادیث کے امور مذکورہ کس طرح معلوم ہو سکتے ہیں۔ اور یہ احادیث کی نسبت جو کہا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے مثل اور برابر نہیں ہو سکیتو محض بے موقع اور بے محل ہے کیونکہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ احادیث بہمہ وجوہ قرآن کی ہم پلہ ہیں اور جس طرح نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے اسی طرح حدیث بھی نماز کے اندر پڑھنی چاہیئے، بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ جس طرح آیت قرآنی پر عمل کرنا ضروری ہے اسی طرح حدیث پر بھی ہے۔ خیال کرنا چاہیئے کہ توریت وانجیل اللہ کی نازل کی ہوئی کتابیں ہیں لیکن نماز کے اندر بجائے قرآن کے اُن کی تلاوت کافی نہیں ہو سکتی اگر توریت و انجیل تحریف سے محفوظ ہوتیں تب بھی اُن کی تلاوت بجائے قرآن کے ہرگز کافی نہ ہوتی اسی طرح حدیث کو تصور کرنا چاہیئے۔

اور حدیث کے راویوں ناقلوں پر اسلئے وثوق و اعتماد کیا جاتا ہے کہ شریعت نے ہم کو اس کے لئے ہدایت فرمائی ہے قال اللہ تعالےٰ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ (الحجرات : ۶) یعنی ایمان والوں کو چاہیئے کہ جب کوئی فاسق اُن کے پاس کسی قسم کی خبر لے کر آوے تو فی الفور اُس کو قبول کر کے عمل میں نہ لاویں بلکہ جانچ پڑتال سے کام لیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر نیک صالح آدمی کوئی خبر بیان کرے تو وہ قبول کرنے کے لائق ہے۔ شہادت کے بارے میں جناب اللہ نے فرمایا وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (پ ۲۸ الطلاق آیت ۲) یعنی اپنے لوگوں میں سے دو شخص عدل والے گواہ کر دو، اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کی نسبت یہ معلوم ہو جاوے کہ اس میں عدالت پائی جاتی ہے تو اُس کی گواہی قبول و تسلیم کے لائق ہے۔ اور زنا کے متعلق سورہ نور میں فرمایا لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (النور ۱۳) یعنی جو لوگ دوسروں کو زنا کی تہمت لگاتے ہیں وہ چار گواہ کیوں نہیں پیش کرتے۔ جب انہوں نے چار گواہ حاضر نہ کئے تو وہ لوگ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں۔ اس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے شہادت کو کس قدر وثوق و اعتماد کے لائق قرار دیا اور جو امر شہادت سے ثابت نہ ہوا اسکو اپنے نزدیک بے اعتبار اور دروغ ٹھیرایا۔ اسی طرح جو عادل و ثقہ راوی حدیث بیان کرتا ہے وہ قابل اعتبار اور اللہ کے نزدیک سچ اور صحیح ہے اس کو ضرور قبول کرنا چاہیئے۔ معاملات اور مہمات کا سلسلہ

اسی طرح جاری ہے اگر کسی کی خبر[۱] اور شہادت پر اعتبار نہ کیا جاوے تو نظام عالم درہم برہم ہو جاوے اور کسی قسم کے مقدمے اور جھگڑے کا فیصلہ نہ ہونے پاتے نہ زناکار کو سنگسار کیا جائے نہ تازیانہ کی سزا دی جاوے نہ چور کے ہاتھ کاٹے جائیں نہ جان کے بدلے جان کو مارا جائے اور نہ چاند دیکھنے کے بارہ میں کسی خبر کا خیال کیا جاوے کیونکہ اس قسم کے معاملات و امور کا دارومدار زیادہ تر شہادت پر ہوتا ہے اگر شہادت سے کوئی جرم پایۂ ثبوت کو پہنچا تو سزا دی جاویگی ورنہ ہرگز نہیں کیا وجہ ہے کہ حدیث کے راویوں کی نسبت طرح طرح کے شبہات کئے جاتے ہیں اور گواہوں کی گواہی کو فی الفور قبول کیا جاتا ہے۔

حدیث نبوی کے بارے میں شبہات اور انکا ازالہ

کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی ذہنیت اور اعمال حیرت کے لائق نہیں کیونکہ وہ قرآن کے منکر رسول سے منحرف اور ضروریات دین سے برگشتہ ہیں لیکن سخت افسوس اُن ظالموں کی حالت پر ہے کہ زبان سے کلمۂ شہادت پڑھتے ہیں اور توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہیں اور اسلام کو صحیح و راست کہتے ہیں اور باایں ہمہ اسلام کے اجزا و ارکان کو منہدم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک رکن کو مانتے ہیں اور دوسرے سے انکار کرتے ہیں اور زندگی کے لئے دل اور جگر دونوں کا ہونا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ صرف دِل کو قائم رکھنا اور جگر کو دور کرنا چاہتے ہیں اور صرف غذا کی ضرورت تصوّر کرتے ہیں اور پانی کو لغو و فضول قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ حقیقت میں مسلمانوں کے نامہربان دوست اور جوفروش گندم نما ہیں ان لوگوں کا صداقت و راستبازی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اپنی ذات کو مرجع خلائق بنانا اور دین میں رخنہ ڈالنا مدنظر ہے انکا ظاہر میں اپنے

---

[۱] - شہادت اور روایت (خبر) میں فرق آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

آپ کو مسلمان کہنا محض منافقانہ اور خود غرضانہ ہے۔ انہی لوگوں میں سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں غدر کے بعد خروج کیا اور نئی روشنی کی مصنوعی جھلک سے بہت سی کمزور نگاہوں کو خیرہ بنایا اور زور شور سے دعویٰ کیا کہ ہم لوگ اسلام کو فلسفہ اور علم جدید کے حملہ سے بچانا چاہتے ہیں اور اسی غرض سے قرآن مجید کی تفسیر طرز جدید پر تیار کرتے ہیں۔ چنانچہ اس تفسیر کا ایک حصہ تیار ہوا اور جابجا بلاد و قصبات میں پھیلا۔ معلوم ہوا کہ اسلام کو کسی حملہ سے نہیں بچایا گیا بلکہ اس کے احکام و مضامین کی ترمیم کی گئی معجزات و خوارق عادات کو خرق نیچر و خلاف قانون قدرت سمجھ کر دور پھینکا گیا اور یہود کی طرح تحریف و تاویل کا دروازہ کھولا گیا۔ قوم کی خیر خواہی اور ریفارمری کا دعویٰ کیا گیا لیکن اس دعویٰ کو ایسے پیرایہ میں ثابت کیا گیا جس سے صاف طور پر اندازہ ہوا کہ قوم کے ساتھ مسلمان اور محمدی ہونے کے لحاظ سے کسی قسم کی دردمندی نہیں کی جاتی بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ انسان اور بنی آدم ہیں خیر خواہی عمل میں لائی جاتی ہے اور اس امر کی مطلق پروا نہیں کہ قوم کے ساتھ مسلمان اور پیرو اسلام ہونے کی قید کیوں لگائی جاتی ہے اور خیر خواہی کے وقت اس کا لحاظ کیوں نہیں کیا جاتا۔ مطلب یہ کہ زیادہ تر اُسی تعلیم میں کوشش کی گئی جس سے مال و دولت میں ترقی اور حکام وقت کے نزدیک عزت و آبرو پیدا ہو مذہبی فرائض و ضروریات خواہ عمل میں آئیں یا نہ آئیں۔ ایسی حالت میں صرف دنیاوی دردمندی پر اکتفا کیا جاتا تو مناسب ہوتا اور کوئی خلل واقع نہ ہوتا لیکن جب بیدردی کے ساتھ دین میں بھی دخل دیا گیا اور لاکھوں عاشقان اسلام کا دل دکھایا گیا تو جس قدر خرابی پیدا ہو کم ہے۔ غیر قومیں اسلام پر کچھ کم حملہ نہیں کرتیں پھر کیا ضرورت ہے کہ اسلام کا جامہ پہن کر اور سوانگ بھر کر دین محمدی پر حملہ کیا جائے باہر کے چور بہت ہیں گھر کے اندر سے چوروں کے خروج کرنے کی کیا حاجت ہے۔ پھر مدت دراز کے بعد پنجاب میں ایسا شخص اسلام کا برقع پہن کر آیا جو نئی روشنی والوں سے بھی بڑھ چڑھ کر اور برملا دعویٰ کیا کہ میں عیسیٰ مسیح ہوں مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ اس فتنہ کی آگ سلگ رہی تھی کہ اُسی صوبہ سے ایک اور شخص اُسی کا چھوٹا بھائی پیدا ہوا اور جابجا مشتہر کیا کہ علم حدیث کی سب کتابیں غلط اور لغو اور ناقابل عمل ہیں صرف قرآن ہمارے لئے کافی و وافی ہے۔ اس سے پہلے جس قدر فتنے برپا ہوئے اُن کے رفع دفع کے لئے علمائے نامدار نے بہت کوشش فرمائی چنانچہ اس کا اثر بھی ظاہر

ہوا اور فتنہ کا زور شور بہ نسبت سابق کم ہو گیا لیکن یہ آخری فتنہ تخمیناً دو تین سال سے برپا ہوا ہے اور یہ بھی نئی روشنی والوں کی طرح رنگ دکھاتا ہے لیکن ظاہر کرنے کا طریقہ جدا گانہ ہے لہٰذا مناسب ہوا کہ اس فتنہ کی اچھی طرح سرکوبی کی جائے اور جرح و قدح اور تحریر جوابات میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے انشاء اللہ تعالےٰ ضیاء السنہ میں آہستہ آہستہ اس بارے میں مضامین شائع ہوں گے پس واضح ہو کہ چکڑالوی فتنہ انگیز نے اپنے رسالہ اشاعۃ القرآن وغیرہ میں اور اُس کے حواریوں نے بعض دیسی اخباروں میں زور شور کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام میں کوئی کتاب قرآن مجید کے سوا صحیح و قابل اعتبار نہیں کُتب حدیث جسقدر کہ دستور العمل قرار دیجاتی ہیں وہ سب غیر معتبر بلکہ لغو اور غلط ہیں اس لئے کہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول حق پر جو وحی نازل ہوتی تھی کفار کو اُسی کی مثل بنا کر لانے کی تاکید کی گئی تھی اور یہ امر مسلّم ہے کہ مثلِ قرآن مجید ہی کے چاہی گئی تھی جس کے لانے سے تمام دنیا عاجز ہو گئی جیسا کہ اشاعت القرآن صفحہ ۳۸ و ۳۹ وغیرہ میں مذکور ہے پھر صفحہ ۴۶ و ۴۷ وغیرہ میں بیان کیا ہے کہ قرآن شریف میں ہر امر کا بیان تفصیل کے ساتھ موجود ہے چنانچہ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ اور تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ وغیرہ الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں پس حدیث کی کیا ضرورت ہے اور جب یہ کہا جائے گا کہ قرآن کے بعض احکام مجمل اور قابلِ تشریح ہیں اور حدیث سے اُن کی شرح و تفصیل معلوم ہوتی تو اللہ تعالےٰ پر نقص کا الزام قائم ہو گا۔ یہ ہے چکڑالوی صاحب کی تحریرات کا خلاصہ اور لب لباب اب جواب کی طرف توجہ کی جاتی ہے واضح ہو کہ چکڑالوی اس امر کا قائل ہے کہ احکام الٰہی میں سے کوئی حکم منسوخ نہیں ہوا اور کُتب سابقہ توریت و انجیل وغیرہ کے احکام میں سے کسی حکم پر نسخ وارد نہیں کیا گیا بلکہ قرآن مجید توریت و انجیل کے موافق نازل ہوا ہے اور قرآن مجید کا کوئی حکم حکم توریت و انجیل کا ناسخ نہیں" اب خیال کرنا چاہیئے کہ توریت بھی اللہ کا کلام جو کہ موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا اور بہت سے انبیاء کے لئے صدیوں تک قائم رہا جیسا کہ فرمایا[ع۱] اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا الخ المائدہ ایت ۴۴ اور فرمایا اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ

ع۱ بے شک ہم نے نازل فرمائی توریت اُس میں ہدایت ہے اور نور ہے حکم کرتے ہیں اُس کے ساتھ انبیاء ۱۲

مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ الخ (البقرۃ آیت ۷۵)اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ توریت اللہ کا کلام ہے اور اسی کلام میں یہود نے تحریف کی یہ نہیں کہ مضمون و معنی کا رسول کے قلب پر القا کیا گیا اور لفظ و عبارت اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئی بلکہ عبارت اور معنی دونوں حق تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوئے یہی کیفیت انجیل کی ہے اور سب کے بعد قرآن کی بھی یہی کیفیت ہے یعنی حق تعالےٰ نے احکام لفظ و معنی کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائے۔ جب یہ امر معلوم ہوا تو دیکھنا چاہیئے کہ توریت کے بعد زبور اور اس کے بعد انجیل اور سب کے بعد قرآن مجید نازل ہونے سے کیا فائدہ اور نفع حاصل ہوا یہ امر ظاہر ہے کہ حق تعالےٰ کا کوئی فعل عبث اور بے فائدہ نہیں بلکہ حکمت اور مصالح سے لبریز ہے پس تمام دنیا کیلئے ایک کتاب کو کافی نہ قرار دینا بلکہ وقتاً فوقتاً متعدد کتابیں نازل فرمانا کس لئے بے ضرورت اور بے فائدہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی نہیں ہوا کہ ہر پیغمبر کے لئے جُدا جُدا کتاب نازل کی گئی بلکہ کتابیں کل چار نازل ہوئیں اور چند صحیفے وارد ہوئے صدہا پیغمبروں اور ان کی اُمتوں کے لئے یہی کتابیں اور اس قدر صحیفے کافی و وافی ہوتے اب اگر یہ خیال کیا جاتے کہ جس قدر احکام اور مضامین توریت میں بیان کیئے گئے اُسی قدر اور اُسی کے موافق انجیل اور قرآن میں بیان کیئے گئے اور کسی قسم کا فرق اور تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا تو یہ آیات قرآنی کی صریح مخالفت ہے۔ اس لئے کہ سورہ عمران میں اللہ پاک فرماتا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کی کیفیت اس طرح پر ذکر کرتا ہے وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ الخ اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ توریت میں بعض اشیاء بنی اسرائیل پر حرام کی گئی تھیں انجیل میں وہ اشیاء حلال کی گئیں اور حرمت کا حکم منسوخ کیا گیا اور یہ بھی پایا گیا کہ قرآن کا توریت وانجیل کی تصدیق کرنا اور اسی طرح انجیل کا توریت کے موافق ہونا جیسا کہ قرآن میں جابجا مذکور ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ہر حکم اور مضمون میں تمام کتابیں باہم موافق ہیں بلکہ اُصول اسلام ثبوت توحید و نفی شرک وغیرہ میں موافقت کا اظہار مقصود ہے فروعی مسائل میں بہمہ وجوہ مطابقت کا بیان منظور نہیں اور سورہ قصص میں حق تعالےٰ فرماتا ہے فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَاۤ اُوْتِیَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ

عہ کیا تم امید کرتے ہو کہ وہ تمہارا یقین کرلیں گے حالانکہ ایک گروہ اُن میں سے اللہ کی کتاب کو سنتا ہے پھر اس کو بدل ڈالتا ہے سمجھنے کے بعد ۱۲ (۲) آل عمران: ۵۰

مُوسیٰ[1] الخ مطلب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کہتے تھے کہ اے اللہ تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم اُس کی پیروی کرتے اور ایمان سے مشرف ہوتے جب اللہ کی طرف سے اُن پر حق نازل ہوا اور محمد علیہ السلام اُس کو لے کر آئے تو کہنے لگے کہ محمدؐ کو موسیٰ علیہ السلام کے مثل کتاب کیوں نہ دی گئی۔ اس سے بھی صاف طور پر معلوم ہوا ہے کہ قرآن جملہ اُمور میں توریت و انجیل کے موافق نہیں اسی خیال سے لوگوں نے کہا تھا کہ موسیٰؑ کے مانند کتاب کیوں نہ نازل کی گئی۔ پس جب یہ امر بخوبی ظاہر ہوا کہ پہلی کتاب میں جو احکام بیان کئے گئے وہ کامل طور پر دوسری کتاب میں نہیں بیان کئے گئے بلکہ حسب موقع و محل دوسرے طور پر ظاہر کئے گئے ایسے ہی دوسری کتاب میں جو احکام ہیں تیسری کتاب میں کچھ فرق و تفاوت کے ساتھ بیان کئے گئے تو یہی کیفیت احادیث کی تصوّر کرنی چاہیئے مقصود یہ ہے کہ قرآن وحدیث دونوں حق تعالےٰ کی طرف سے ہیں قرآن متن متین اور حدیث شرح مُبین توریت و انجیل و قرآن کی بھی یہی کیفیت ہے کہ بعض احکام ایک کتاب میں مجمل و مختصر طور پر مذکور ہیں دوسری کتاب میں مفصل و مشرح طور پر مرقوم ہیں بعض احکام ایک میں نہیں تو دوسرے میں موجود ہیں اس سے کلام الٰہی میں کوئی نقص و عیب قائم نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں بلاشک اللہ تعالےٰ نے فرمایا تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ[2] مقصود اس سے یہی ہے کہ قرآن میں جو کچھ بیان ہوا وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور حدیث میں جو احکام کی شرح کی گئی وہ بھی حق تعالےٰ کی طرف سے ہے پس متن یعنی قرآن اور شرح یعنی حدیث میں ہر امر دینی اور جملہ احکام شرعی کا بیان اور تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے۔ سخت تعجب یہ ہے کہ چکڑالوی بار بار یہ بھی کہتا ہے کہ صرف قرآن میں تمام احکام کا بیان تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور جب اُس سے ثبوت طلب کیا جاتا ہے اور بعض امور کی نسبت سوال کیا جاتا ہے تو جواب اس قسم کا پیش کرتا ہے جس سے تفصیل و تشریح کا نشان بھی نہیں معلوم ہوتا مثلاً اس سوال کے جواب میں کہ کافر مسلمان کے ترکہ سے میراث نہیں پا سکتا لکھتا ہے کہ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ[3] (النساء آیت) میں الف و لام عوض مضاف الیہ ہے اور مراد اُس سے ہم جنس یعنی ہم مشرب مراد ہے۔ ناظرین خیال فرماویں کیا تفصیلی بیان اسی کا نام ہے کہ الف لام

---

(۱) القصص: ۴۸ (۲) النحل: ۸۹

[3] مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے ۱۲

عوض مضاف الیہ اور اُس سے مراد ہم مشرب۔ اس میں تفصیل کا نشان بھی نہیں بلکہ
غایت درجہ کا اجمال و اختصار ہے اسی طرح آیہ وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَیۡنَ الۡاُخۡتَیۡنِ[1] (النساء ایت ۲۳) میں
الف ولام کو عہدی قرار دینا اور اُس سے امر معہود مراد لینا بھی تفصیل سے خالی ہے بلکہ
سراسر اجمال و اختصار پایا جاتا ہے اس قسم کے احکام کی تفصیل سوا حدیث کے اور کہیں
نہ پائی جائے گی۔ چکڑالوی کی دلیل اُس کے دعویٰ کے بالکل خلاف ہے۔

چکڑالوی نے قرآن مجید میں دیکھا ہوگا کہ گذشتہ اُمتوں میں یہ کیفیت پائی جاتی تھی
کہ جب وہ صدقہ و قربانی کو عمل میں لاتے تھے تو اُس کے مقبول ہونے کی حق تعالےٰ کی طرف
سے یہ علامت پیدا ہوتی تھی کہ خود بخود آگ پیدا ہوتی تھی اور قربانی کو کھا جاتی تھی اور
آگ کا پیدا نہ ہونا اور قربانی کو نہ کھانا اُس کے مردُود اور غیر مقبول ہونیکی نشانی یقین
کی جاتی تھی جیسا کہ سورہ عمران میں مذکور ہے اَلَّذِیۡنَ[2] قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیۡنَاۤ
اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡکُلُہُ النَّارُ ؕ قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ
قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ لیکن
اُمت محمدیہ کے لئے اس قسم کی علامتوں کا اظہار بالکل موقوف کیا گیا اس تبدیلی و تغیر میں جو
حکمت اور مصلحت ہے اس کا پورا علم تو اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں لیکن ظاہر میں ایک بات
یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُمت محمدیہ بہ نسبت امم سابقہ کے کمزور و ناتواں ہے نہ اس کی عمر
بہت دراز ہوتی ہے اور نہ جسمانی قویٰ اور قد و قامت میں بہت بڑائی پائی جاتی ہے اور
گذشتہ لوگوں کی عمر بھی بہت بڑی اور قد و قامت اور جسمانی حالت بھی بہت زیادہ۔
اس لئے اُن کے لئے انتظامات سخت قائم کئے گئے اور معصیت کی وجہ سے نہایت سخت
عذاب اُن پر نازل کئے گئے۔ صدقہ وغیرہ کی نسبت دنیا میں فی الفور ظاہر ہو جانا کہ مقبول
ہے یا مردود سخت تنبیہ اور تازیانہ الٰہی ہے جس سے آنکھیں کھل جاتی ہیں اور عزت
و ذلت اور ندامت و سُرخروئی کی کیفیت عمدہ طور پر ظاہر ہو جاتی ہے اُمت محمدیہ کے لئے

---

[1] اور تم پر حرام کیا گیا ہے یہ کہ دو بہنوں کو اکٹھے نکاح میں
رکھو ۱۲

[2] جنہوں نے کہا اللہ نے ہم سے عہد کر لیا ہے کہ ہم کسی رسول کا یقین نہ کریں جب تک
(اپنی صداقت کے لئے قربانی پیش نہ کرے پھر اُس کو آگ کھا جاوے۔ کہہ اے محمد مجھ سے پہلے تم
پہ اللہ کے رسول دلائل لائے اور تمہارے مطلوبہ معجزات دکھائے پھر تم نے انکو کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو ۱۲
(آل عمران : ۱۸۳)

یہ ناز بانہ دنیا میں موقوف کیا گیا اور قیامت و آخرت کے لیئے ملتوی کیا گیا، جس طرح اس قسم کا تغیر و تبدل انتظامات میں حق تعالے کی طرف سے ظہور میں آیا تو اگر بعض احکام شرعی اُس معبُود کی طرف سے منسوخ قرار دیئے گئے تو کیا خرابی پیدا ہو گئی دونوں صُورتوں کی حالت قریب قریب ہے۔

حدیث نبویؐ کے بارے میں مناظرہ

چند روز سے یہ خبر سُنی جاتی تھی کہ پنجاب میں دو عالموں کے درمیان احادیث نبویہؐ کے بارہ میں زور شور کے ساتھ تقریری و تحریری مناظرہ و مباحثہ جاری ہے اُن میں ایک عالم یعنے مولوی ابوسعید محمد حسین بٹالوی تو وہی بات بیان کرتے ہیں جو سلف صالحین اور ائمہ محدثین سے منقول اور اب تک اہل اسلام کے نزدیک مقبُول ہے یعنی جس طرح قرآن پر عمل کرنا واجب اسی طرح حدیث نبویؐ پر ہے اور حدیث قرآن کے لئے شارح و مفصل ہے دوسرے عالم یعنی مولوی عبداللہ چکڑالوی اس کے خلاف فرماتے ہیں اور خرق اجماع کو عمل میں لاتے ہیں یعنی قرآن کے ہوتے ہوئے حدیث کی کوئی ضرورت نہیں قرآن بذات خود شرح و مفصل ہے اُس کے لئے کسی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں جب اُن سے سوالات کئے گئے کہ فلاں فلاں حکم قرآن میں نہیں پایا جاتا بلکہ حدیث سے ثابت کیا جاتا ہے۔ تو اس کے جواب میں انہوں نے بزعم خود قرآن سے ثبوت پیش کیا چنانچہ منجملہ سوالات کے ایک سوال ان سے یہ کیا گیا کہ قرآن میں گدھے کی حرمت کہاں ثابت ہے اور خالہ و بھانجی اور پھوپھی و بھتیجی کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی حُرمت کس طرح ثابت ہے اُس کے جواب میں مولوی صاحب موصوف نے مندرجہ ذیل خامہ فرسائی فرمائی کہ گدھا و خچر وغیرہ کی حُرمت آیہ کریمہ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ[1] سے ثابت

---

[1] جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا پھر اُنہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا ان کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوتی ہوں۔ کیا ہی بُری مثال ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔

ہے۔ گدھا جو رجس[2] میں داخل ہے۔ اسی واسطے کفار کو اُس کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور جو چیز کہ رجس یا فسق ہے وہ بموجب آیۂ کریمہ : قُلْ لَآ اَجِدُ فِيْمَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا[3] الخ - حرام ہے۔ اس کی نسبت کمال افسوس کے ساتھ گزارش ہے کہ مولوی صاحب چکڑالوی نے دعویٰ تو اس قدر پُرزور کیا جو صحابہؓ سے لے کر آج تک کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ آیا اور ثبوت میں وہ توجیہات کیں اور کمزور باتیں پیش کیں کہ جن کا سر نہ پاؤں - اگر گدھے کی حرمت اس وجہ سے ثابت ہے کہ اُس کے ساتھ کفار کو تشبیہ دی گئی تو خیال کرنا چاہیئے کہ کفار کی نسبت اللہ تعالےٰ نے چند مقامات میں فرمایا ہے: اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ[4] - اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا[5] - اس سے تمام بہائم بقر و غنم و شتر وغیرہ کی حرمت لازم آئیگی حالانکہ مذکورہ جانوروں کی حلّت وطہارت خود قرآن سے ثابت ہے اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ کفار کو وحوش و بہائم کے ساتھ مثال دینے سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ اُنکی حُرمت بیان کی جائے بلکہ منظور یہ ہے کہ جس طرح وحوش و بہائم بے عقل و بے تمیز ہیں اور نیک و بد کی تمیز نہیں کرتے اسی طرح کفار و مشرکین ہیں - اس موقعہ میں حُرمت و نجاست کا وہم و گمان بھی نہیں اگر حُرمت و نجاست قرار دی جائیگی تو دو خرابیوں میں سے ایک خرابی ضرور لازم آئیگی یا تو مثال غلط ہوگی یا بقر و غنم وغیرہ کو حلال و طاہر قرار دینا خلاف واقع ہوگا نعوذ باللہ، یہ امر مسلّم ہے کہ جو شے رجس میں داخل ہو وہ حرام ہے لیکن یہ کیونکر معلوم ہوا کہ گدھا و خچر بھی رجس میں شامل ہے قرآن مجید میں اس کے لئے کوئی معیار و علامت بیان نہیں کی گئی اگر یہ وجہ قرار دی جائے کہ گدھا گندگی کھاتا ہے تو یہی وجہ مُرغ و گائے وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے باقی رہا گندگی کا اصلی غذا ہونا سو یہ امر کسی میں بھی نہیں پایا جاتا - گندگی اس وقت کھائی جاتی ہے جب دانہ چارہ وغیرہ میسّر نہیں ہوتا۔

---

[2] رجس یعنی نجس ناپاک

[3] (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر اس کا کھانا حرام ہو الاّ یہ کہ مردار ہو، یا بہتا ہوا خون یا سؤر کا گوشت کہ وہ ناپاک ہے یا (اس جانور کا کھانا موجب) معصیت ہو - جس پر غیراللہ کا نام (ذبح کرتے ہوئے) لیا گیا ہو (تو بلاشبہ وہ بھی حرام ہے)

[4] یہ لوگ (کفار) مویشیوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ -

[5] یہ لوگ (کفار) مویشیوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ

یہ امر ظاہر ہے کہ حرمت کے لئے دلیل قطعی کی ضرورت ہے جس میں دوسرا احتمال نہ پایا جائے اور آیۂ مذکورہ دلیل قطعی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ دوسرے سوال کے جواب میں فرمایا ہے کہ خالہ و بھانجی اور پھوپھی و بھتیجی کا نکاح میں جمع کرنا آیۂ کریمہ: وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ [1] سے بخوبی ثابت ہے کیونکہ الف و لام اَلْاُخْتَیْنِ میں جنسی ہے بمعنی مثل یعنی جو دو عورتیں دو بہنوں کے مثل ذوی القربیٰ ہوں انکا نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ اس کی نسبت گزارش ہے کہ اگر اُخْتَیْنِ سے مراد مثل و مشابہ لیا جائے گا تو دو خالاؤں یا دو پھوپھیوں کی دو بیٹیوں کا بھی نکاح میں جمع کرنا حرام ہوگا کیونکہ یہ مثل اُخْتَیْنِ کے ذوی القربیٰ ہیں پھر الف لام کو جنسی قرار دینا اور اختین سے مثل و مشابہ مراد لینا اس پر کیا دلیل اور قرینہ ہے الف لام میں عہد کا بھی احتمال ہے کس دلیل اور قرینہ سے یہ احتمال رفع ہو سکتا ہے پھر آخر حدیث کی طرف رجوع کیا جائیگا اور بغیر اس کے چارہ نہ ہوگا منجملہ سوالات کے ایک سوال آن سے یہ کیا گیا کہ قاتل کا اپنے مقتول کے ترکہ سے محروم ہونا اور ایک مذہب والے کا دوسرے مذہب والے کے ترکہ سے حصہ نہ پانا قرآن میں کہاں ثابت ہے اس کے جواب میں یہ ارشاد ہوا کہ یہ دونوں باتیں آیۂ کریمہ یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ [2]۔ یعنی عبارت قرآن مجید سے مطلق وارثوں کی وراثت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ الذکر والانثی ۔ میں الف و لام عوض مضاف الیہ کا ہے یعنی مرد تمہارے جنس اور عورت تمہاری جنس یعنی ہم مذہب و ہم مشرب الخ اس کے جواب میں بھی بکمال افسوس گذارش ہے کہ یہ محض تکلف اور تاویل ہے الف لام کو عوض مضاف الیہ قرار دینا اور مضاف الیہ مثل و جنس محذوف ماننا اس پر کیا دلیل اور کیا قرینہ ہے؟ اور قطعی طور پر قاتل و مخالف مذہب کا محروم الارث ہونا کیونکر ثابت ہو سکتا ہے اوّل تو مثل و جنس کو مضاف قرار دینا اور پھر مثل و جنس سے مراد ہم مذہب لینا تکلف پر تکلف ہے۔ قرآن مجید میں جابجا پیغمبروں کو کفار و مشرکین کا بھائی اور ہم جنس فرمایا ہے۔ مثلاً

---

[1] اور دو بہنوں کا ایک ساتھ (نکاح میں) رکھنا بھی (تم پر حرام ہے)

[2] (مسلمانو) تمہاری اولاد (کی میراث) کے بارے میں اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا کرو۔ (النساء : ۱۱)

فرمایا وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا۔ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صَالِحًا۔ اِذْ قَالَ لَھُمْ اَخُوْھُمْ نُوْحٌ۔ قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ۔ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی الخ جب یہ بات ہے تو پھر مثل وجنس سے ہم مذہب لینے کی کیا ضرورت ہے بہر حال حدیث کی طرف رجوع کیا جائے گا اور بغیر اس کے چارہ نہ ہوگا۔ منجملہ سوالات کے ایک سوال یہ کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مال کا قابل وراثت نہ ہونا بلکہ صدقہ ہوجانا قرآن میں کہاں ثابت ہے اس کے جواب میں ایک طویل تقریر فرمائی خلاصہ اس کا یہ ہے کہ وراثت اُس شخص کے لیئے ہوسکتی ہے جو کچھ مال وجائداد چھوڑ جائے اور جو اپنی زندگی میں تمام مال کو صدقہ وخیرات کردے اور کوئی شے باقی نہ چھوڑے تو اس کے لیئے وراثت کا کوئی موقعہ ومحل نہیں اور دلیل میں صحیح بخاری کی حدیث مَاتَرَکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ دِیْنَارًا وَّلَادِرْھَمًا الخ اس کے جواب میں گذارش ہے کہ قرآن مجید سے یہ امر ثابت نہیں ہوسکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مال قابل وراثت نہیں، اگر یہ امر ثابت کیا جاتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مال باقی نہیں چھوڑا تب بھی گنجائش ہوتی بلکہ اس کے لیئے حدیث بخاری کی طرف رجوع کیا گیا چند سوالات مولوی صاحب چکڑالوی کی خدمت میں پیش کیئے جاتے ہیں۔ (۱) نماز کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ لیکن نماز کے ارکان اور مقدار رکعات کا بیان نہیں پایا جاتا پس براہ کرم بیان کیا جائے کہ ظہر وعصر وعشاء کی چار رکعت اور مغرب کے لئے تین اور صبح کے لیئے دو رکعت کا ہونا کس آیت سے ثابت ہے۔ ایسے ہی زکواۃ کی نسبت سوال ہے کہ اُس کے لئے کوئی مقدار اور فرضیت کا وقت ہے یا نہیں اگر ہے تو کس آیت سے اسکا ثبوت دیا جاتا ہے؟ اور اگر نہیں تو پھر ادائے زکواۃ کی کیا صورت ہے؟

(۲) سود کے بارہ میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا: لَاتَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً[3] اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سود مطلقاً حرام نہیں بلکہ اس کی مقدار کثیر حرام ہے اور

---

[1] اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف اس کے بھائی (بندوں میں سے) ہود کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا۔

[2] (اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہہ دو کہ میں تو بس تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔

[3] بڑھ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو۔ (آل عمران: ۱۳۰)

آیہ : اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا[1] میں قائل کہہ سکتا ہے کہ الرّبٰو میں الف ولام عہدی ہے یعنی وہ ربٰو جس کی مقدار کثیر ہو ہیں مطلق ربا کی حرمت کس آیت سے ثابت ہے ؟

(۳) میوہ جات وزراعت کے بارہ میں آیہ کریمہ : وَآتُوا حَقَّہٗ یَوْمَ حَصَادِہٖ[2] وارد ہے۔ لیکن حق کو مجمل چھوڑا گیا اُس کی مقدار و کیفیت کو بیان نہیں کیا گیا۔

ایک اعتراض کا جواب

قرآن میں بلقیس کے بارہ میں فرمایا : اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ اگر یہاں کُل شئے مراد لی جاوے ، الخ ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ۔ اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ[3] کلام ہدہد ہے اللہ پاک نے ہدہد کا کلام نقل کیا ہے جس سے استدلال ٹھیک نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بلقیس کے متعلق بلاشک ہدہد کا یہ قول نقل کیا ہے لیکن چونکہ حق تعالےٰ نے مذمت ونقص کے طور پر نقل نہیں کیا اور نہ اُسکی غلطی کسی مقام پر ظاہر فرمائی اور نہ کسی قسم کی تردید کی اور سلیمان علیہ السلام نے بھی سُن کر یہ نہیں فرمایا کہ اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ کہنا غلط ہے۔ کیونکہ ہمارا ملک اور بہت سے ممالک اس کو حاصل نہیں، تو معلوم ہوا کہ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ کہنا بموجب محاورہ لغت عرب بہت صحیح تھا اور مقصود یہ نہیں ہو سکتا کہ جہان کی تمام اشیاء اس کو دی گئیں۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ اس کی سلطنت بہت وسیع اور مال و دولت وخزانہ کی کثرت تھی گویا تمام جہان کی اشیاء اس کو حاصل تھیں۔ مکہ کے بارہ میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے : یُجْبٰٓی اِلَیْہِ ثَمَرَاتُ کُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا۔[4] یہاں بھی کل شی کی ہی کیفیت ہے۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی نے بیان کیا کہ حدیث سے عام ومطلق آیت کی تخصیص وتقیید نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عام کی تخصیص کرنا افضل کا کام ہے مساوی کا کام نہیں چہ جائیکہ مخلوق خالق کے عام کلام کو مخصوص کرے اور جبکہ قرآن کے بارے میں ارشاد ہوا تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ

---

[1] اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ (البقرہ : ۲۷۵)

[2] اور اس کے کاٹنے کے دن اللہ کا حق ادا کرو۔ (الانعام : ۱۴۱)

[3] اور ہر طرح کے ساز وسامان اس کو میسر ہیں۔ (النمل : ۲۳)

[4] جہاں (یعنی مکہ میں) ہر قسم کے پھل کھچے چلے آتے ہیں۔ ہماری طرف سے رزق کے طور پر۔ (القصص : ۵۷)

تو کسی کی تخصیص و بیان کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے جواب میں گذارش ہے کہ اگر حدیث کو صرف آنحضرتؐ کا قول یا کسی شخص کا کلام قرار دیا جائے اور حق تعالےٰ کی طرف سے نازل نہ تصور کیا جائے تو اس صورت میں بلاشک عام آیت کی تخصیص حدیث سے نہیں ہو سکتی لیکن جب یہ بخوبی ثابت ہوا کہ قرآن و حدیث صحیح دونوں اللہ کی جانب سے ہیں جیسا کہ مضامین سابقہ میں بیان کیا گیا تو بیان و تخصیص میں کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ کمال خوبی و عمدگی پائی جاتی ہے تعمیم و تخصیص دونوں کا حاکم و آمر اللہ تعالےٰ ہے کسی کلام کو ایک مرتبہ عموم کے پیرایہ میں اور دوسری مرتبہ خصوص کے طرز میں بیان کرنا عمدہ طرح کی شرح و تفصیل اور سامعین کے لئے پوری تسکین کا باعث ہے علاوہ بریں عام و خاص میں تعارض نہیں کیونکہ معارضہ میں ایک کی بات ہرگز نہیں پائی جاتی۔ اور تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ میں اگر لفظ کل شی سے مراد عام و مطلق لیا جائے اور کہا جائے کہ ازل سے ابد تک جس قدر اشیاء موجود ہوئیں اور ہونگی خواہ وہ جاندار ہوں یا بیجان، پرند ہوں یا چرند سب کا بیان قرآن میں مفصل موجود ہے تو صریح غلط اور خلاف واقع ہے بلکہ اس سے خاص امور مراد لئے جائیں گے جیسا کہ بلقیس کے بارے میں فرمایا وَاُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ اگر یہاں کل شی سے مراد عام لیا جائے تو حضرت سلیمان علیہ السلام و دیگر سلاطین کا ملک بھی اس میں داخل ہو گا حالانکہ یہ صریح غلط ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بعض امور شرعیہ کا بیان قرآن میں اور بعض کا حدیث میں ہے اور دونوں حق تعالےٰ کی طرف سے ہیں۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔

چکڑالوی صاحب نے بیان کیا کہ حدیث کی صحت و ضعف کا مدار راویوں کے حسن و قبح پر ہونا غیر ممکن ہے کیونکہ رسول اللہؐ کے بارے میں ارشاد ہوا وَمِنْ اَھْلِ الْمَدِیْنَةِ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُھُمْ نَحْنُ نَعْلَمُھُمْ[1] جب رسول برحق کو لوگوں کا حال نہیں معلوم ہو سکتا تو اور کس کو ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں گذارش ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آیۂ مذکورہ کے نزول کے بعد منافقوں کا حال بخوبی ظاہر فرما دیا۔ چنانچہ اسی آیت میں ظاہر کیا گیا سَنُعَذِّبُھُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰی عَذَابٍ عَظِیْمٍ[2] چنانچہ منافقوں کا اوّل دُنیا میں مُبتلائے عذاب ہونا اور قعر ذلت میں گرنا اس امر کے لئے پوری دلیل ہے۔ شہادت کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَھَادَةُ بَیْنِکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّةِ

[1] اور خود مدینہ کے رہنے والوں میں ایسے منافق ہیں جو نفاق میں منجھ گئے ہیں۔ (التوبۃ: ۱۰۱)

[2] اُنہیں ہم (دُنیا میں) دُہری سزا دیں گے، پھر (آخرت میں) وہ بڑے بھاری عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

اثنان ذوا عدل منکم ؎۱ ۔ جس طرح شہادت کے لئے عدل وصدق معلوم ہو سکتا ہے اسی طرح روایت میں ہو سکتا ہے اور فرمایا ۔ یاایھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا اس سے معلوم ہوا کہ راوی ومخبر کے لئے عدالت کا ہونا شرط اور عدالت کے سبب سے فی الفور قابل قبول ہے ۔ اور بیعت کے بارے میں فرمایا فان علمتموھن مؤمنات فلا ترجعوھن الی الکفار ؎۲ یہ امر ظاہر ہے کہ دوسرے شخص کے ایمان کا علم علامات سے ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح روایت کے لئے بھی ہو سکتا ہے ۔

عبداللہ چکڑالوی کا رسالہ

اشاعۃ القرآن (۱)

اشاعۃ القرآن صفحہ ۱۲ میں لکھا ہے کہ سفر میں بحالت امن قصر نماز جائز نہیں بلکہ بحالت خوف جائز ہے کیونکہ قرآن میں یہی حکم مذکور ہے کہ اگر تم کو سفر میں خوف ہو تو نماز قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں ۔" اس کی نسبت ضیاء السنہ نمبر ۳ میں کسی قدر لکھا گیا ہے ۔ اب پھر لکھا جاتا ہے کہ چکڑالوی نے آیۂ قرآنی کا مطلب نہیں سمجھا اور جبکہ وہ حدیث نبوی سے جو کہ قرآن کی اصلی اور سچی تفسیر ہے اعراض کرتا ہے تو قرآن کا اصلی مضمون کیونکر سمجھ سکتا ہے ؎

تہیدستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل

؎۱ اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو (اور وہ وصیت کرنی چاہیے) تو وصیت کے وقت تم میں سے (گواہی کے لئے) دو معتبر آدمیوں کی (گواہی چاہیئے)

؎۲ پھر اگر (تحقیق کے بعد) تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ واقعی مومن ہیں تو اُن کو کفار کی طرف واپس نہ کرو ۔ (الممتحنہ : ۱۰)

اب یہاں پر آیۂ قرآنی کا صحیح مضمون بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن میں مذکور ہے وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (۱) یہ جملہ یہاں تک تمام ہوا اِذَا ضَرَبْتُمْ ظرف متضمن معنی شرط فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جواب شرط ہے۔ اس کے لئے دوسری شرط اور قید کی ضرورت نہیں۔ بعد اس کے ارشاد فرمایا۔ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ یہ جملہ علیحدہ ہے اُس کو جملہ اِذَا ضَرَبْتُمْ سے تعلق نہیں بلکہ جملہ آئندہ یعنی وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ الخ سے تعلق ہے۔ پس آیۂ کریمہ کا مضمون یہ ہوا کہ اگر مسلمانوں کو حالت سفر میں دشمنوں کافروں کی ایذا رسانی اور فتنہ اندازی کا خوف و اندیشہ ہو اور ایسی حالت میں امام کے ساتھ نماز قائم کی جائے تو اس طرح پر ادا کرنی چاہیئے کہ ایک گروہ امام کے ہمراہ نماز پڑھے اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابل کھڑا ہو جب ایک رکعت ختم ہو تو دشمن کا مقابل گروہ امام کے ساتھ شامل ہو اور ساتھ والا دشمن کے مقابلہ پر جاوے۔ اور جب سفر میں کسی طرح کا خوف نہیں بلکہ امن و امان ہے تو اُسکے لئے آیۂ کریمہ وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ الخ میں حکم فرمایا یعنی جب تم سفر کرو تو ایسی حالت میں قصر نماز کرنا گناہ کی بات نہیں۔ اب رہی یہ بات کہ قصر کس طرح پر کرنا چاہیئے، سو اس کی کیفیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی۔ نیز خیال کرنا چاہیئے کہ قرآن میں قصر نماز کا حکم وارد ہے۔ قصر کے معنے گھٹانا کم کرنا ہے گھٹانے کی کئی صورتیں ہیں نصف حصہ کم کرنا یا ثلث و ربع وغیرہ۔ لیکن نصف حصہ کے گھٹانے میں قصر کے پورے معنے پائے جاتے ہیں ثلث و ربع کے کم کرنے میں یہ بات نہیں پس قصر کے لفظ کو اس موقعہ پر نصف حصہ کے گھٹانے پر محمول کرنا نہایت مناسب اور متبادر الی الفہم ہے کیونکہ اس حالت میں دونوں جانب برابر ہوں گے یعنی جس قدر مقصور اُسی قدر مقصور منہ۔ جب سفر میں بحالت امن نماز کے نصف حصہ کا کم کرنا مشروع ہوا تو سمجھنا چاہیئے کہ ظہر و عصر اور عشاء کی نمازوں کے نصف حصہ گھٹانے میں پورا حساب و انداز قائم رہتا ہے اور مغرب کی چونکہ تین رکعتیں ہیں اس لئے اس کی تنصیف دشوار ہے۔ اور صبح کی کل دو رکعتیں ہیں، اس لئے اس کی تنصیف بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ پہلے ہی سے قصر کی ہوئی نماز کے برابر ہے۔ چکڑالوی کا استدلال اس قسم کا ہے جیسے کسی نے کہا تھا کہ سود لینا دُگنی تگنی مقدار تک ناجائز ہے تھوڑی مقدار لینے میں کوئی ہرج نہیں اس لئے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا

---

(۱) النساء: ۱۰۱-۱۰۲

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۲) پس جس طرح اس آیت میں لفظ اَضْعَافًا کو دیکھ کر یہ خیال کرنا کہ سود کی صرف زیادہ مقدار حرام ہے تھوڑی مقدار نہیں غلط اور لغو ہے اسی طرح قصر نماز کے بارہ میں لفظ اِنْ خِفْتُمْ دیکھ کر خیال کرنا کہ قصر نماز صرف خوف کی حالت میں ہے امن کی حالت میں نہیں سراسر لغو ہے حق تعالےٰ چکڑالوی کو بصارت عطا فرمادے۔

چکڑالوی صاحب نے شفاعت کی نسبت بہت کچھ تحریف اور غلط بیانی اختیار کی ہے۔ چنانچہ رسالہ کے صفحہ ۸ و ۹ میں لکھا ہے کہ شفاعت کے معنے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملانے کے ہیں سفارش کرنا مراد نہیں اور کتاب لغت سے نقل کیا ہے شَفَعْتُ الشَّيْءَ شَفْعًا۔ اور شفیع سے مراد شاہد ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چکڑالوی کو یہ خبر نہیں کہ شفاعت جو معنے سفارش کے ہے وہ بواسطہ لام کے متعدّی ہوتا ہے جیسا کہ حق تعالےٰ نے فرمایا۔ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (۱) اس آیت سے شفاعت وسفارش کا پورا ثبوت پایا جاتا ہے اور شفاعت جو معنے ملانے کے ہے وہ بلا واسطہ متعدّی ہوتا ہے جیسا کہ خود چکڑالوی نے مصباح المنیر سے نقل کیا ہے۔ شَفَعْتُ الشَّيْءَ شَفْعًا۔

ازانجملہ ایک امر یہ ہے کہ اشاعۃ السنہ نمبر ۷ جلد ۱۹ صفحہ ۲۱۱ میں چکڑالوی کا عقیدہ بیان کیا گیا کہ اُس کے نزدیک شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پانچ نمازیں فرض ہوئی تھیں آپ نے غلطی سے اُن کو پچاس سمجھ لیا اور حضرت موسیٰؑ کے کہنے سے بار بار جناب باری میں حاضر ہو کر تخفیف کا سوال کیا۔ اس غلطی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حق تعالےٰ کو بھی شامل کیا گیا اس کا بھی جواب ندارد اور نہ اس عقیدہ فاسدہ سے اپنی برأت ظاہر کی معلوم ہوا کہ امر مذکور تسلیم کیا گیا اب اس کی نسبت یہ سوال ہے کہ شب معراج میں پانچ نمازوں کا فرض ہونا اور غلطی سے پچاس سمجھنا اور حضرت موسیٰؑ کے مشورہ سے بار بار تخفیف کا سوال کرنا قرآن مجید کی کس آیت میں مذکور ہے اور اگر قرآن میں نہیں تو حدیث کو کس لئے صحیح تسلیم کیا گیا۔ اور تعجب یہ ہے کہ اشاعۃ القرآن کے صفحہ ۲۸ میں اس سوال کا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی کس آیت کے حکم سے اپنا تمام مال وقف وصدقہ کیا تھا یہ جواب لکھا ہے کہ آیہ کریمہ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ (۲) الخ میں تمام مال وقف کرنے کی ترغیب دی گئی

---

(۱) الانبیاء : ۲۸ (۲) البقرۃ : ۲۶۵

ہے کہ لفظ وَ تَثْبِیتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (یعنی دل کے پورے ثبات و اطمینان کے ساتھ) اس پر دلالت کرتا ہے - تعجب کی وجہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں حق تعالے نے حسب زعم چکڑالوی تمام مال صدقہ کرنے کی ترغیب فرمائی اور سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ الخ یعنی دیکھو نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ دو اور نہ اُسے بالکل ہی کھول دو - (آیت ۲۹ بنی اسرائیل) اور سورہ فرقان میں اہل ایمان کی علامات کے متعلق فرمایا : وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا الخ اور رحمان کے بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو حد سے نہیں بڑھتے اور نہ کنجوسی سے کام لیتے ہیں - (سورہ فرقان رکوع آخر آیت ۶۷) یہاں پر حق تعالے نے جس طرح بخل وخست سے منع فرمایا اسی طرح تمام مال وقف کرنے سے بھی تاکید کے ساتھ روکا - اور تَثْبِيتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کو تمام مال وقف کرنے کی دلیل قرار دینا عجیب وغریب ہے کیونکہ لفظ مذکور کا مضمون یہ ہے کہ صدقہ کرتے وقت دل میں پختہ طور پر یہ امر ثابت ہو کہ حق تعالے صدقہ کا اجر و ثواب ضرور عطا کرے گا اس سے پہلے فرمایا ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ یعنی صدقہ سے یہ نیت و عقیدہ ہو کہ حق تعالے راضی ہوگا اور اپنے غضب و عذاب سے بچائے گا - اگر تسلیم کیا جائے کہ تثبیت سے وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو کہ چکڑالوی نے بیان کئے تو یہ صرف ایک احتمال ہے اور جو ہم نے بیان کیا وہ بھی احتمال ہے إِذَا جَاءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ اور صفحہ ۲۴ میں لکھا ہے - لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ میں الف ولام عوض مضاف الیہ اور مضاف الیہ سے مراد جنس یعنی مثل اور ہم مشرب ہے اور الذَّكَرِ وَالْاُنْثٰى میں مضاف الیہ لفظ کُم ہے جس پر يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ دلالت کرتا ہے مراد اس سے ہم مذہب و مشرب ہے اور مباحثہ مطبوعہ کے صفحہ ۱۰ - آپ کی تقریر سوال نمبر ۴ کے جواب میں اس طرح مذکور ہے کہ قرآن مجید میں عام حکم ہے خواہ رسول ہو یا غیر رسول وراثت کے مسئلہ میں بھی رب العالمین نے کوئی فرق نہیں فرمایا کیونکہ کُم میں مخاطب جملہ مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ہو چکے ہیں عموماً وخصوصاً الخ اور یہاں لکھا ہے کہ لفظ کُم سے ہم مشرب ومسلمان ہونا پایا جاتا ہے سچ ہے کہ دروغ گورا حافظہ نباشد - ضیاء السنہ نمبر ۳ میں اعتراض کیا گیا تھا کہ آیات قرآنی مثلاً وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا وغیرہ میں رسول ونبی کو کفار کا بھائی

قرار دیا گیا ہے اور آیہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام افراد انسان کے مثل کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کافر ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمان کا بھائی یا بیٹا وغیرہ نہ ہو سکے اور جب بھائی بیٹا وغیرہ ہوا تو میراث پانے کا بھی خیال پیدا ہو سکتا ہے اور حضرت نوحؑ کے فرزند کی نسبت جو حق تعالےٰ نے فرمایا کہ وہ اہل میں سے نہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ میراث پانے کا بھی مستحق نہیں اس لئے کہ فرزند ہونے سے خارج نہیں کیا بلکہ بدعملی کے سبب سے اہل ہونے سے جدا قرار دیا اور میراث کا پانا بیٹا وغیرہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو یہودی و نصرانی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت دی گئی جیسا کہ سورۂ مائدہ میں مذکور ہے اور میراث کے بارہ میں فرمایا وَلَکُمْ نِصْفُ مَا تَرَکَ اَزْوَاجُکُمْ[1] اور وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکْتُمْ[2] اس میں پورا خیال ہو سکتا ہے کہ اَزْوَاجُکُمْ میں یہودیہ، نصرانیہ کافرہ مسلمہ سب شامل ہیں اور جس کے ماں باپ مشرک و کافر ہوں اُس کو فرمایا وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوفًا[3] جب دنیاوی امور میں اُن کو فائدہ پہنچانا اور مال و دولت سے مدد کرنا مشروع ہوا تو اس سے خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ مشرک و کافر ماں باپ مسلمان اولاد کے ترکہ سے حصہ پانے کے مستحق ہیں آخر بغیر حدیث نبوی کے چارہ نہیں۔ صفحہ ۲۱ میں لکھا ہے کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی دو دو بہنوں کی طرح ذوی القربیٰ ہیں لیکن بی بی کی چچازاد یا خالہ زاد بہن اس طرح ذوالقربیٰ نہیں وغیرہ یہ بھی مغالطہ ہے کیونکہ پھوپھی بھتیجی وغیرہ کا دو بہنوں کی طرح ذوی القربیٰ ہونا اور چچازاد وغیرہ بہن کا نہ ہونا بداہت کے مخالف ہے دونوں کی قرابت ایک دوسرے کے مثل ہے۔ حق تعالےٰ سورۂ احزاب میں فرماتا ہے وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ[4]۔ ایسے ہی دو خالہ اور دو پھوپھیوں کی دو بیٹیاں بھی خالہ بھانجی کی طرح ذوی القربیٰ ہیں لیکن دونوں کا جمع کرنا حرام نہیں ضیاء السنۃ میں یہ بات لکھی گئی تھی لیکن

---

[1] الکھف: ۱۱۰ [1] اور جو (ترکہ) تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں تو ان کے ترکے میں تمہارا آدھا

[2] اور جو ترکہ تم چھوڑ جاؤ تو تمہارے ترکے میں سے بیویوں کا حصہ چوتھائی۔

[3] اور دُنیا میں اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔

[4] مگر کتاب اللہ کی رُو سے رشتے دار مومنوں اور مہاجروں سے بڑھ کر ایک دوسرے کے حقدار ہیں۔

جواب ندارد۔ صفحہ ۳ ا میں لکھا ہے کہ قرآن میں بحالت سفر نماز قصر کرنے کا حکم خوف کے وقت کیا گیا ہے بغیر خوف کے نہیں کیا گیا اس لئے کہ اِنْ خِفْتُمْ شرط موجود ہے اس کی نسبت گذارش ہے کہ سورۂ نور میں حق تعالےٰ نے فرمایا وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا[1] کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر لونڈیاں پاکدامنی کا ارادہ نکریں تو اُن کو فعل بد کے لئے آمادہ کرنا مناسب ہے، اگر قصر کے لئے شرط کا لحاظ کیا گیا تو یہاں بھی شرط موجود ہے۔ فَمَا هُوَ جَوَابُكُمْ فَهُوَ جَوَابُنَا۔ قصر کے متعلق یہ سوال ہے کہ چار رکعت کا دو رکعت قرار دینا اور مغرب وصبح کی نماز میں قصر نہ کرنا قرآن میں کہاں مذکور ہے علاوہ برآں قرآن میں مذکور ہے۔ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ[2] الخ ایک طائفہ کا امام کے خلف اور دوسرے کا دشمن کے مقابل ہونا اور پھر دوسرے طائفہ کا امام کے ساتھ شامل ہونا اس میں ہر طائفہ امام کے ساتھ کس قدر نماز ادا کرے قرآن سے جواب ارشاد ہو صفحہ ۱۱ میں لکھا ہے کہ عرش سے مراد اللہ کی صفت یعنی عزّت و حکومت مراد ہے الخ اس کی نسبت گذارش ہے کہ سورۂ ہود میں اللہ فرماتا ہے وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ[3] تو کیا پروردگار کی عزّت وحکومت پانی پر تیرتی پھرتی تھی اور ثُمَّ اسْتَوٰى[4] عَلَى الْعَرْشِ سے کیا مراد ہے؟ کیا اللہ تعالےٰ آسمان زمین پیدا کرنے کے بعد اپنی حکومت پر قائم ہوا۔ نماز وزکوٰۃ کی نسبت آپ اعلان کرتے ہیں کہ دوسری کتاب میں جواب دیا گیا ہے ہم کو بھی اُس کا انتظار ہے یار باقی صحبت باقی۔ آپ کی تفسیر بھی ہماری نظر سے نہیں گذری ورنہ اُس پر بھی ریویو لکھا جاتا۔ ناسخ منسوخ کی نسبت بالفعل اس قدر گذارش ہے کہ اگر آیت قرآنی کے منسوخ ہونے سے اللہ تعالےٰ کے حکم میں تغیر وتبدل لازم آتا ہے اور آیت مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ[5]

---

[1] اور اپنی لونڈیوں باندیوں پر زنا کرنے کے لئے زبردستی مت کرو اگر وہ زنا سے بچنے کا قصد کریں۔

[2] اور (اے محمدؐ) جب تو بیچ اُن کے ہو پس قائم کرو واسطے اُن کے نماز کو پس چاہیئے کہ ایک جماعت اُن میں سے تیرے ساتھ نماز کے لئے اُٹھ کھڑی ہو ۱۲

[3] اور تھا عرش اُس کا (اللہ تعالےٰ کا) اوپر پانی کے ۱۲

[4] پھر قائم ہوا (اللہ تعالےٰ) عرش پر ۱۲

[5] نہیں بدلی جاتی بات نزدیک میرے ۱۲

اُس کے مخالف ہے تو پھر اللہ تعالےٰ کے ارادہ و تصرف میں بھی یہی شبہ پیدا ہوگا حق تعالیٰ نے ایک شخص کی نسبت ارادہ کیا کہ اُس کو غنی کیا جاوے وہ غنی ہوا اور چند روز کے بعد فقیر ہو گیا پھر کچھ عرصہ کے بعد غنی ہو گیا ایسے ہی بیمار و تندرست کی کیفیت ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اس قسم کا تغیر و تبدل صحیح و مناسب قرار دیا جائے اور آیت کا منسوخ ہونا نامناسب کہا جائے علاوہ بریں ناسخ منسوخ کی ایسی کیفیت ہے جیسے طبیب حاذق کو مریض کے لئے کمی بیشی کے لحاظ سے نسخہ اور دوا کا تبدیل کرنا اس میں کوئی خرابی نہیں بلکہ کمال حکمت و مصلحت ہے اور آیۂ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ[1] سے یہ مقصود ہے کہ مخلوق میں سے کسی کی مجال نہیں کہ حکم الٰہی میں تغیر و تبدل کرے لیکن حق تعالےٰ جو چاہے سو کرے يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ[2]۔ حدیث کے راویوں کی نسبت آپ نے آیہ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ[3] پیش کی تھی اور اس سے راویوں کا مشکوک و مشتبہ ہونا ثابت کیا تھا اس کا جواب باصواب ضیاء السنہ نمبر۲ میں دیا گیا اُس کے بعد اشاعۃ السنہ میں بھی معقول جواب دیا گیا لیکن اُس کا جواب ندارد۔ جن باتوں کی نسبت آپ نے لکھا ہے کہ ہم پر افترا کیا گیا ہے تعجب ہے کہ پھر خود تشریح کے ساتھ اپنا انکار بیان کیا ہے جیسا کہ مسئلہ شفاعت وغیرہ اس کا مفصل بیان آئندہ کیا جاوے گا انشاءاللہ تعالےٰ مُردہ کو صدقہ وغیرہ کا ثواب پہنچنے کے بارہ میں آپ لکھتے ہیں کہ آیت کریمہ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى[4] سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی مردہ و زندہ کو دوسرے کے عمل کا ثواب نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی نسبت سوال ہے کہ مردہ یا زندہ کے لئے دوسرے کی دُعا و استغفار کے سبب سے کچھ ثواب اور نفع حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر ہوتا ہے تو آپ کا دعویٰ غلط ہوا اور اگر نہیں ہوتا تو قرآن کے خلاف ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ[5] اور فرمایا اَلَّذِيْنَ[6]

---

[1] نہیں کوئی بدلنے والا واسطے کلموں اُس کے یعنے اللہ پاک کے کلمات کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ (الانعام: ۱۱۶)

[2] مٹا دیتا ہے اللہ تعالےٰ جس کو چاہتا ہے اور ثابت رکھتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ (الرعد: ۳۹)

[3] اور بعض مدینہ والوں سے سرکش ہوگئے اوپر نفاق کے۔ (التوبۃ: ۱۰۱)

[4] اور تحقیق نہیں ہے واسطے انسان کے مگر جو کوشش کی اُس نے۔ (النجم: ۳۹)

[5] اور واسطے رسول، بخشش مانگ واسطے گناہ اپنے کے اور واسطے ایمان والوں اور ایمان والیوں کے

[6] وہ لوگ کہ اُٹھاتے ہیں عرش کو اور جو اُس کے گرد اگرد ہیں پاکی بیان کرتے ہیں ساتھ تعریف رب اپنے کے اور ایمان لاتے ہیں اس پر اور بخشش مانگتے ہیں ایمان والوں کے واسطے (المؤمن: ۷)

يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ جب دُعا و استغفار کا مردہ کے لئے نافع و مفید ہونا ثابت ہوا تو اگر کسی نے صدقہ خیرات کیا اور جناب باری میں دعا کی کہ اس ثواب فلاں شخص کو پہنچا دے تو اس میں کیا خرابی ہے اور یہ امر کیوں کر ضائع ہو سکتا ہے۔

عبداللہ چکڑالوی کا رسالہ اشاعت القرآن (۲)

چکڑالوی صاحب نے صفحہ ۳۷ سے ۴۰ تک زور شور سے بیان کیا کہ تمام قرآن میں ایک حرف بھی ایسا نہ ملے گا جس سے یہ بات ثابت ہو کہ رسول کریم پر دو طرح کی وحی آتی تھی پھر صفحہ ۶۴ میں آیہ کریمہ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاۤئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا الخ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ حق تعالیٰ تین طرح پر مخلوق کو اپنے احکام پہنچاتا ہے اول بذریعہ جبرئیل دوم حجاب کے پیچھے سے بلا واسطہ جبرئیل، اس طریقہ سے ایک گروہ انبیاء کو احکام دیئے گئے۔ سوم عوام مخلوق کو اُن کے ہم جنس رسولوں کی معرفت احکام سنائے گئے۔

اس میں بچند وجوہ کلام ہے، اوّل یہ کہ اقسام ثلٰثہ میں سے پہلی قسم یعنی وحی کو بواسطہ جبرئیل سے کیوں خاص کیا گیا اور اس پر کیا دلیل ہے کہ یہاں پر وحی سے مراد واسطہ جبرئیل ہے جبکہ قرآن مجید میں وحی الہام والقاء قلبی کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ آیہ مذکورہ میں وحی معنی الہام والقاء نہیں قرار دیا جاتا اللہ فرماتا ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ۔ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ اس موقعہ پر وحی کے معنی الہام والقاء کے سوا اور کچھ نہیں اور چکڑالوی صاحب بھی لکھ چکے ہیں کہ انبیاء کے سوا دیگر مخلوق کو رسولوں کی معرفت احکام سنائے جاتے ہیں یعنی بواسطہ جبرئیل یا حجاب میں نہیں بتائے جاتے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو کسی رسول نے نہیں بتایا اور نہ اُس وقت کوئی رسول موجود

---

[۱] کسی بشر کا یہ منصب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے مگر بطور وحی کے یا پیچھے پردہ کے یا بھیجے فرشتہ (الشوریٰ: ۵۱) [۲] اور وحی کی تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف (النحل: ۶۸)

[۳] ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ تم اس کو دودھ پلاؤ۔ (القصص: ۷)

تھا۔ اور انبیاء کا خواب بھی بجائے وحی کے ہوتا ہے قَالَ اللّٰهُ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ الخ اور ابراہیم علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ إِنِّيْ أَرٰى فِي الْمَنَامِ الخ ونیز آیہ کریمہ فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا بھی الہام و القاء کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے۔ دوم تیسری قسم جو کہ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا سے معلوم ہوتی ہے اُس کے یہ معنی قرار دینا کہ مخلوق کو رسول کی معرفت احکام سنائے گئے اس پر کیا دلیل ہے کیوں جائز نہیں کہ یہاں پر رسول سے فرشتہ وحی لانیوالا مراد لیا جائے سورۂ شمس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِيْنٍ یہ امر ظاہر ہے کہ اس آیت میں رسول سے مراد حضرت جبرئیل ہیں اس کے آگے فرماتا ہے وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِيْنِ یعنی آنحضرت محمدؐ نے اُس رسول کریم یعنی جبرئیل کو اصلی صورت میں خاص موقعہ پر دیکھا ہے نیز آیہ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ میں رسول کی صفت وکیفیت اس طرح بیان فرمائی فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ یعنی وہ رسول حکم الٰہی سے وحی کرتا ہے حالانکہ وحی کرنے والا فی الحقیقت پروردگار ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ میں فرمایا قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ یعنی کہدو کہ جو شخص جبرئیل کا دشمن ہے تو اُس کو آگاہ ہونا چاہیئے کہ جبرئیلؑ نے قرآن کو محمدؐ کے دل پر اللہ کے حکم سے اُتارا ہے اور فرمایا عَلَّمَهُ شَدِيْدُ الْقُوٰى الخ چونکہ حضرت جبرئیلؑ اولاً اور بلا واسطہ جناب باری سے وحی کو معلوم کرتے ہیں اور پھر رسول کے پاس پہنچاتے ہیں اس لئے ان کی نسبت ارشاد فرمایا کہ ہمارے حکم سے جبرئیل قرآن کو محمدؐ کے دل پر نازل کرتے ہیں اور رسول کی جانب وحی کو پہنچاتے ہیں آنحضرتؐ کی نسبت جابجا قرآن میں مذکور ہے کہ وہ وحی کی پیروی کرنے والے اور اُسی سے ڈرانے والے اور اُس کو پہنچانے والے ہیں جیسا کہ فرمایا قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوْحٰى

ملہ بے شک اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا۔ (الفتح : ۲۷)

سلہ پھر جب وہ لڑکا ابراہیمؑ کے ساتھ دوڑ دھوپ کی عمر کو پہنچ گیا تو ابراہیم نے اس سے کہا کہ بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں۔ (الصّٰفّٰت : ۱۰۲)

سلہ پھر اس کی بدکرداری اور اس کی پرہیزگاری، دونوں کی اس کو سمجھ دی۔ (الشمس : ۸)

ملہ فی الواقع یہ قرآن ایک معزز قاصد کا پہنچایا ہوا کلام ہے جو بڑی قوت والا ہے اور مالک عرش بریں کے ہاں اس کا بڑا درجہ ہے۔ وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے۔ اور وہ امانت دار بھی ہے

اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ - قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُکُمْ بِالْوَحْیِ وغیرہا جس طرح حضرت جبرئیل کی نسبت فرمایا
کہ وہ وحی کرنے والے اور دل پر قرآن کو اُتارنے والے ہیں اس طرح پر آنحضرت ؐ کی نسبت
نہیں فرمایا بلکہ اُن کو وحی کی پیروی کرنے والا اور ڈرانے والا قرار دیا ہر چند کہ یہ قرینہ بہت
بڑا نہیں لیکن تاہم دلالت کرتا ہے کہ آیہ کریمہ میں رسول سے مراد جبرئیل ہیں پیغمبر مقصود نہیں۔
البتہ شیطان کی نسبت اللہ تعالےٰ نے فرمایا وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِھِمْ -
یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ پس حکم پہنچانے کی تین صورتیں اس طرح پر قائم ہوئیں کہ اوّل
الہام والقاء خواہ بیداری میں ہو یا خواب کی حالت میں دوم حجاب کے پیچھے سوم بواسطہ جبرئیل
جب معلوم ہوا کہ آنحضرت ؐ پر دو طرح کی وحی نازل ہوتی تھی ایک بواسطہ جبرئیل یعنی وحی جلی،
دوم الہام والقاء یعنی وحی خفی تو چکڑالوی صاحب بتائیں کہ دونوں حالتوں میں صرف قرآن مجید
نازل ہوتا تھا یا اُس کے سوا اور کچھ بھی ہوتا تھا اگر دونوں حالتوں میں صرف قرآن نازل ہوتا
تھا تو دونوں صورتوں میں کچھ فرق پایا جاتا تھا یا نہیں؟ اگر کوئی فرق نہ ہوتا تھا تو کیا وجہ کہ ایک
آیت وحی خفی طور پر اور دوسری وحی جلی کے طور پر نازل ہوئی - اور جلی وخفی دونوں کی حالت
یکساں رہی اور اگر قرآن کے سوا اور کچھ بھی نازل ہوتا تھا تو اُسی کا نام حدیث ہے - صفحہ ۴۵
سے ۹۴ تک بیان ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حکم مجمل اور تفصیل کا محتاج نہیں - اس کی نسبت
پہلے سوالات کئے گئے ہیں اب تک جواب نہیں ملا اب پھر لکھا جاتا ہے کہ نماز کے لئے استقبال
قبلہ کا ہونا ضروری ہے یا نہیں اگر ضروری ہے تو قرآن مجید میں کس مقام پر مذکور ہے کہ قبلہ رُخ
ہو کر نماز ادا کرنی چاہیے اللہ تعالےٰ نے قبلہ کے بارہ میں اس طرح فرمایا ہے فَلَنُوَلِّیَنَّکَ
قِبْلَۃً تَرْضٰھَا فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ[1] اس آیت میں یہ مذکور نہیں کہ نماز میں قبلہ
رُخ ہونا چاہیے اور فرمایا وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ[2] ؕ
اس میں بھی عام طور پر حکم فرمایا نماز کے لئے مخصوص نہیں کیا پس حسب طریقہ چکڑالوی صاحب
ان آیتوں سے یہ استدلال ہو سکتا ہے کہ ہر عمل وفعل کے لئے ضروری ہے کہ قبلہ کی طرف
رُخ کیا جاوے خواہ وعظ کہنا ہو یا قرآن کی تلاوت کرنا کھانا پینا وغیرہ اور اگر نماز میں استقبال
قبلہ ضروری نہیں تو قرآن میں استقبال قبلہ کا حکم کس موقعہ کیلئے دیا گیا ہے خاص نماز کیلئے یا نماز وغیرہ ،
سب کو شامل ہے اور یہ بھی قرآن سے بتایا جاتے کہ آیہ کریمہ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ میں
کس حالت اور کس موقعہ کے لئے حکم دیا گیا ہے اور اسی طرح نماز جنازہ کی کیفیت بیان کرنی چاہیے۔

---

[1] سو ہم ضرور تم کو اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے تم چاہتے ہو - تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف
کر لیا کرو [2] اور تم کہیں سے بھی نکلو تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیا کرو

مولوی عبداللہ چکڑالوی کی

غلط تاویلات

عبداللہ چکڑالوی بھی قادیانی سے کم نہیں، یعنی دعویٰ اس قدر پُر زور کہ تمام مسائل جزئیات متعلق عبادت و معاملات قرآن مجید سے بخوبی ثابت ہیں اس لئے حدیث کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ تمام کُتبِ حدیث لغو و فضول ہیں مگر جب لگاتار سوالات کیئے گئے کہ فلاں مسئلہ کن آیات سے اور فلاں کس عبارت سے ثابت ہوتا ہے تو جواب میں حیلہ و ملمع سازی اور پہلو تہی ٹال مٹول۔ چنانچہ جب یہ سوال کیا گیا کہ پنجگانہ نماز کی رکعات وغیرہ کی مقدار قرآن میں کہاں مذکور ہے تو اس کے جواب میں بہت سے مضمون اور رسالے لکھ ڈالے لیکن اصل بات سے صاف گریز اور سوال پر سوال۔

پہلے آپ نے اشاعۃ القرآن میں لکھا تھا کہ قرآن مجید کو صحابہؓ نے مرتب و مجتمع نہیں فرمایا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد نبوت میں بخوبی مجتمع ہو چکا تھا اور جس ترتیب و ہیئت کے ساتھ قرآن پاک موجود اور دُنیا میں رونق افروز ہے اُسی طور پر حق تعالےٰ نے نازل فرمایا حالانکہ کلام کا یہ ہوا کہ اوّل سورۃ فاتحہ نازل کی گئی پھر سورۂ بقرہ پھر آل عمران و نسأ وغیرہ۔ آخر قرآن تک اس پر خاکسار راقم الحروف نے بذریعہ شحنۂ ہند و اخبار اہلحدیث امرتسر عرض کیا کہ حق تعالےٰ نے سورۃ مائدہ میں جو پارہ ششم میں مذکور ہے فرمایا: اَلۡیَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِیۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡكُمۡ نِعۡمَتِیۡ یعنی آج کے روز میں نے تمہارے واسطے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت پوری کی۔ چکڑالوی صاحب نے نعمت سے مراد قرآن مجید قرار دیا اور اس آیت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا یعنی جب دین کامل۔ اور قرآن پورا ہو گیا تو دوسری کتاب حدیث وغیرہ کی کیا ضرورت ہے جب سورۂ مائدہ تک قرآن پورا اور دین کامل طور پر بیان کیا گیا تو باقی آیتوں اور سورتوں کی کیا ضرورت باقی رہی۔ اس کا جواب چکڑالوی صاحب سے اب تک کچھ بن نہیں پڑا جس وجہ سے وہ حدیث کو لغو و فضول قرار دیتے ہیں اسی وجہ سے قرآن مجید کے چوبیس ۲۴ پارے بھی اُن کے خیال فاسد کے رُو سے لغو ہوتے ہیں نعوذ باللہ۔

کیونکہ جب سورہ مائدہ یعنی چھ پاروں تک بموجب آیہ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ احکام دین پورے بیان ہو چکے تو پھر چوبیس ۲۴ پاروں کی کیا ضرورت رہی اسی طرح آیہ کریمہ تبیانًا لِکُلِّ شَیْءٍ۔ سُورہ نحل یعنی پندرہویں پارہ میں بیان کی گئی اس کے بعد پندرہ پارے لغو ہونے چاہئیں معاذاللہ جب پارہ ششم تک باوجود تکمیل احکام کے چوبیس ۲۴ سیپاروں کی ضرورت قائم رہی تو اسی طرح حدیث کی ضرورت کو بھی تسلیم کرنا چاہیئے تورِیت کے بارہ میں بھی حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اٰتَیْنَا مُوسَی الْکِتَابَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیْ اَحْسَنَ وَتَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ[۱]۔ جب توریت میں احکام دین تفصیل کیساتھ بیان کئے گئے تو اسکے بعد انجیل کے نازل کرنیکی کیا ضرورت تھی؟ جس طرح انجیل کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا اسی طرح قرآن کے بعد حدیث کی ضرورت کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ اسکا جواب بھی کچھ نہ ہو سکا۔

چکڑالوی صاحب نے لکھا ہے کہ نماز وغیرہ کی نسبت یہ کہنا کہ جب تک رسول علیہ السلام اپنے عمل سے کر نہ دکھائیں قرآن سے معلوم نہیں ہو سکتا خدا کو گونگا بنانا ہے یعنی خدا نماز کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کر سکا محض مغالطہ ہے اس لئے کہ احکام کے بیان و تفصیل اور قرآن کی تفسیر کا منصب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود باری تعالیٰ نے عطا فرمایا جیسا کہ ارشاد فرمایا وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ[۲]۔ ترجمہ: اے محمد ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل کیا کہ تم لوگوں کے رُوبرو اُس کو واضح کر کے سناؤ دوسری جگہ فرمایا: اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ: یعنی قرآن کا تمہارے دل میں بھر دینا اور اُس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے پھر ایک آیت کے بعد فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ[۳] یعنی پڑھانے اور جمع کرنیکے بعد اُسکا بیان اور واضح کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ اس سے صاف طور پر پایا گیا کہ اول آنحضرت کو قرآن سنایا گیا، پھر اس کو واضح اور مفصل کیا گیا لفظ ثُمَّ اس پر دلالت کرتا ہے ورنہ سنانے کے بعد پھر بیان کرنے کے کچھ معنے نہ ہوں گے اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ حق تعالیٰ گونگا اور مجبور ہے اور احکام بیان نہیں کر سکتا معاذ اللہ۔ بادشاہ اپنی طرف سے وزیر وغیرہ کو اجرائے احکام و تنفیذ وغیرہ کے لئے مامور کرتا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خود بادشاہ گونگا اور مجبور ہے حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو انتظام خلق کے لئے اپنا خلیفہ مقرر فرمایا اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ خود خدا مجبور ہے اور گونگا ہے اور انتظام نہیں کر سکتا۔ معاذ اللہ

چکڑالوی نے آیہ کریمہ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْ اُمْنِیَّتِہٖ[۴] نقل کی اور اس کا ترجمہ اپنے مطلب و غرض فاسد کے موافق بیان

---

۱ الانعام ۱۵۵ ۲ النحل ۴۴ ۳ القیامۃ ۱۹ ۴ الحج ۵۲

کیا اور سخت دھوکا دیا چنانچہ اس کا **ترجمہ** یہ ہے کہ اے رسول تم سے پہلے ہم نے کوئی رسول و نبی ایسا نہیں بھیجا جس کی یہ حالت نہ ہوئی ہو کہ جب کبھی اُس نے دینی مسئلہ میں از روئے قیاس و فکر، آرزو کی شیطانی خیال نے اُس کے قیاس میں ضرور دخل دیا پس اللہ شیطانی خیال کے دخل کو ضرور منسوخ کرتا اور اپنی آیتوں کو مضبوط کرتا ہے۔" اس ترجمہ میں یہ مغالطہ دیا کہ تمنیٰ کے معنے اوّل آرزو کر کے پھر قیاس و فکر سے اُس کی تفسیر کی شاید قیاس و اجتہاد چکڑالوی کے نزدیک ایک شے ہو گی اس کی کیا دلیل ہے اور اگر تمنیٰ و آرزو ایک شے نہیں بلکہ تمنے چند معانی کو متحمل اور قیاس بھی منجملہ احتمالات کے ایک احتمال ہے تو آیت میں ایک احتمال کو کس قرینہ سے معین کیا گیا بلکہ تمنے میں دو احتمال ہیں ایک معنی قرأت دوم خطرۂ قلب مطلب یہ ہوا کہ جب رسول آیت کی قرأت کرتا ہے تو شیطان اُس میں دخل دیتا ہے لیکن حق تعالےٰ فی الفور دخل شیطانی کو دُور فرماتا ہے اور اس کے دخل کو ہرگز باقی نہیں رہنے دیتا یا جب رسول خیال کرتا ہے تو شیطان اُس میں دخل دیتا ہے تاکہ رسول کو سہو و ذہول ہو جاوے اور اس سبب سے فتنہ واقع ہو اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا دخل رسول کے کسی حال میں ہرگز قائم نہیں رہنے پاتا بلکہ بہت جلد نیست و نابود ہو جاتا ہے دوسری جگہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ[1] - یعنی میرے خاص بندوں پر شیطان غلبہ نہیں کر سکتا ظاہر ہے کہ خاص بندوں میں سے رسول اعلیٰ درجہ کے بندے ہیں پھر ان پر شیطان کس طرح غلبہ پا سکتا ہے - اور: إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا[2] یعنی متقی لوگوں کو جب وسوسہ شیطانی ہوتا ہے تو وہ فی الفور اللہ کو یاد کرتے ہیں اور سنبھل جاتے ہیں - معاذ اللہ دخل شیطان دُور نہ ہو تو اس سے دین کے احکام میں خلل و فتور واقع ہو گا اور - فرماتا ہے مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ[3] یعنی دین کی باتوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں بہکا اور نہ کوئی لغزش کھائی جب یہ بات ہے تو شیطان کا دخل کیونکر قائم رہ سکتا ہے چکڑالوی جن آیتوں سے اپنا مدّعا ثابت کرنا چاہتا ہے عیسائی لوگ بھی انہی آیتوں کو پیش کر کے مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں لیکن جس طرح اُن لوگوں نے حماقت کی اسی طرح چکڑالوی نے کی نعوذ باللہ -

آیہ مذکورہ میں حق تعالےٰ نے فرمایا کہ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ - یعنی حق تعالیٰ شیطانی دخل کو دُور کر کے اپنی آیتوں کو صاف اور محکم کرتا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آیات کتاب اللہ

[1] الحجر: ۴۲ [2] الاعراف: ۲۰۱ [3] النجم: ۲

میں شیطان جو دخل دیتا ہے حق تعالے اپنی آیتوں کو اُس سے محفوظ رکھتا ہے قیاس واجتہاد کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ اور آیت کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ رسول کی ہمیشہ یہ حالت تھی کہ جب وہ تمنا کرتے تو ہر بار شیطان اُس میں دخل دیتا تھا۔ کیونکہ رسول کی اُمت میں بہت سے بندے اس قسم کے ہوئے ہیں جن کے قول وعمل میں شیطان ہمیشہ دخل نہیں پا سکتا پھر رسول پر ہمیشہ کیونکر غلبہ پا سکتا ہے اس کے بعد چکڑالوی لکھتا ہے کہ رسول کو خدا قرآن سے نماز کیوں نہ سکھا سکا۔ معلوم نہیں یہ کس سوال کا جواب ہے۔ سوال تو یہ تھا۔ کہ نماز کے احکام وارکان کا بیان قرآن میں کہاں ہے اس کے جواب میں خدا کو الزام دیا جاتا ہے کہ تو نے قرآن سے نماز کیوں نہ سکھائی لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ اگر چکڑالوی صاف طور پر اقرار کرے کہ نماز کے احکام کا بیان قرآن میں نہیں بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے تو اسکی شان میں کوئی فرق نہ آوے سخت افسوس ہے کہ نہ ثبوت دیتا ہے نہ اقرار کرتا ہے مغالطے کے سوا کوئی بات نہیں کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا صرف قرآن سے نماز نہیں سکھا سکتا تھا اس لئے اُس نے قرآن میں نماز کے احکام بیان نہیں فرمائے یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ حق تعالے نے چاند اور سورج اس لئے پیدا کئے کہ بغیر اُن کے روشنی ہرگز نہ ہو سکتی اور خدا بھی بغیر اُن کی روشنی کئے روشنی کرنے سے مجبور تھا یا کراماً کاتبین اس لئے مقرر کئے گئے کہ بغیر ان کے خدا کو بندوں کے اعمال کا حال معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ نعوذ باللہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ حق تعالے نے توریت کے بعد زبور اور اُس کے بعد انجیل کیوں نازل فرمائی سب کے لئے ایک ہی کتاب کیوں نہ نازل فرمائی تو اس کا منشاء سوائے حماقت کے اور کیا کہا جاوے گا۔

چکڑالوی صاحب کے حواری کا سوال اور اُس کا جواب

اخبار شحنۂ ہند میرٹھ میں حواری مذکور کی طرف سے اُسی قسم کا سوال شائع ہوا ہے جس کا جواب ضیاء السنہ نیز شحنۂ ہند کے چند پرچوں میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ لوگ اپنی عادت کے موافق اصل بات سے گریز کرتے ہیں اور حیلہ وحوالہ اور رنگ آمیزی سے کام لیتے

ہیں اس لئے مناسب ہوا کہ جس طرح یہ حضرات بار بار ایک قسم کا سوال کرتے ہیں اسی طرح بار بار طرح طرح پر جواب دیا جائے اور اچھی طرح قلعی کھولی جائے۔ واضح ہو کہ سوال میں اوّل یہ لکھا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ تو یہ فرماتا ہے کہ قرآن مجید ہر طرح مفصّل ہے یعنی تمام ضروریات دین اسمیں موجود ہیں اور اخیار اہل حدیث کہتا ہے کہ قرآن مجمل بھی ہے اور مفصّل بھی اس کے یہ معنی ہوئے کہ قرآن ناقص بھی ہے اور کامل بھی اور وہ انسانوں کے کلام کا محتاج ہے حالانکہ قرآن اسکی تردید کرتا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ[1] اس کے جواب میں گزارش ہے کہ بلاشک قرآن مجید میں تمام ضروریات دین اس طرح پر موجود ہیں جس طرح دریا کوزہ کے اندر مثلاً حق تعالےٰ نے فرمایا: اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ[2] اس آیت میں لفظ صلوٰۃ ایسا ہے جیسے کوزہ اور تمام ارکان و متعلقات صلوٰۃ اُس میں اس طرح داخل ہیں جس طرح دریا کوزہ میں یہی کیفیت زکوٰۃ کی ہے حق تعالےٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی تفصیل و تشریح کا منصب عطا فرمایا اس لئے آپ نے اُس کو مفصّل و مشرح فرمایا اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا: اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا[3] اس میں بیع و ربا مجمل ہے۔ بیع کے معنی خرید و فروخت اور ربا کے معنی بڑھوتری کے ہیں یہ امر ظاہر ہے کہ نہ ہر قسم کی خرید و فروخت جائز نہ ہر قسم کی بڑھوتری ناجائز لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب ارشاد خداوندی اسکی تشریح فرمائی اور اللہ تعالےٰ نے فرمایا وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ[4] یعنی جہاں سے تم نکلو تو اپنا رُخ قبلہ کی جانب کرو۔ لیکن اس میں مفصل طور پر بیان نہیں کیا گیا کہ کس حالت میں قبلہ کی طرف رُخ کرنا چاہیئے آیا نماز کی حالت میں یا تمام عبادتوں کے وقت۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ قرآن ناقص بھی ہے اور کامل بھی۔ بلکہ یوں کہا جاتا ہے کہ قرآن میں بہت سے احکام مجمل طور پر مذکور ہیں اور بعض احکام مفصّل بھی ہیں۔ مجمل اور ناقص میں زمین و آسمان کا فرق ہے اگر قرآن میں بعض احکام بالکل بیان نہ کئے جاتے نہ اشارۃً نہ صراحۃً تو اس صورت میں قرآن کو ناقص

---

[1] آج کے دن پورا کر دیا میں نے واسطے تمہارے دین تمہارا ۱۲ (المائدہ: ۳)

[2] قائم کرو نماز کو اور دو زکوٰۃ ۱۲ (المزمل: ۵۶)

[3] اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا ۱۲ (البقرہ: ۲۷۵) [4] البقرہ: ۱۵۰)

قرار دیا جاتا لیکن قرآن مجید نقصان سے مبرّا و منزّہ ہے اس لئے کہ بعض احکام اُس میں اشارۃً بیان کئے گئے اور بعض صراحۃً اور اجمالاً و تفصیلاً - اور قرآن مجید ہرگز انسانوں کے کلام کا محتاج نہیں - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب حکم خداوندی قرآن مجید کی تشریح فرمائی - آیۂ کریمہ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ سے ہرگز اس کی تردید نہیں ہوسکتی اس لئے کہ دین کامل وہی ہے جو اللہ تعالےٰ نے بیان فرمایا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بموجب ارشاد خداوندی اُس کی تشریح فرمائی -

سائل صاحب لکھتے ہیں کہ اگر احادیث بھی مثل قرآن ہیں تو ان میں اختلاف کیوں ہے یعنی حنفی شافعی مالکی حنبلی شیعہ معتزلہ سب ایک دوسرے کے خلاف ہیں اور اپنے دعوؤں پر احادیث ہی پیش کرتے ہیں قرآن میں کچھ اختلاف نہیں - خدا تعالےٰ نے اُس کے حق ہونے کی یہ دلیل فرمائی لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا[1] - اس سے معلوم ہوا کہ جس کلام میں اختلاف ہو وہ مثل قرآن نہیں ہوسکتا -

جواب اس کا یہ ہے کہ بلاشک جس طرح آیات قرآنی واجب التعمیل ہیں اس طرح احادیث صحیحہ ہیں اور اختلاف کا پایا جانا اس سبب سے نہیں کہ خود احادیث صحیحہ میں تعارض وتخالف پایا جاتا ہے بلکہ لوگوں کا فہم وتفقہ چونکہ مختلف ہے اس لئے احادیث سے مطلب برآمد کرنے میں اختلاف واقع ہوا فی الحقیقت مختلف افہام وعقول کے وجہ سے یہ اختلاف پایا گیا اور احادیث کی جانب منسوب کیا گیا ورنہ کوئی حدیث صحیح دوسری حدیث صحیح کے ہرگز معارض نہیں - احادیث میں اختلاف اس قسم کا پایا جاتا ہے کہ ایک حدیث کسی حکم کے بارہ میں عام ہے اور دوسری خاص یا ایک ناسخ دوسری منسوخ یا ایک میں اولویّت اور افضلیت کا بیان دوسری میں جواز واباحت کا اظہار یا ایک موقعہ پر کسی امر کی مشروعیت اور دوسرے موقعہ پر عدم مشروعیت ہو - ان صورتوں میں ہرگز تعارض نہیں ہوسکتا - اور اس قسم کا اختلاف احادیث سے مخصوص نہیں بلکہ قرآن میں بھی پایا جاتا ہے ایک عالم نے آیت قرآنی کا مطلب حسب خیال خود سمجھ کر اسکے موافق حکم دیا دوسرے نے اُس کے خلاف کیا مثلاً زن مطلقہ کی عدت کو حنفیہ تین حیض قرار دیتے ہیں اور شافعیہ تین طہر اور دونوں قرآن ہی سے استدلال

---

[1] اگر یہ قرآن اللہ کے سوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے - (النساء: ۸۲)

کرتے ہیں اور آیہ کریمہ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ معرضِ استدلال میں لاتے ہیں معتزلہ کہتے ہیں کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ خود بندے اپنے افعال کے خالق ہیں وہ بھی قرآن مجید ہی سے استدلال کرتے ہیں اور اہل سنت جو اس کے خلاف فرماتے ہیں وہ بھی قرآن سے تمسک کرتے ہیں۔ حضرات شیعہ بہت سی آیات قرآنی کو اپنے مدعاتِ فاسد کے لئے پیش کرتے ہیں اور متعہ وغیرہ کا جواز قرآن سے ثابت کرتے ہیں بلکہ نجومی لوگ علم نجوم کے تعلیم تعلم کا جواز قرآن سے نکالتے ہیں لیکن اس قسم کے اختلاف کا منشا محض فہم و عقل کا اختلاف ہے۔

اسی طرح عموم و خصوص کا اختلاف بھی قرآن میں پایا جاتا ہے مثلاً زن بیوہ کی عدت کے بارہ میں فرمایا۔ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا[1] یہ حکم عام حاملہ و غیر حاملہ سب کو شامل ہے دوسری جگہ فرمایا وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ[2] اس میں حاملہ کے لئے دوسرا حکم فرمایا گیا اور دوسری جگہ بیوہ کے لئے فرمایا وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ[3] اس آیت میں بیوہ کے لئے ایک سال کی مدت قرار دی اور آیت سابقہ میں چار ماہ دس روز۔ اوّل ناسخ دوم منسوخ۔ اور فرمایا إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا[4] پھر فرمایا الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا[5]۔ کیا ان دونوں حکموں میں اختلاف نہیں پایا جاتا، ضرور پایا جاتا ہے۔

سائل صاحب لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف نمازیں پڑھی تھیں جیسے مسلمان فرقے ایک دوسرے کے خلاف پڑھتے ہیں یا ایک نماز پڑھی تھی اور وہ قرآن کے موافق تھی یا خارج۔؟

---

[1] اور جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ چار مہینے دس روز کا انتظار کریں (یعنی چار مہینے اور دس دن عدت گزاریں) ۱۲ [2] اور حمل والیوں کی عدت اُن کے حمل کے وضع ہونے تک ہے ۱۲ [3] اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے لئے ایک برس تک نان و نفقہ دینے کی اور گھر سے نہ نکالے جانے کی وصیت کر جائیں۔ [4] اگر تم سے بیس آدمی صبر کرنے والے ہوں تو دو سو کافروں پر غالب ہوں گے اور اگر تم سے سو آدمی ہوں تو ایک ہزار کافروں پر غالب ہوں گے۔

[5] اب اللہ نے تم پر تخفیف فرمائی۔ اس نے جان لیا کہ تم میں ابھی کمزوری ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ نمازیں جس قدر فرائض و واجبات ہیں اُن کو آپ نے ہمیشہ یکساں ادا فرمایا البتہ سفر و حضر میں قصر و غیر قصر کا اختلاف پایا گیا۔ سنن و مستحبات میں کبھی کچھ اختلاف پایا گیا اور یہ وہی نماز تھی جس کے لئے حق تعالےٰ نے فرمایا واقیموا الصلوٰۃ اور آنحضرتؐ نے بموجب حکم الٰہی اُس کی تشریح فرمائی۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی کا رسالہ

اشاعۃ القرآن (۲)

چکڑالوی صاحب کے حالات اور عقائد و مقالات سے تو حضرات ناظرین بخوبی واقف ہوں گے کیونکہ ضیاء السنّۃ نمبر ۳ و ۴ میں اس کے متعلق چند مضامین پُر زور شائع ہو چکے ہیں اور اشاعۃ السنّۃ وغیرہ میں بھی اُس کے عقائد فاسدہ کی تشریح و تردید بخوبی ہو چکی ہے۔ حال میں جو اُن کی طرف سے رسالہ شائع ہوا ہے اُس میں چار شخصوں کو مخاطب کیا ہے ایک خاکسار ایڈیٹر ضیاء السنّۃ دوم مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب بٹالوی سوم مولوی احمد اللہ صاحب امرتسری چہارم ہمارے ہمنام مولوی عبدالجبار صاحب غزنوی۔ کیونکہ سب سے پہلے اُنکے جوابات کی تردید خاکسار راقم الحروف نے کی جیسا کہ اشاعۃ القرآن کے صفحہ ۲ میں مذکور ہے اُس کے بعد مولوی ابوسعید و مولوی احمد اللہ صاحبان نے زور شور کے ساتھ جرح و قدح فرمائی۔ فی الحال رسالہ مذکورہ پر اجمالی نظر کی جاتی ہے اور تفصیل و تشریح کو دوسرے وقت پر چھوڑا جاتا ہے کیونکہ بعض امور کی نسبت مختصر تحریر کفایت کرتی ہے اور بعض کے لئے زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے اوّل اجمال پھر تفصیل غالباً دلچسپی اور قند مکرر کے لطف سے خالی نہ ہوگا۔ پس واضح ہو کہ چکڑالوی نے اس رسالہ میں بھی حسب دستور سابق مغالطہ و سفسطہ سے کام لیا ہے اور بعض اُمور کے جواب دینے سے دیدہ و دانستہ گریز کیا ہے اور جس امر میں بخیال خود کچھ کلام کرنے کی گنجائش پائی ہے اُس میں حیلہ گری و ملمع سازی کے ساتھ جواب دیا ہے۔ جن امور کے جواب سے گریز کیا اُن میں سے ایک یہ ہے کہ

چکڑالوی نے اپنے جواب میں صحیح بخاری کی حدیث مَا تَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلعم دینارا الخ سے استدلال کیا۔ ضیاء السنۃ نمبر ۳ میں اس پر اعتراض کیا گیا کہ جب حدیث قابل وثوق و اعتماد نہیں تو اس سے استدلال کیوں کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ بغیر حدیث کے چارہ نہیں مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب نے بھی اشاعۃ السنۃ نمبر ۵ جلد ۱۹ میں یہی اعتراض وارد فرمایا چکڑالوی سے اس کا کچھ جواب نہ ہو سکا۔ چکڑالوی کے مرید و مقلد شیخ چٹو نے جو مباحثہ طبع کرایا ہے اس کے صفحہ ۱۲ میں استدلال مذکور موجود ہے از انجملہ ایک امر یہ ہے کہ ضیاء السنۃ نمبر ۳ میں سوال کیا گیا تھا کہ ربا کے بارہ میں قرآن مجید میں مذکور ہے : یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ربا اسی مقدار تک حرام ہے جو اضعافا مضاعفہ کی حد تک پہنچے اور جو قلیل مقدار ہو وہ حرام نہیں اور یہ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا میں رِبا سے مراد وہی مقدار ہے جو کثیر ہو کیونکہ یہ الف لام عہد کا ہو سکتا ہے اس شبہ کا جواب صفحہ نمبر ۷ پر گزر چکا ہے۔

عبد اللہ چکڑالوی کا رسالہ

صلوٰۃ القرآن

تخمیناً ایک سال گزرا ہو گا کہ چکڑالوی صاحب بیباک رخنہ انداز سے خاکسار اور دیگر احباب اہل علم نے سوالات کئے تھے کہ نماز پنجگانہ کی مقدار رکعات و ارکان دلواحق کی پوری کیفیت قرآن میں کہاں مذکور ہے اسی طرح زکوٰۃ وغیرہ کی نسبت بھی چند سوال کئے گئے تھے آپ نے مدت دراز کے بعد رسالہ اشاعۃ القرآن میں اعلان دیا کہ نماز و زکوٰۃ کے بارہ میں جو سوالات کئے گئے ہیں ان کے جواب میں ہم مستقل رسالہ لکھتے ہیں آخر وہ رسالہ جو کہ نہایت مختصر اور صغیر و قلیل اور نا کافی ہے شائع ہوا اور ہمارے پاس پہنچا۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ چکڑالوی بیادر نے خود اپنے دعویٰ کو غلط اور لغو اور دروغ ثابت کر دکھایا اور آپ اپنی قلعی کھولی اس لئے کہ دعویٰ تو یہ کیا گیا تھا کہ ہر نماز کی رکعات و ارکان کی کیفیت قرآن مجید سے ثابت کیجا دے گی اس رسالہ میں ثبوت کا نشان بھی نہیں۔ صفحہ ۷ میں آپ نے رکعات و اوقات نماز کا نقشہ کھینچا ہے اور حسب طریقہ اہل اسلام ظہر و عصر و عشاء کی چار چار رکعتیں اور مغرب کی تین اور صبح کی دو رکعتیں بیان فرمائی ہیں۔ لیکن بہت ضروری امر کہ قرآن کی کن آیتوں سے یہ مقدار اور

کیفیت ثابت ہے سو اس کا نشان بھی نہیں؟ صفحہ ۶ میں نماز کی ترکیب لکھی ہے کہ قیام میں داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ کی کہنی تک دل پر رکھا جاتے لیکن یہ نہیں بیان کیا کہ یہ ترکیب قرآن کی کس آیت سے ثابت ہے اسی طرح رکوع و سجود قومہ و جلسہ وغیرہ کی کیفیت بیان کی ہے اور یہ بھی بیان نہیں کیا کہ نماز کے لئے قبلہ رُخ ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ صفحہ ۹ میں تکبیر اور دُعا لکھی ہے مگر یہ نہیں لکھا کہ قرآن کی کس آیت سے آیات مذکورۂ کا قیام کے وقت پڑھنا ثابت ہے اور ہر رکعت میں سُورۃ فاتحہ کا پڑھنا کس آیت سے پایۂ ثبوت کو پہونچتا ہے اور صفحہ ۲۸ میں دائیں بائیں سلام پھیرنا اور آیۂ کریمہ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ الخ کا تلاوت کرنا بیان کیا ہے لیکن یہ نہیں بیان کیا کہ دائیں بائیں سلام کرنا اور آیۂ مذکورہ کا پڑھنا کس آیت سے ثابت ہے پھر صفحہ ۲۹ میں نماز جنازہ کا حال لکھا ہے کہ اس میں آیۂ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا الخ پڑھنا چاہیئے لیکن یہ نہ لکھا کہ نماز جنازہ کی کیا ترکیب ہے۔ اور رکوع و سجود اس میں شامل ہے یا نہیں اور آیۂ مذکورہ کا پڑھنا قرآن میں کہاں مذکور ہے؟

مولوی عبداللہ چکڑالوی اور حدیث نبویؐ

مولوی چکڑالوی کو یہ امر ضرور مسلم ہوگا کہ توریت و انجیل و زبور حق تعالےٰ کی نازل کی ہوئی کتابیں ہیں اور ہر مسلمان کے لئے ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں جا بجا اس کیلئے ارشاد کیا گیا ہے فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ[1] اور فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ[2] وغیرہ اور یہ بھی چکڑالوی اپنی تحریرات اشاعۃ القرآن وغیرہ میں صاف طور پر لکھ چکا ہے کہ توریت و انجیل وغیرہ کے احکام میں سے کوئی حکم منسوخ نہیں ہوا۔ جب یہ امر ثابت و محقق ہوا کہ قرآن کی طرح کتب سابقہ پر ایمان لانا ضروری ہے تو اس کے احکام و مسائل مندرجہ کو عمل میں لانا بھی ضروری ہوگا ورنہ قرآن کے مثل ایمان لانا غلط ہوگا اور ایمان کے ثبوت و ظہور کے لئے کوئی علامت و نشانی قائم نہ ہوگی۔ جب عمل میں لانا اور احکام مندرجہ توریت و انجیل کو پیش نظر رکھنا

---

(۱) البقرۃ: ۴ (۲) النسآء: ۱۳۶

لازم ہوا تو اس کی کیا ضرورت اور کیا تدبیر ہے۔ چکڑالوی صاحب بتائیں کہ توریت وانجیل کا صحیح و معتبر نسخہ جس کو یقیناً کلام حق کہا جاوے اگر اس زمانہ میں دستیاب ہوسکتا ہے تو اس کا نشان بتایا جاوے اور اس پر عملدرآمد کی ہدایت کی جاوے اور اگر نہیں ہوسکتا تو اس کی کیا وجہ ہے خود بدولت اشاعت القرآن وغیرہ میں لکھ چکے ہیں کہ احکام و آیات الٰہی میں کوئی تغیرّ و تبدل واقع نہیں ہوسکتا اور اس پر آیہ قرآنی لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ[1] وغیرہ سے استدلال کیا گیا ہے کیا سبب ہے کہ کلام الٰہی توریت وغیرہ کا صحیح و سالم نسخہ باقی نہیں رہا اور تغیرّ و تبدل کے شکنجہ میں آکر غائب ہو گیا۔ اور اگر یہ کہا جاوے کہ قرآن مجید تمام احکام شرعیہ کو جامع و حاوی ہے اور عمل درآمد کے لئے کافی و وافی ہے اس لئے توریت پر عملدرآمد کی کوئی ضرورت و حاجت نہیں جب قرآن پر عمل کیا جاوے گا تو توریت و انجیل پر عمل ہو جائیگا کیونکہ کتابیں ایک دوسرے کے مثل اور ہمہ وجوہ باہم موافق ہیں تو اس کی نسبت گزارش ہے۔ کہ ضیاء السنۃ نمبر ۳ جلد ۲ میں بخوبی ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن و توریت احکام و مسائل میں بہمہ وجوہ موافق نہیں اور اگر ہمہ وجوہ موافق ہیں تو پھر توریت کے بعد زبور و انجیل اور اس کے بعد قرآن نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سب کے لئے ایک ہی کتاب کفایت کرتی تھی اور جب ایک کتاب پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ متعدد کتابیں نازل کی گئیں تو صرف چار کتابوں پر کیوں اکتفا کیا گیا۔ ہر ہر پیغمبر پر جُدا جُدا کتاب کیوں نہ نازل کی گئی کیا وجہ ہے کہ قوم عاد کی ہدایت کے لئے ہود علیہ السلام پر اور ثمود کی اصلاح کے لئے صالح علیہ السلام پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی۔ پھر اگر عمل کرنے کے لئے توریت کی ضرورت نہیں تو اگر بنظر حصول خیر و برکت و ثواب توریت و انجیل کی تلاوت کی جاوے یا نمازمیں بجائے قرآن کے توریت وغیرہ کو پڑھا جائے تو صحیح و درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو یہ شبہ وارد ہوگا کہ قرآن مجید میں نماز کے متعلق فرمایا فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ[2] اس آیت میں خاص قراءت قرآن کا کیوں ذکر کیا گیا توریت وغیرہ کی تلاوت کو کیوں نہ شامل کیا گیا اور اگر درست نہیں تو اس حالت میں ایک قسم کلام الٰہی یعنے قرآن کو نماز میں پڑھنا اور اُس کو ضروری قرار دینا اور دوسرے قسم کلام الٰہی کو غیر ضروری ٹھہرانا بلکہ نماز میں اس کی تلاوت کو ناجائز کہنا کس وجہ سے ہوا۔ اگر کہا جاوے کہ قرآن و حدیث دونوں حق تعالےٰ کی طرف سے ہیں لیکن قرآن مجید لفظ و معنی کے لحاظ سے معجزہ ہے اور نماز میں اس کی تلاوت ضروری ہے اور حدیث لفظ و عبارت کے لحاظ سے

---

(۱) الانعام: ۱۱۵ (۲) المزمّل: ۲۰

معجزہ نہیں اور نہ نماز میں بجائے قرآن کے اس کی تلاوت جائز ہے لیکن اس کے احکام کو قبول کرنا اور عمل میں لانا ضروری ہے جیسا کہ توریت وانجیل کی کیفیت ہے تو اس صورت میں کیا گناہ لازم آوے گا۔

اخبار شحنہ ہند میرٹھ میں چکڑالوی صاحب کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے ہیں۔ ۲۴ اپریل کے شحنہ میں بھی دو تین مضامین شائع ہوئے ہیں اس میں لکھتے ہیں کہ ہمارے جوابات پر پہلے ایڈیٹر صاحب ضیاء السنۃ کلکتہ نے اعتراضات کیے ہر چند کہ وہ اعتراضات مہذبانہ ہیں لیکن قرآن مجید کو ناقص بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ان کا جواب اشاعۃ القرآن میں دیا گیا۔ اس کی نسبت گزارش ہے کہ اشاعۃ القرآن میں جو جوابات دیئے گئے ضیاء السنۃ نمبر ۲ و ۳ جلد ۲ میں ان کی اچھی طرح قلعی کھول گئی اور ظاہر کر دیا گیا کہ چند سوالات و اعتراضات کا جواب چکڑالوی صاحب سے کچھ بن نہیں پڑا اور جس قدر جوابات دیے وہ بھی رکیک اور لغو و فضول ہیں ابتک جواب نہیں ملا۔ اور قرآن کو ناقص بنانے کا الزام سراسر لغو اور غلط اور کوتہ اندیشی پر مبنی ہے ذرا اس امر کا خیال کیا جاوے کہ توریت کی نسبت حق تعالیٰ نے فرمایا وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ[1]۔ یعنی ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو حق و باطل میں فرق کرنے والی اور سراسر نور اور پرہیزگاروں کے لئے نصیحت کرنے والی کتاب عطا فرمائی اور فرمایا إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ[2] اور فرمایا ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ[3] الخ جب توریت سے حق اور باطل میں فیصلہ اور اندھیرے میں نور تاباں ہوا تو اس کے بعد بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل کیوں نازل کی گئی اور پھر اس کے بعد قرآن کیوں نازل کیا گیا اگر کہا جاوے کہ بعض احکام توریت میں مذکور نہ تھے انجیل میں ان کو بیان کیا گیا یا بعض احکام مجمل تھے ان کی تشریح کی گئی تو یہی کیفیت حدیث کی نسبت بیان کی جاویگی جس طرح انجیل کے نازل ہونے سے توریت کا ناقص اور غیر کافی ہونا لازم نہیں آتا اسی طرح حدیث کے ہونے سے قرآن کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا۔ جب قرآن میں صاف طور پر حکم وارد ہے کہ رسول کی اطاعت کرو تو اس سے ثابت ہوا کہ جس قدر احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں بیان فرمائے وہ مجمل طور پر سب کے سب قرآن میں مذکور ہیں۔ پس قرآن جامع وحاوی اور کافی ووافی گویا دریا کوزہ میں بند اور حدیث شرح کرنے والی اور

---

(۱) الانبیاء: ۴۸ (۲) المائدہ: ۴۴ (۳) الانعام: ۱۵۵

دریا کے پانی کو پھیلانے والی ہے۔ چکڑالوی نے حدیث کے غیر معتبر ہونے پر جو آیۂ قرآنی وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ [۱] الخ سے استدلال کیا تھا اس کا جواب ضیاء السنہ نمبر ۴ جلد ایک میں دیا گیا چکڑالوی سے اس کے مقابلہ میں کچھ بن نہیں پڑا اسی لئے اشاعت القرآن میں اس سے کچھ تعرض نہیں کیا اب ۲۴ اپریل کے شحنہ ہند میں لکھتے ہیں اور پچھلی باتوں کو دوہراتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے وحی سے منافقوں کا حال بتایا تھا اور چند روز تک جو آپ کو منافقوں کے حالات سے بے خبری رہی اس کو دور فرمایا تھا لیکن راویانِ احادیث کے پرکھنے والوں کو ان کا علم کس نے بتایا تھا کیا ان پر بھی جبریل نازل ہوتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بلا شک راویانِ احادیث کے پرکھنے والوں پر حضرت جبریل نازل نہ ہوتے تھے لیکن حق تعالیٰ نے اس قسم کے حالات اور معاملات کی جانچ پڑتال کے لئے اسباب و علامات قائم فرمائے ہیں اور بہت سے احکام شرعیہ کا دار و مدار اسباب مذکورہ کو قرار دیا ہے مثلاً گواہی کے بارہ میں فرمایا: وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ [۲] وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ [۳]۔ پس جب بموجب ارشاد قرآنی کسی معاملہ کے لئے گواہ عادل پیش کیا جائے گا تو عادل و غیر عادل کی شناخت کے لئے وحی الٰہی اور نزول جبریل کا انتظار نہ کیا جائے گا بلکہ ظاہری علامات اور تجربہ و اندازہ سے عادل ہونے کا حکم قائم کیا جاوے گا حدیث کے راویان کی بھی یہی کیفیت ہے۔ حق تعالیٰ نے سورہ ممتحنہ میں مسلمان عورتوں کے بارہ میں حکم فرمایا فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ [۴] یعنی اگر تم کو معلوم ہو کہ عورتیں ایمان والی ہیں تو کافروں کی طرف ان کو واپس نہ کرو۔ اب چکڑالوی صاحب بتائیں کہ عورتوں کے اہل ایمان ہونے کا علم کس ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے کیا نزول وحی و جبریل سے یا علامات و اسباب سے۔ جس طرح یہاں پر ایمان و غیر ایمان کی کیفیت معلوم ہو سکتی ہے اسی طرح راویانِ حدیث کے ثقہ و غیر ثقہ ہونے کی کیفیت معلوم ہو سکتی ہے۔ رؤیت ہلال کے بارہ میں جس طرح شہادت سے یقین کیا جاتا ہے اسی طرح راویان کی روایت قابل تسلیم قرار دی جاتی ہے اور حق تعالیٰ فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا [۵] الخ جب فاسق کی خبر پر فی الفور عمل نہ کرنا بلکہ تحقیق و تفتیش سے اصل اور صحیح معاملہ کا جانچنا اور معلوم کرنا ہو سکتا ہے تو راویان احادیث کے حالات معلوم کرنے سے کون شے مانع و مزاحم ہے۔

(۱) التوبہ: ۱۰۱ (۲) الطلاق: ۲ (۳) البقرۃ: ۲۸۲ (۴) الممتحنۃ: ۱۰ (۵) الحجرات: ۶

حدیث سحر کے بارے میں وضاحت

اخبار المصباح کلکتہ۔ مطبوعہ ۲۴۔ جنوری ۱۹۰۲ء میں مولوی عبداللہ الہ آبادی کی طرف سے سوال جواب طلب شائع ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ "اکثر محدثین نے لکھا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا گیا تھا اور کئی سال تک آپ مسحور رہے یہ صحیح ہے یا غلط۔ اگر غلط ہے تو اکابر محدثین کی تحقیق غلط ٹھہرتی ہے اور یہ صحیح ہے تو وحی رسول کا کیا اعتبار۔ ممکن ہے کہ حالت مسحوری میں کوئی آیت نازل ہوئی ہو"۔

اس کا جواب باصواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کا واقع ہونا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ مؤطا امام مالکؒ اور صحیح بخاری و مسلم میں اس کا واقعہ مذکور ہے اور اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے معوذتین کو نازل فرمایا۔ دونوں سورتوں کی گیارہ آیتیں ہیں اور سحر بھی بال میں گیارہ گرہ لگا کر کیا گیا تھا ہر آیت کے پڑھنے سے ایک ایک گرہ کھلتی گئی۔ لیکن کئی سال تک اس کا اثر باقی رہنا غلط اور بے ثبوت ہے بلکہ بعض روایات سے چالیس یوم اور بعض سے چھ مہینے اور بعض سے ایک سال تک اثر کا پایا جانا ثابت ہوتا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشر و انسان اور صفات بشری و علائق جسمانی سے موصوف تھے آپ کھانا کھاتے تھے پانی پیتے تھے۔ اوقات مقررہ میں سوتے جاگتے تھے۔ کبھی درد و مرض میں بھی مبتلا ہوتے تھے۔ جب کوئی دشمن دین آپ کو غذا کے ہمراہ زہر کھلاتا تھا تو اس کا اثر آپ کے جسم مبارک میں پایا جاتا تھا۔ جب کبھی سواری وغیرہ سے آپ کو گرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو چوٹ کا اثر پایا جاتا تھا۔ آپ کے جسم سے بول و براز بھی خارج ہوتا تھا۔ غرض جو صفات و عوارض انسان میں پائے جاتے ہیں وہ سب آپ کے جسم اطہر میں پائے جاتے تھے۔ قال اللہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[1] وقال تعالیٰ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ[2] ۝ باوجود بشریت وانسانیت کے آپ کی ذات مبارک میں وہ کمالات و حسنات پائے جاتے تھے جس کی نظیر تمام جہان میں نہ پائی جاتی تھی نہ کوئی رسول آپ کے مثل ہوا نہ غیر پیغمبر۔ آپ نو بیبیوں کے خاوند تھے اور سب کے حقوق کامل طور پر

(۱) الکھف: ۱۱۰ (۲) الزمر: ۳۰

ادا فرماتے تھے - پھر بھی تبلیغ احکام و وعظ و ہدایت و ادائے منصب رسالت میں بال برابر بھی فرق نہ واقع ہوتا تھا اگر آپ فرشتہ ہو کر کمالات سے موصوف ہوتے تو کوئی عظیم الشان اور جلیل القدر بات نہ ہوتی کیونکہ فرشتے عوارض جسمانی سے بہمہ وجوہ پاک وصاف ہیں ان کی ذات میں کوئی کیفیت اس قسم کی نہیں پائی جاتی جو پاکی و صفائی سے مانع و مزاحم اور غفلت وسہو و نسیان کے لئے باعث و محرک ہو - اسی وجہ سے وہ ایک درجہ و رتبہ پر قائم رہتے ہیں جس فرشتے کو جو رتبہ حاصل ہوا وہ اُس سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور کسی طرح ترقی حاصل نہیں کر سکتا - جس شخص میں زنا و سرقہ وغیرہ کی طاقت ہو پھر اُس سے بچکر عصمت و عفت حاصل کرے تو قابل ستائش ہو سکتا ہے اور جس میں طاقت نہیں بلکہ ہر طرح مجبوری ہے جیسے عنین اور فالج زدہ وغیرہ وہ زنا وغیرہ سے محفوظ رہنے کی وجہ سے ہرگز قابل مدح نہیں ہو سکتا - نیک آدمی اسی وجہ سے قابلِ مدح ہے کہ باوجود فعل بد کر سکنے کے پھر نہیں کرتا - باوجودیکہ کھاتا پیتا ہے خواب و راحت اور عورتوں سے مشغلہ رکھتا ہے لیکن نیک کام اور پاکی و صفائی سے دور و مہجور نہیں ہوتا - اسی وجہ سے درجہ و رتبہ میں ترقی کرتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود مشاغل مذکورہ کے نبوت و رسالت سے غافل نہ ہوتے تھے - اگر یہ شبہہ کیا جائے کہ شاید خواب و راحت اور بیبیوں سے مشغول ہونے کی حالت میں کوئی آیت نازل ہوئی ہو تو محض لغو اور غلط ہے اس لئے کہ وحی کا آنا لڑکوں کا کھیل اور تماشا نہ تھا (معاذ اللہ) کہ موقع بے موقع نازل ہووے بلکہ ضرورت اور موقع پر اُس کا نزول ہوتا تھا اور اس قسم کے مشاغل سے رسالت کے کاروبار میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا تھا - یہی کیفیت آپ کے مسحور ہونے کی تھی کہ اس سے امور نبوت میں کوئی فتور واقع نہ ہوتا تھا - جب آپ پر سحر کیا گیا تو اوّل اُس کا اثر بہت ہوا یہاں تک کہ ظاہری حالت میں تغیر و تبدل نمایاں ہوا لیکن اُس کے بعد معمولی اور خفیف اثر باقی رہ گیا زہر خورانی کا اثر بھی عرصے تک قائم رہا لیکن اوّل زیادہ پھر معمولی اور خفیف - اگر معاذ اللہ امور رسالت میں کوئی خرابی واقع ہوتی تو کفار و مشرکین کو بہت کچھ طعن و تشنیع کا موقع ملتا لیکن کسی دشمن کو کوئی موقع نہ مل سکا اور کسی قسم کا خلل و فتور واقع نہیں ہوا - جس طرح خواب کی حالت میں آپؐ کا دل جاگتا تھا اور آنکھیں سوتی تھیں اسی طرح مسحوری وغیرہ کی کیفیت ہے کہ ظاہر حالت پر اسکا اثر ہوا لیکن رُوحانی اور باطنی کیفیت صحیح و سالم رہی اور انتظام رسالت بدستور جاری -

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ -

(اِثباتُ الخبرِ فی ردِّ مُنکرِیِ الحدِیث
وَ الأثر)

از

مولانا حافظ عبدالستّار حسن عمرپوری رحمہُ اللہ

منکرین حدیث کے اعتراضات اور انکا جواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہٗ عوجاط
ھو الذی منّ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم
یتلو علیھم اٰیاتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ الذی
لا ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحیٰ واشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ
وحدہٗ لا شریک لہٗ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہ الذی شرح
صدرہٗ للفرقان والھدٰی وَاوحیٰ الیہ ان قُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔
صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کثیراً ط

امابعد واضح ہو کہ مسلمانوں کی خوش قسمتی سے آئے دن نئے نئے فرقے پیدا ہوئے ہیں جن سے دین میں ایک عجیب طرح کا تغیّر و تبدّل ہو رہا ہے ہر ایک فرقے والا اپنی سمجھ و خیال کو دینِ حق تصوّر کرتا ہے۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ۔ منجملہ فِرق کے ایک فرقہ اہل قرآن پیدا ہوا ہے جو کہ حدیثِ نبوی ؐ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس کے راہ نما مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی دیداہ اللہ تعالیٰ ہیں۔

اس عقیدے کے لوگوں کو دیکھ کر ایک مدلّل رسالہ کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں عمدگی اور معقولیت کے ساتھ بدلائل قرآنیہ اس امر کو ثابت کیا گیا ہو کہ تعلیم محمدی ؐ ہمارے لئے ضروری ہے اور بغیر اس کے تسلیم کئے ہوئے نجات نہیں ہو سکتی۔

سو بحمداللہ تعالیٰ اس مطلب کے لئے خاکسار نے یہ رسالہ تصنیف کر دیا تاکہ سب پر حق ظاہر ہو جائے اور کسی کو اہل انصاف میں سے حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل باقی نہ رہے۔

خاکسار نے حتی الامکان کسی کی شان میں غیر ملائم الفاظ استعمال نہیں کئے۔ اگر اس رسالہ میں کوئی لغزش پائیں تو بلحاظ اخوت اسلامی اس کی اصلاح سے اطلاع دیں۔ نیز اگر کوئی صاحب اس کا جواب تحریر فرمائیں تو وہ بحکم وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ اور اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ[1] مجھ سے زیادہ امر مذکور کا خیال رکھیں۔ اب اصل مقصود کو شروع کرتا ہوں واضح ہو کہ خاکسار نے اعتراضات واقوال کو قَوْلُهُم سے اور اپنے جوابات کو اَقُوْلُ سے تعبیر کیا ہے۔ و اللہ الموفق والیہ المرجع والمآب۔

قَوْلُهُمْ: ہمارے لئے قرآن کافی ہے اس کے سوا کسی دوسری چیز (حدیث وغیرہ) کی ضرورت نہیں۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَقَالَ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَقَالَ هُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا یعنی قرآن ہر چیز کو بیان کرنے والا اور مفصل و مشرح ہے پھر ہم کو حدیث کی کیا حاجت ہے"

اَقُوْلُ بے شک قرآن کریم ہمارے لئے کافی ہے۔ اس کو ناکافی اور ناقص کہنا ہرگز مسلمان کا کام نہیں لیکن اس کے لئے شرح و تفسیر کی ضرورت ہے جو کہ حدیث کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ آئندہ مدلل بیان کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اہل قرآن نے مفصل کے ساتھ لفظ مشرح بھی قرآن کریم کے لئے کہدیا ہے جو کہ قرآن کریم میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ پھر اپنی طرف سے ایسا لفظ بولنا جو کہ قرآن میں نہیں تحکم نہیں تو اور کیا ہے۔

اور یہ دھوکہ اُن کو اس وجہ سے لگا ہے کہ انہوں نے مفصل اور مشرح کے ایک معنی سمجھے ہیں۔ دونوں کے معنی میں کسی فرق کا انہوں نے خیال نہیں کیا۔ حالانکہ یہ باطل ہے۔ کیونکہ تفصیل کے معنے یہ ہیں کہ اشیاء کو الگ الگ بیان کیا جائے جس سے ایک شی دوسری اشیاء سے تمیز ہو سکے اور ہر شئے علیحدہ علیحدہ معلوم ہو جائے جیسے نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ حج۔ عمرہ۔ اور قیام۔ رکوع۔ سجدہ وغیرہ مفصل طور پر مذکور ہیں اور تشریح کے معنی یہ ہیں کہ شئی کی کیفیات و حالات بیان کئے جائیں اور دیگر اشیاء سے اُس کا تقدم و تاخر ظاہر کیا جائے۔ مثلاً رکوع و سجدہ وغیرہ کے طول کی کیفیت اور یہ کہ رکوع مقدم ہے سجدہ سے

---

[1] ان سے بحث کرو ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔ اور برائی کو ٹال دو ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔

اور سجدہ مقدم ہے قعدہ سے ۔ قرآن کریم میں رکوع اور سجدہ دونوں کا ذکر ہے لیکن کسی آیت میں سجدہ کا پہلے ذکر آگیا جیسا کہ فرمایا یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ اور کسی آیت میں پہلے رکوع مذکور ہوا جیسا کہ ارشاد فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا الایۃ۔ اسی طرح حج کو عمرہ سے ذکر میں مقدم کیا جیسا کہ فرمایا رسول لوگوں کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے) دوسرا یعلمہم الکتاب (یعنی فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ الخ اور وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ حدیث نبوی ؐ نے اس بات کو کھول دیا کہ رکوع مقدم ہے سجدہ سے اور عمرہ مقدم ہے حج سے ۔ یہ بیان ہوا تفصیل وتشریح کے معنی کا ۔

اب میں اُن دلائل کو بیان کرتا ہوں جو کہ تفسیر وتعلیم محمدیؐ کی ضرورت پر دلالت کرتے ہیں قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ الایۃ یعنی اللہ وہ ذات پاک ہے ۔ جس نے اُمّی لوگوں میں انہی میں سے رسول بھیجا ان پر خدا کی آیتیں پڑھتا ہے اور گناہوں سے ان کو پاک کرتا ہے اور سکھاتا ہے اُن کو کتاب اور حکمت یہاں پر دو جملوں سے بحث کرنا مقصود ہے ایک یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ (یعنی رسول لوگوں کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے) دوسرا یعلمہم الکتاب (یعنی رسول لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتا ہے) بس واضح ہو کہ ان دو جملوں سے رسول کے دو منصب ثابت ہوتے ہیں ایک تلاوۃ کتاب دوسرا تعلیم کتاب ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یعلمہم جملہ یتلو علیہم کی تفسیر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ یتلو میں کسی قسم کی پوشیدگی اور خفا نہیں ہے تاکہ اُس کو تفسیر کا محتاج تصوّر کیا جائے پس جب جملہ ثانیہ تفسیر نہیں ہو سکتا تو لامحالہ ہر دو جملہ ایک دوسرے کے مغائر ہوں گے لِاِقْتِضَاءِ الْعَطْفِ الْمُغَایَرَةَ ۔ پس جب دونوں جُدا جُدا ہوئے تو ضرور ہوا کہ تعلیم کے وہ معنی قرار دیئے جاویں جو تلاوت کے اندر نہ پائے جاویں ۔ اور تعلیم میں محض الفاظ قرآنی نہیں ہوں گے بلکہ دیگر الفاظ بھی اس کے ہمراہ ہونگے جن کو تفسیر وشرح کہا جا سکتا ہے ورنہ تعلیم کا عین تلاوت ہونا لازم آوے گا وھو باطل لما ذکرنا آنفاً ۔

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ عرب کے لئے جو کہ اہل لسان اور رسول کے زمانہ

میں موجود تھے تعلیم محمدیؐ یعنی قرآن کے علاوہ دیگر الفاظ کی ضرورت ہوئی تو ہمارے لئے بطریق اولیٰ ہوگی ۔ پس ہم کو وہ تعلیم و تفسیر ملنی چاہیئے جو کہ صحابہؓ کو ملی تھی ورنہ یعلمھم الکتاب کا لغو ہونا لازم آوے گا اور یہ ثابت ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف صحابہؓ کے معلّم تھے ہمارے معلّم نہیں ہیں ۔ نعوذ باللہ من ذٰلک ۔ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں غور و تدبّر کرنے کے لئے فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ لیکن یہ بات ضروری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کسی کا فہم نہیں ہوسکتا اس لئے کہ آپ پر قرآن کریم نازل ہوا اور اللہ عزوجل نے آپ کا سینہ کھول دیا تھا چنانچہ فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۔ پس جو کچھ آپ قرآن سے مسائل بیان فرمادیں گے وہ ہم کو بلا چون و چرا ماننے ہوں گے اور جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ قرآن ہی سے فرمایا ہے خواہ آپ وہ آیتیں جن سے آپ نے مسائل نکالے ہیں بیان فرمادیں یا نہ فرماویں ۔ ہم کو یہ حق نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ وہ کونسی آیتیں ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مسائل نکالے ہیں اگر وہ آیتیں معلوم ہوں تو ہم ان مسائل کو مانیں ورنہ نہیں ۔ اس لئے کہ آپ رسول امینؐ ہیں ۔ ہاں اگر رسولؐ کے سوا دوسرا شخص تدبر کرکے قرآن سے مسائل نکالے تو ہم اس سے ضرور پوچھیں گے کہ یہ مسائل کون سی آیات سے دریافت ہوتے ہیں؟ اگر وہ بتاوے تو فبہا ورنہ ہم اُن کو تسلیم نہیں کرسکتے ۔ کمال تعجب ہے کہ اہل قرآن مولوی عبد اللہ صاحب چکڑالوی کے مسائل کو بلا چون و چرا مان لیتے ہیں اور اس خیال کو دل میں بالکل نہیں لاتے کہ جب مولوی عبد اللہ صاحب چکڑالوی نے اس قدر مسائل کا قرآن سے استنباط کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر استنباط کیا ہوگا جن کا سینہ خدا نے کھول دیا اور ان پر قرآن نازل فرمایا اور علاوہ قرآن کے بھی وحی نازل ہوئی کما سیجیٔ وَاِلَی اللہِ الْمُشْتَکٰی واضح ہو کہ جب یہ ثابت ہوگیا کہ قرآن کے علاوہ دیگر الفاظ کی بھی ضرورت ہے جن کو ہم تعلیم و تفسیر محمدی سے تعبیر کرتے ہیں تو ہمارا اصل مدعا پورا ہوگیا ۔ مگر اس پر منکرین حدیث کا یہ اعتراض ہے کہ وہ تعلیم و تفسیر ہم کو کس ذریعہ سے مل سکتی ہے جبکہ راویوں کا کچھ اعتبار نہیں ۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے منافق موجود تھے اور خود آپ کو اُن کا علم نہ تھا ۔ قال اللہ تعالیٰ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ جب خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقوں کا علم نہ تھا تو دیگر مسلمانوں کو راویوں کے حالات بطریق اولیٰ نہیں معلوم ہوں گے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ

جب تک منافقوں اور مومنوں کی پوری علامات نہیں بتلائی گئیں تھیں اُس وقت تک یہ حالت تھی اور جب ان کی علامتیں ظاہر کر دی گئیں تو مسلمانوں اور منافقوں میں تمیز ہوگئی قال تعالےٰ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ یعنی منافقین کی یہ علامات ہیں کہ بُرے کام کا حکم کرتے ہیں اور نیک کام سے روکتے ہیں اور (راہِ حق میں خرچ کرنے سے) اپنی مٹھیاں بند رکھتے ہیں۔ وَقَالَ تَعَالٰى اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا یعنی منافق اللہ کو دھوکا دیتے ہیں اور ان کی یہ حالت ہے کہ نماز کے لئے ہارے جی سے کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگوں کو دکھلاتے ہیں اور اللہ کا ذکر نماز میں بہت کم کرتے ہیں اور حدیث میں منافقین کی یہ علامات بھی آئی ہیں: اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ یعنی منافق جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے اور امانت میں خیانت کرتا ہے اور جھگڑے کے وقت فحش بکتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کی تائید ملتی ہے چنانچہ فرمایا: وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ یعنی وہ جھوٹ پر جانتے بوجھتے حلف اٹھاتے ہیں۔ اور جس طرح اللہ تعالےٰ نے منافقین کی علامات بیان فرمائی ہیں اسی طرح مومنین صادقین کی بھی صفات و علامات بیان فرمائی ہیں۔ چنانچہ فرمایا

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ)

یعنی توبہ کرنے والے، عبادت گذار، (خدا کی) حمد و ثنا کرنے والے، اس کی راہ میں سفر کرنے والے، رکوع و سجود کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور بُرائی سے روکنے والے، اللہ تعالےٰ کی ٹھہرائی ہوئی حدبندیوں کی حفاظت کرنے والے

اور فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (الی قولہ) وَالَّذِيْنَ هُمْ

لاَ مٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ

یقیناً (وہ) ایمان لانے والے فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں، جو لغو باتوں کی طرف رُخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

... نیز جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ (سورۃ المومنون)

اور دوسری جگہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُوْنَ۔

اور جو اپنی گواہیوں میں (راست بازی پر) قائم رہتے ہیں، (سورۂ معارج)

اور سورۂ احزاب میں فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ

یعنی مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، راست گو مرد اور راست گو عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنے والے مرد، اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، (الاحزاب)

علاوہ اس کے جا بجا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَأَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ یعنی اپنے میں سے دو عدل والوں کو گواہ بناؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم علامات سے یہ پہچان سکتے ہیں کہ یہ شخص عدل و انصاف والا ہے اور یہ شخص عدل والا نہیں ورنہ یہ فرمانا کہ دو عادلوں کو گواہ بناؤ، "لغو ہوگا" نعوذ باللہ۔ ایسے ہی زنا وغیرہ میں سزا وغیرہ کا دارومدار گواہوں پر

موقوف ہے۔ اگر سب کی نسبت یہ گمان کیا جاوے کہ شاید یہ منافق ہوں تو شہادت کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا۔ اگر کہا جاوے کہ شہادت وغیرہ کا جو ذکر ہوا ہے یہ سیاسی امور میں ہے تعبدی امور میں نہیں عبادات میں انسانی روایات و شہادات کا اعتبار نہیں ہو سکتا اگرچہ راوی اور شاہد عادل ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مضمون بالا سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا کہ شریعت میں انسانی روایتوں اور شہادتوں کا اعتبار ہے جبکہ راوی اور شاہد عادل ہوں اگر عادل نہ ہوں تو بعد تحقیق ان کی روایات کا اعتبار ہوگا۔ اس میں سیاسی امور کو خاص کرنا تخصیص بلا مُخَصِّص ہے دوسری جگہ اللہ فرماتا ہے :۔ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا یعنی اے ایمان والو جب تمہارے پاس کوئی فاسق (کسی قسم کی) خبر لاوے تو اُس کو تحقیق کر لو۔ پس فاسق کی خبر تحقیق کے بعد مانی جاوے گی اور عادل کی خبر کی لئے تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اور آیہ مذکورہ میں لفظ نَبَاٍ نکرہ ہے جو کہ عام ہوتا ہے یعنی کوئی خبر ہو دینی یا دنیوی۔ یہاں پر یہ کہنا کہ خبر سے مراد وہ خبر ہے جو کہ عبادت کے متعلق نہ ہو، تخصیص بلا دلیل ہے۔ علاوہ اس کے یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ اگر کوئی مسلمان یہ خبر دے کہ رمضان یا عید کا چاند ہو گیا تو ضرور اُس کو مانا جاوے گا اور روزہ رکھا جاوے گا یا افطار کیا جاوے گا اور روزہ کا عبادت ہونا ظاہر ہے پس یہاں پر روزہ کا رکھنا اور افطار کرنا دونوں روایت و شہادت سے ہوئے۔ ایسے ہی نماز کے لئے ہم کو قبلہ روایت و شہادت سے معلوم ہوا ورنہ ہم ہرگز یقیناً نہیں کہہ سکتے کہ مسجد اسی طرف ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نماز میں قبلہ رو ہونا اعلیٰ درجہ کی عبادت اور فرض عین ہے۔ قال اللہ تعالےٰ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اور اسی طرح طلوع فجر و غروب آفتاب کی خبر ہے جس پر نماز مغرب اور روزہ دار کے لئے کھانے کی بندش و افطار منحصر ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عبادات روزہ نماز وغیرہ میں شہادت و روایت کو شرعاً ماننا ہوگا۔

اب بعد بحث ضرورتِ حدیث و رواۃ ایک سوال اہل قرآن سے کرتا ہوں تاکہ ان کو قدر عافیت معلوم ہووے۔ وہ یہ ہے کہ آپ لوگ جب نقل و روایت کو خواہ متواتر ہو یا غیر متواتر ہو مطلقاً تسلیم نہیں کرتے تو پھر آپ قرآن کریم کو کس طرح مانتے ہیں جو کہ ہم کو مسلمین سابقین سے سلسلہ کے ساتھ پہنچا ہے۔ یہ بھی تو روایت ہی ہے اگرچہ بطریق تواتر ہو۔ اگر کہا جاوے کہ ہم کو روایت سے کچھ مطلب نہیں۔ ہم نے صرف یہ دیکھکر کہ قرآن کریم بے نظیر ہے اور کوئی شخص اس کے مثل نہیں لا سکتا معلوم کر لیا کہ کلام بشر

نہیں بلکہ کلام باری تعالےٰ ہے اور یہی بات اللہ تعالےٰ نے بھی فرمائی ہے کہ اگر قرآن کریم میں شک ہو تو اس کے مثل بنالاؤ چنانچہ فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ الخ - تو جواباً کہا جاوے گا کہ بے نظیر و بے مثل ہونا کلام مجید کا انہیں لوگوں کو معلوم ہو سکتا ہے جو کہ عربیت، علم ادب، لغت و معانی و بیان وغیرہ میں ماہر ہیں۔ وہی لوگ کلام بشر اور کلام خدا میں فرق بیان کر سکتے ہیں اور قرآن کریم کے رجعلی) مثل کو جھوٹا اور غلط قرار دے سکتے ہیں اور جو لوگ کہ عربیت وغیرہ سے واقف نہیں ان کے روبرو اگر کلام بشر فصیح و بلیغ پیش کیا جاوے تو وہ خود اپنی تحقیق سے اس میں بمقابلہ کلام اللہ غلطی و کمزوری بیان نہیں کر سکتے جب تک کہ علمائے ماہرین کی بات کو نہ مانیں۔

قولہم ایسی احادیث کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں جو کہ قرآن کے مطابق ہوں۔

اقول قرآن کے مطابق ہونے کے کیا معنے ہیں اگر یہ معنے ہیں کہ مولوی عبد اللہ صاحب چکڑالوی کی تفسیر کے مطابق ہوویں تو پھر وہ احادیث دیگر اہل قرآن کے خلاف ہوں گی جو کہ بہت سے احکام و مسائل میں مولوی چکڑالوی کے مخالف ہیں اور اگر دیگر اہل قرآن کے موافق ہوویں تو مولوی چکڑالوی کی وہ احادیث مخالف واقع ہوں گی اور وہ ان کو موضوع قرار دیں گے تو پھر حدیث کی صحت کا معیار کیا ہوگا۔ جس سے صحیح و غیر صحیح میں تمیز ہووے۔ اگر یہی معیار ہے کہ اہل قرآن کی تاویلات کے موافق ہوویں تو علاوہ مشکل مذکور کے ایک اشکال یہ پیش آوے گا کہ اگر چند موضوع حدیثیں ان کی تاویلات کے موافق ہوویں تو ان کو قول رسولؐ اور صحیح تسلیم کرنا ہوگا۔ حالانکہ یہ بالبداہت باطل ہے کیونکہ بنائی ہوئی حدیثیں کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتیں۔ پس ثابت ہوا کہ یہ خیال کہ جو حدیث ہمارے نزدیک قرآن کے مطابق ہو وہ صحیح ہے" بالکل لغو اور غلط ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے نزدیک کوئی حدیث قرآن کے مطابق معلوم ہو اور وہ فی الحقیقت مطابق نہ ہو۔ لہٰذا حدیث کی صحت کے لئے معیار سوا اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کے راوی عادل و ضابط ہوں۔ اگر یہ کہا جاوے کہ ہماری مراد یہ ہے کہ فی نفسہٖ قرآن کے مطابق ہو یہ مطلب نہیں کہ کسی کی تاویل کے مطابق ہو" تو جواباً عرض ہے کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ یہ فی نفسہٖ قرآن کے مطابق ہے جبکہ خود اہل قرآن میں بھی اختلاف ہے۔ علاوہ اس کے اگر بالکل قرآن کے مطابق ایک حدیث وضع کر لیجاوے تو کیا اس کو حدیث صحیح اور قول رسول علیہ السلام کہا جائے گا۔ اہل قرآن تو کہہ دینگے۔ چنانچہ میرے روبرو ایک اہل قرآن نے موضوع حدیث الدنیا مزرعۃ الا

تحصل الا بالمزورة: (یعنی دنیا مکرو فریب کا نام ہے جو مکر و فریب ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے) کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا اقرار کیا۔ سبحان اللہ کیا مذہب ہے کہ حدیث صحیح کا انکار اور حدیث موضوع کا اقرار۔ بقول شخصے فر من المطر وقام تحت المیزاب۔ خود رائی اور عقلی گھوڑے دوڑانے اور تعلیم محمدی چھوڑنے کا یہی نتیجہ ہے۔

قولھم: احادیث میں باہم اختلاف ہے لہٰذا ان کو تسلیم کرنا فرمان الٰہی کے خلاف ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ اگر یہ (قرآن) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو وہ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔ سورۃ نساء آیت (۸۲)

علاوہ اس کے احادیث ظنی ہیں اور ظنی قابل حجت نہیں قال اللہ تعالیٰ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ بے شک ظن (گمان) حق کے مقابلہ میں ذرا بھی کام نہیں دیتا۔ (سورۃ النجم)

اقول: احادیث میں باہمی اختلاف اور تضاد انہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے جو فن حدیث سے واقف و ماہر نہیں، اور جو لوگ کہ اس فن میں مہارت رکھتے ہیں وہ صحیح و ضعیف میں تمیز کر سکتے ہیں اور متضاد روایتوں میں سے ایک کو راجح دوسری کو مرجوح بدلائل قویہ قرار دے سکتے ہیں۔ اگر صرف اختلاف کا پایا جانا موجب بطلان ہے تو علم معانی، بیان، صرف و نحو اور لغت میں بھی اختلاف ہے ان کو کیوں نہیں متروک کیا جاتا۔ اور جتنا اہتمام صحت روایت کا احادیث کے لئے کیا گیا ہے اس قدر لغت وغیرہ کے لئے ہرگز نہیں کیا گیا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ قاموس و صراح و صحاح جوہری وغیرہ میں غلط معنی درج ہوں اور دواوین و قصائد عربیہ میں بھی غلط معنی مستعمل ہو گئے ہوں اور یہ کہ کتب لغت وغیرہ کے مصنفین کل یا بعض مسلمان نہ ہوں اور انہوں نے بہت سے غلط معانی ایسے درج کر دیئے ہوں جن سے کہ اسلام کو نقصان پہنچے۔ پھر اہل لغت اور شعرائے جاہلیت کو غلطی سے پاک سمجھنا عجب پر عجب ہے۔ علاوہ اس کے لغت میں بہت سے معانی اسلامی و شرعی ہیں جو کہ احادیث کے مطابق اور لغت جاہلیت کے مخالف و مغائر ہیں ایسے معانی کو تسلیم کرنا گویا حدیث کو تسلیم کرنا ہے۔ اور یہ بات کہ احادیث ظنی ہیں اور ظنی حجت نہیں" اس کی نسبت یہ گذارش ہے کہ آیت مذکورہ سے یہ ہرگز ثابت

نہیں ہوتا کہ ظنی کسی حالت میں قابل حجت نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ قطعی کے مقابلہ میں مفید اور حجت نہیں ہو سکتا۔ دوسرے معنی آیت مذکورہ کے یہ ہیں کہ حقیقتہً شئے کا ادراک علم سے ہی ہو سکتا ہے ظن سے نہیں ہو سکتا اس لئے معارف حقیقیہ میں ظن کا اعتبار نہیں ہے۔ تیسرے معنی آیت مذکورہ کے یہ ہیں کہ حق سے مراد اللہ تعالےٰ ہے جیسا کہ فرمایا ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ۔ پس ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کی ذات وصفات میں ظن سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ نہیں کہ کسی امر میں بھی ظن معتبر نہیں ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ خود اللہ تعالےٰ نے ظن کا اعتبار فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے بچو (کیونکہ) بعض گمان گناہ ہیں) اس جگہ ظن پر مواخذہ ہونے سے صاف ظاہر ہے کہ ظن معتبر ہے" اور فرمایا اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (جو سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں) علاوہ اس کے قرآن کے معنی جو اہل قرآن بیان کرتے ہیں وہ قطعی ہیں یا ظنی اگر قطعی ہیں تو ایک معنی سے رجوع کر کے دوسرے معنی کو کیوں اختیار کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ ایک ہی معنی پر قائم رہنا چاہیئے معہذا یہ معنی لغت ونحو وغیرہ سے کئے گئے ہیں اگر وہ قطعی نہیں تو معانی قرآن بھی قطعی نہیں ہو سکتے" اور اگر وہ قطعی ہیں تو قطعیت کی دلیل معلوم ہونی چاہیئے جس سے معلوم ہو کہ ان علوم کا بمقابلہ احادیث بہت اہتمام وانتظام ہے اور اگر معانی قرآن ظنی ہیں تو پھر اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا آپ پر بھی صادق آوے گا۔ پس آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ اِنَّ الظَّنَّ الخ کے یہ معنی نہیں جو آپ سمجھے ہیں۔ اگر کہا جاوے کہ معانی اگرچہ ظنی ہوں لیکن الفاظ قرآنی تو قطعی ہیں اور احادیث تو لفظاً ومتناً ہر طرح ظنی ہیں۔ تو کہا جاوے گا کہ جب معانی ظنی ہوگئے تو آپ ظنیات کے قائل ہوگئے۔ کیونکہ عمل تو معانی پر ہی ہوتا ہے بغیر معانی سمجھے ہوئے صرف الفاظ سے کام نہیں چل سکتا پس صرف الفاظ کا قطعی ہونا کس طرح کافی ہو سکتا ہے۔ قطعی کہنے کی صورت میں آپ کو یہ ماننا ہوگا کہ جو معانی ہم قرآن کریم کے سمجھے ہیں اُن میں غلطی کا ہونا محال ہے حالانکہ آپ یہ ہرگز نہیں مان سکتے" اس لئے کہ بارہا مشاہدہ میں آچکا کہ آج آپ نے ایک معنی اختیار کئے کل اُس سے رجوع کر لیا اور بعد ازاں اُس سے رجوع کر کے تیسرے معنے اختیار کئے۔ پس ایسی حالت میں غلطی کو محال کہنا انصاف کے خلاف ہے۔ چنانچہ مولوی حشمت علی منکر حدیث اس بات کے قائل ہیں کہ رمضان کے صرف تین روزے ہیں

اور اس بات کو وہ قطعی اور اس کے غلط ہونے کو غیر ممکن سمجھتے ہیں حالانکہ یہ امر باتفاق اہلِ قرآن باطل ہے پس ایسی حالت میں غلطی کو محال سمجھنا باعث تعجب و حیرت ہے۔

قولھو "احادیث کے مسائل وغیرہا بہت سے قرآن کے خلاف ہیں"

اقول: یہ اعتراض ان کا غلط فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ یہ پہلے خوب اچھی طرح بیان ہو چکا ہے کہ ہمارا فہم و تدبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم کے برابر نہیں ہو سکتا پس یہ ضروری نہیں کہ ہم آپ کے بیان فرمودہ مسائل کو قرآن سے ثابت کر سکیں۔ لہٰذا جو مسئلہ ہم کو قرآن کریم میں نظر نہ آوے یا بظاہر قرآن مجید کے خلاف معلوم ہو تو اس کو اپنے فہم و تدبر پر اعتماد کر کے مخالف قرآن کہدینا سخت غلطی ہے۔ پس جو مسائل ہم کو عادل و ثقہ راویوں سے پہنچیں گے اگرچہ وہ بالفرض بظاہر قرآن کریم کے موافق نہ معلوم ہوں ہم کو بلاچون و چرا اپنے فہم و تدبر کے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے تسلیم کرنے ہوں گے کما مر دلیلہ و تفصیلہ۔

قولھو: اہلحدیث وغیرہ نماز میں ایسے اذکار و ادعیہ پڑھتے ہیں جو کہ قرآن کریم میں مذکور نہیں اور اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ صرف قرآن پڑھنا چاہیئے۔ پس نماز و غیر نماز دونوں حالتوں میں قرآن کے علاوہ کوئی ذکر جائز نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ اِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کہدو کہ مجھے صرف اس شہر (مکہ) کے رب کی عبادت کا حکم ہوا ہے اور اس بات کا حکم ہوا کہ میں مسلمانوں میں سے ہو جاؤں اور صرف اس بات کا حکم ہوا ہے کہ قرآن کی تلاوت کروں"۔ یہاں جملہ اخیرہ مقصود پر صاف دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ قرآن مجید کے علاوہ کسی چیز کی تلاوت نہ کی جائے۔

اقول۔ ان اذکار کا پڑھنا جو کہ صراحتہً قرآن میں مذکور نہیں ہرگز قرآن کے خلاف نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کے موافق ہے اس لئے کہ وہ تعلیم محمدی سے ثابت ہیں اور تعلیم محمدی عین اتباع قرآن ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اور آیہ مذکورہ میں أتلو کے معنے اتبع کے لینے مناسب ہیں اور یہ لغت عرب کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ایک ہے تَلَا يَتْلُو تُلُوًّا اور دوسرا ہے تَلَا يَتْلُو تِلَاوَةً دونوں کے معنے میں فرق ہے دوسرے کے معنے تلاوت کے ہیں۔ اور اوّل

کے معنی اتباع کے اور پیچھے لگنے کے ہیں جیسا کہ فرمایا: وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا۔ اور چاند کی قسم جب وہ سورج کے پیچھے آتا ہے (سورہ والشمس پ۳۰) پس وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْآنَ سے وان اتبع القرآن کے معنی متصور ہوں گے اور اس سے ادعیہ غیر قرآنیہ کا عدم جواز ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور اگر آیہ مذکورہ میں تلاوت کے ہی معنی لئے جاویں تب بھی اس کا یہ مطلب ہو گا کہ قرآن لوگوں کو پڑھ کر سناؤں یعنی تبلیغ کروں۔ جیسا کہ فرمایا يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ۔ لیکن تبلیغ قرآن کے ہمراہ تعلیم محمدیؐ بھی ضرور ہو گی جیسا کہ فرمایا وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ ورنہ قرآن کی تبلیغ ناقص ہو گی۔ کما مر مرارًا۔ اور اگر مان بھی لیا جاوے کہ یہاں پر تلاوت کے معنی خود پڑھنے کے ہیں تب بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پر انما سے حصر حقیقی مراد نہیں بلکہ حصر اضافی ہے یعنی صرف تلاوت قرآن سے یہ مقصود ہے کہ کتب متقدمہ انجیل و تورات وغیرہ کی تلاوت نہ ہو۔ یہ نہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسی دعا کریں کہ جو قرآن میں مذکور نہیں تو وہ ناجائز ہے۔ اس لئے کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام نے بھی ایسی دعائیں کی ہیں جو کہ انہیں اُن کی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بتلائی گئی تھیں چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ۔ اے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا، اور میری اولاد میں سے (بھی ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں۔) اے ہمارے رب! میری دعا قبول فرما، اے ہمارے رب! جس دن حساب و کتاب قائم ہو، تو مجھے اور میرے والدین کو اور (سب) ایمان والوں کو (اپنے فضل و کرم سے) بخش دے۔ (سورہ ابراہیم آیت ۴۱ ۴۰)

یہ دعا اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بتلائی گئی تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دعا میں اپنے والدین کی بخشش مانگی حالانکہ اُن کے والدین کو بخشنا اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھا اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے نبی کو ایک دعا سکھا دے اور خود ہی اس کو نامنظور و نامقبول قرار دے۔ اگر خود اللہ تعالیٰ اس دعا کو تعلیم فرماتا تو اُس کو پھر ہرگز مردود نہ فرماتا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی نہیں ہے۔ اگر کہا جاوے کہ "یہ دعا" اسی واسطے قبول نہیں

ہوئی کہ اللہ تعالےٰ کی بتلائی ہوئی نہ تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے نامقبول ہونیکی یہ وجہ نہیں کہ یہ دُعا اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی نہ تھی بلکہ اس وجہ سے نامنظور ہوئی کہ اللہ تعالیٰ مشرک کو نہیں بخشتا اور ان کے والدین مشرک تھے۔ ذرا غور کیجئے کہ یہ دُعا فی نفسہ اللہ تعالیٰ کو ایسی پسند آئی کہ اس کو قرآن کریم میں ذکر فرمایا جو اس کو پڑھے اُس کو درجات حاصل ہونگے۔ لیکن جس کے والدین مشرک مرجاویں اُس کے لئے اب بھی یہ دُعا پڑھنی جائز نہیں اور جس طرح ابراہیم علیہ السلام سے یہ دعا قبول نہ ہوئی اسی طرح اس سے بھی نہ ہوگی پس ثابت ہوا کہ اس دُعا کا مقبول نہ ہونا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے تعلیم نہ کی گئی تھی بلکہ اس وجہ سے تھا کہ ان کے والدین بحالت شرک دنیا سے فوت ہوئے اور جو بحالت شرک دنیا سے فوت ہوجاوے اُس کے لئے استغفار جائز نہیں جیسا کہ فرمایا اللہ تعالےٰ نے سورہ توبہ میں، مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ (الآیہ) یعنی پیغمبر اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، سزاوار نہیں کہ مشرکوں کیلئے دعا مانگیں، اگرچہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ یہ بات ان پر کھل چکی کہ وہ دوزخی ہیں، اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کرنا، محض ایک وعدہ کی وجہ سے تھا، جو اس نے اپنے باپ سے کیا تھا، پھر جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ وہ دشمن خدا ہے تو وہ باپ سے بے تعلق ہوگیا، (سورہ توبہ ۱۱۴) پ ۱۱)

اگر کہا جاوے کہ ادعیہ غیر قرآنیہ نماز میں جائز نہیں غیر نماز میں جائز ہیں کیونکہ نماز عبادت ہے اور عبادت میں بشر کا کلام شامل نہ ہونا چاہیئے" تو کہا جاوے گا کہ خود دعا ہی عبادت ہے، پس جب وہ کلام بشر ہونے کی حالت میں جائز ہے تو اب یہ کہنا کہ نماز میں جائز نہیں غیر نماز میں جائز ہے۔ محض بے ثبوت و تخصیص بلا مخصص ہے۔

قولہم: وضو میں عمامہ اور موزے پر مسح کرنا قرآن کے خلاف ہے کیونکہ قرآن سے پاؤں دھونا اور سر کا بغیر عمامہ کے مسح کرنا ثابت ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولیا کرو، اور اپنے سروں کا مسح کرلیا کرو، اور ٹخنوں

تک اپنے پاؤں (بھی دھولیا کرو) (سورہ المائدہ (٦، پ٦) ۔

اقول : سر پر مسح کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ برہنہ سر پر مسح کیا جاوے، دوسرے یہ کہ غیر برہنہ سر پر مسح کیا جاوے دونوں صورتوں میں سر کا مسح بولا جاوے گا۔ جیسے کوئی شخص ایسے آدمی کو چھو کر جو لباس میں ہے یہ کہے کہ میں نے فلاں شخص کے بدن کو چھو دیا تو اس شخص کے اس کلام کو صحیح سمجھا جاوے گا۔ حالانکہ اس نے درحقیقت بدن کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ اس کے کپڑے کو ہاتھ لگایا ہے۔ اب یہ سمجھنے کے بعد کہ سر کے مسح میں خواہ سر برہنہ ہو یا غیر برہنہ دونوں صورتیں داخل ہیں اس بات کی ضرورت معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ اس بارہ میں کیا تعلیم فرمایا ہے۔ سو واضح ہو کہ آپ سے مسح کی دو صورتیں ثابت ہیں ایک یہ کہ جب سر برہنہ ہو اس وقت پورے سر کا مسح کیا جاوے اور جب سر پر عمامہ ہو تو اس وقت پیشانی اور عمامہ پر مسح ہووے اور موزوں پر مسح کرنے کی بابت یہ ہے کہ لفظ ارجلکم میں دو قراءتیں ہیں ایک قرأت یہ ہے کہ اس کو منصوب پڑھا جاوے یعنی وجوھکم کا معطوف بنایا جاوے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ پاؤں کو دھولو۔ دوسری قرأت یہ ہے کہ ارجل کو مجرور پڑھا جاوے یعنی رءوسکم کا معطوف بنایا جاوے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اپنے پاؤں کا مسح کرو۔ یہاں پر دونوں مسئلے یعنی پاؤں کا دھونا اور مسح کرنا قرآن سے ثابت ہوگئے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ کس حالت میں دھویا جاوے اور کس حالت میں مسح کیا جاوے۔ اس لئے اب ضرورت ہوئی تعلیم محمدی کی بحکم وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۔ سو واضح ہو کہ آپ نے اس بارہ میں یہ تعلیم فرمایا ہے کہ جب انسان برہنہ پا ہووے تو پاؤں کو دھووے اور جب موزے پہنے ہووے ہو تو مسح کرے۔ یہاں پر سوتی اور غیر سوتی موزے کی بحث کا محل نہیں ہے اس لئے ہم اس کو کسی دوسرے موقع کے لئے چھوڑتے ہیں۔ ہر دو قرأت ہائے مذکورہ کا انکار محض سینہ زوری ہے جبکہ دنیا میں دونوں قرأتیں شائع ہیں۔

مولوی عبداللہ صاحب نے جبکہ حدیث کا پورے طور سے انکار نہیں کیا تھا مسح موزہ کو اسی آیۂ مذکورہ کے اخیر حصہ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ ۔ یعنی اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی ڈالے۔ (سورہ مائدہ (٦) پ٦)۔ سے ثابت کیا تھا۔ میری ناقص فہم میں بھی یہ استدلال ممکن ہے بایں طور کہ اس کے ہمراہ تعلیم نبوی کو لے لیا جاوے اور

یہ خیال کیا جاوے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مسح موزہ نکالا ہوگا اس لئے کہ اس میں رفع حرج ہے۔ بہرحال ثبوت مسح موزہ خواہ آیت کے اس ٹکڑے سے ہو یا اس حصہ سے ہو جو اُوپر گذرا یا دونوں سے ہو ہمارا مقصود یہ ہے کہ حدیث مسح قرآن کے خلاف نہیں ہے۔

قولہم : نماز جوتہ پہنکر قرآن مجید کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ موسیٰ علیہ السلام کو فرماتا ہے فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى۔ یعنی اپنی جوتیاں نکالدو اس لئے کہ تم پاک جنگل میں ہو جب اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم فرمایا کہ اپنے نعلین کو نکال دو۔ پس جب وادی مقدس میں ان کے نکالنے کا حکم ہوا تو پھر ان کو پہن کر نماز ادا کرنا یا مسجد میں جانا کیسے درست ہوسکتا ہے۔

اقول : اللہ تعالےٰ نے جو موسیٰ علیہ السلام کو نعلین نکالنے کا حکم فرمایا اُس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ تم پاک جنگل میں ہو۔ اس سے اشارہ پایا گیا اس امر کی طرف کہ موسیٰ علیہ السلام کی نعلین پاک نہیں تھیں اور پاک جگہ میں ناپاک چیز نہ ہونی چاہیئے اسلئے نکالدینے کا حکم فرمایا گیا۔ بعض روایات سے بھی یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نعلین پاک نہیں تھیں۔ اگر یہ مطلب نہ لیا جاوے گا تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ تم پاک جنگل میں ہو لہٰذا اپنی پاک نعلین کو الگ کردو۔ اور پاک چیز کو پاک جگہ سے الگ کرنا ایک مہمل بات ہے۔ پس ہم کو اس لئے وہی مطلب لینا ہوگا جس کی شہادت روایات سے ہوتی ہے۔ علاوہ بریں نعلین کا نکالنا وادی مقدس سے خاص ہے یا یہ کہ جو جگہ پاک ہو وہاں نعلین کو نکال دینا چاہیئے اگر یہ مطلب ہوگا تو لازم آوے گا کہ جہاں آبادی وجنگل وغیرہ میں پاک جگہ نظر آوے وہاں نعلین کو نکالا جاوے اور جہاں ناپاک جگہ معلوم ہووے وہاں نعلین کو پہن لیا جاوے اور یہ بڑی دشوار بات ہے۔ وَاللَّازِمُ بَاطِلٌ فَالْمَلْزُوْمُ مِثْلُهُ۔ اگر کہا جاوے کہ پاک جگہ میں بحالت نماز نعلین کو نکالا جاوے اور غیر حالت نماز میں نکالنے کی ضرورت نہیں ہے تو کہا جائے گا کہ نماز کی قید لگانی محض بلا دلیل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے تو نعلین نکالنے کی صرف یہ وجہ فرمائی کہ تم وادی مقدس میں ہو پس اس سے صرف اسی قدر ثابت ہوگا کہ وادی مقدس میں جوتیاں نہ پہنی جاویں۔ علاوہ اس کے جب خوف کی حالت میں چلتے پھرتے اور سواری پر نماز ادا کی جاوے گی تو کیا جوتیوں کو پھینک دیا جاوے گا ؟ حالت خوف میں پیادہ اور سوار کے لئے نماز

پڑھنے کی یہ دلیل ہے قَالَ اللہُ تعالیٰ : فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا - یعنی اگر تمہیں دشمن کا) خوف ہو تو (نماز ادا کرو) پیدل یا سواری پر، (جس طرح بن پڑے)۔

قولهٗ : لفظ "اللہ اکبر" میں شرک کے معنی (نعوذ باللہ) پائے جاتے ہیں۔ تشریح اُس کی یہ ہے کہ اللہ جامع جمیع صفات ہے اور جب اس کے ساتھ لفظ اکبر ملایا گیا تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ جمیع صفات میں اکبر ہے اور جمیع صفات میں سے الوہیت بھی ہے۔ اور اکبر اسم تفضیل ہے اور اللہ مُفَضَّل اور ماسوا اللہ مُفَضَّل علیہ[1] مُفَضَّل اور مُفَضَّل علیہ میں اصل صفت میں مشارکت ہوتی ہے جس میں کہ تفضیل دی گئی ہے۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ وہ صفات جو اللہ تعالیٰ میں بالکمال ہیں مخلوق میں بالنقصان ہیں۔ اس سے لازم آیا کہ جس طرح خالقیت و رازقیت اللہ تعالیٰ میں بالکمال اور مخلوق میں بالنقصان ہے اسی طرح الوہیت بھی اللہ تعالیٰ میں کامل ہے اور مخلوق میں ناقص ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ معبود اکبر ہے اور جو ماسوا اللہ معبود مانے جاتے ہیں وہ معبود اصغر ہیں۔ پس اس سے عقائد مشرکین کی صحت ثابت ہوتی ہے کما لا یخفیٰ۔

اقول : اس کا جواب بچند وجوہ ہے۔ اول یہ کہ اکبر میں تفضیل کے معنی نہیں ہیں جیسا کہ کلام عرب میں مشہور و معروف ہے اور قرآن کریم میں بھی بعض مقامات میں صیغہ اسم تفضیل کا استعمال کیا گیا اور تفضیل کے معنی مراد نہیں لئے گئے۔ قال اللہ تعالیٰ وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ یہاں پر آیہ مذکورہ میں اَهْوَنُ کے تفضیلی معنی نہیں بلکہ یہ هَيِّنٌ کے معنی میں ہے۔ پس آیہ کریمہ کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ وہ ذات ہے، جو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ پیدا کرے گا اور دوبارہ پیدا کرنا اُس پر آسان ہے۔ اگر یہ معنی کیا جاویں کہ دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ پہلی بار پیدا کرنا اس سے کم آسان ہے۔ وَهُوَ بَاطِلٌ كَمَا لَا يَخْفٰی۔ پس ثابت ہوا کہ اسمیں تفضیل کے معنی لینے ممکن نہیں۔ تفسیر فتح البیان جلد ۷ میں مذکور ہے۔ قال ابو عبید من جعل اھون عبارۃ عن تفضیل شئ علی شئ فقوله مردود بقوله وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا و بقوله وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ

---

[1] مُفَضَّل یعنی جس کو فضیلت دی گئی، یعنی اللہ تعالیٰ مُفَضَّل علیہ جس پر فضیلت دی جائے یعنی تمام مخلوق۔

الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ والعرب تحمل افعل علیٰ فاعل کثیرا کما فی قول الفرزدق ؎
ان الذی سمک السماء بنی لنا بیتا دعائمہ اعز واطول - ای عزیزۃ طویلۃ
وانشد احمد بن یحییٰ ثعلب علیٰ ذلک ؎ تمنّی رجال ان اموت وان امت !
فتلک سبیل لست فیھا باوحد -

یعنی مشہور امام لغت ابوعبید نے کہا ہے کہ جس نے "اَھْوَنُ" کے معنٰی یہ لیئے ہیں بعض کو بعض پر فضیلت ہے یعنی دوبارہ پیدا کرنا پہلی بار پیدا کرنے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے تو یہ قول مردود ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے، اور "یہ اللہ تعالےٰ پر آسان ہے"
سورہ حج آیت (۲۰)

اور ارشاد ہے آسمان وزمین کی حفاظت اس (اللہ تعالیٰ) کو تھکاتی نہیں ہے (آیۃ الکرسی، سورہ بقرہ (۲۵۵) پ۳) اہل عرب اَفعل، فاعل کے معنٰی میں لیتے ہیں جیساکہ فرزدق شاعر نے کہا ہے جس (اللہ تعالےٰ) نے آسمان بلند کیا ہے اس نے ہمارے لئے گھر بنایا ہے جس کے ستون مضبوط اور طویل ہیں، ثعلب احمد بن یحییٰ نے شعر بطور دلیل پیش کیا ہے، لوگ میری موت کی تمنا کرتے ہیں، اگر میں مرجاؤں (تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، یہ وہ راستہ ہے جس میں، مَیں اکیلا نہیں ہوں - ای بواحد وکقولھم اَللّٰہُ اَکْبَرُ ای کَبِیْر - اور سورۃ ہود میں اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کے قصہ میں حضرت لوط علیہ السلام کا قول نقل فرمایا ہے - ھٰؤُلَاءِ بَنَاتِیْ ھُنَّ اَطْھَرُ لَکُمْ - یعنی اے میری قوم یہ میری بیٹیاں موجود ہیں وہ تمہارے لئے پاک اور ستھری ہیں - مطلب یہ ہے کہ تم لڑکوں کی طرف بدکاری کا ارادہ مت کرو یہ میری بیٹیاں یعنی اُمت کی عورتیں موجود ہیں ان سے نکاح کرلو - کیونکہ نبی ساری قوم کے لئے بجائے باپ کے ہے اور یہ قول کہ اس سے لوط علیہ السلام کی صلبی بیٹیاں مراد ہیں صحیح نہیں ہوسکتا - اوّلاً تو اس وجہ سے لوط علیہ السلام کی دو تین بیٹیاں یا اس سے زائد کافی نہیں ہوسکتیں - ثانیاً یہ کہ فساق فجار سے یہ کہنا کہ تمہارے لئے میری بیٹیاں موجود ہیں، عام مومنین سے بھی بعید ہے - چہ جائیکہ انبیاء ایسی بات فرمادیں - علاوہ بریں یہاں پر مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ لڑکوں میں ایسے کام کے لئے طہارت نہیں بلکہ عورتیں ہی اس کام کے لئے طاہرہ ہیں - یہ مقصود یہاں پر ہرگز نہیں ہے کہ میری بیٹیاں دیگر عورتوں کی نسبت زیادہ پاک ہیں -

کیونکہ مقصود لڑکوں سے طہارت میں مقابلہ کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں تفضیل کے معنی نہیں ہوسکتے ورنہ لازم آوے گا کہ لڑکوں میں بھی جو کہ مُفَضَّل علیہ ہیں ایسے کام کے لئے کسی قدر طہارت ہے نعوذ باللہ۔

آیۂ مذکور کے تحت میں تفسیر فتح البیان میں لکھا ہے وَلَیْسَ فِیْ صِیْغَۃِ اَطْھَرُ دَلَالَۃٌ عَلَی التَّفْضِیْلِ بَلْ ھِیَ مِثْلُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور سورۃ یوسف میں ہے قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ اس میں بھی لفظ اَحَبُّ کے معنی تفضیل کے نہیں ہوسکتے ورنہ یوسف علیہ السلام کے اس قول کے یہ معنی ہوجاوینگے کہ قیدخانہ مجھ کو زیادہ محبوب ہے اور جس بڑے کام کے لئے عورتیں مجھ کو بلاتی ہیں وہ کم محبوب ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ عورتوں کا بدکاری کے لئے بلانا کسی مومن کو بھی کچھ محبوب نہیں ہوسکتا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تو ذکر کیا ہے۔ اور پارہ سیقول میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَبُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ اس میں بھی لفظ احق اسم تفضیل کا صیغہ ہے لیکن اس کے معنی تفضیل کے نہیں ہوسکتے[1] اور سورہ احزاب میں ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ اور سورہ ملک میں مذکور ہے۔ اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْھِہٖٓ اَھْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا۔ اور سورہ انعام میں ہے اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ آیات مذکورہ میں بھی اَطْھَرُ و اَھْدٰی و اَعْلَمُ کے معنی تفضیلی نہیں ہوسکتے۔ وغیر ذلک من الامثلۃ۔

اگر کہا جاوے کہ جب اکبر کے معنی تفضیل کے نہیں ہیں تو پھر اس لفظ کو کیوں استعمال کیا گیا بجائے اس کے کبیر کیوں نہیں کہا گیا۔ تو جواباً کہا جاوے گا یہ استعمال بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے جیسا کہ اَھْوَنُ و اَطْھَرُ وغیرہ میں اگرچہ تفضیلی معنی نہیں ہیں لیکن اس میں بھی

---

[1] مثلاً فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اَیْ حَقِیْقٌ۔ یعنی دونوں گروہوں میں سے کون امن کا سزاوار رحق دار) ہے۔ سورہ الانعام آیت (۸۱)۔ اگر یہاں یہ ترجمہ کیا جائے کہ دونوں فریق میں سے کون زیادہ امن کے لائق ہے، تو اس سے لازم آئیگا کہ مومن اور کافر دونوں فریق امن کے سزاوار ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ مومن زیادہ امن کے مستحق ہیں، یہ مفہوم غلط ہے جیسا کہ دوسری بیت میں ارشاد ہے۔ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ، یہی لوگ ہیں (مومن) جن کیلئے ہی امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ سورہ الانعام آیت (۸۲) حاشیہ من ابن المؤلف رح۔

کچھ فائدہ ضرور ہے ورنہ اللہ تعالےٰ کے کلام میں بھی شبہ پیدا ہوگا کہ بجائے اہون واظہر کے ہین اور طاہر کیوں مستعمل نہیں ہوا۔ اگر کہا جاوے کہ لفظ اکبر کا استعمال قرآن کریم میں تفضیلی معنی سے خالی ہو کر نہیں ہوا اور جب تک اکبر کا خالی از تفضیل مستعمل ہونا قرآن سے ثابت نہ ہو مدعا ثابت نہیں ہو سکتا تو کہا جائے گا کہ جب مطلق اسم تفضیل کا اس طرح مستعمل ہونا قرآن کریم ولغت سے معلوم ہوگیا تو ہمارا مدعا ثابت ہو گیا۔ یہ کہنا کہ غیر اکبر میں غیر تفضیلی معنی جائز ہیں اور اکبر میں جائز نہیں محض بے دلیل اور علمِ نحو سے بے خبری ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں پر مفضل ومفضل علیہ میں مشارکت نفسِ محامد ومحاسن میں ہے لیکن مخلوق کے اندر محامد ومحاسن بالنقصان ہیں اور اللہ تعالےٰ میں بالکمال ہیں۔ وَہٰذَا دَقِیْقٌ فَافْہَمْ وَتَاَمَّلْ وَلَا تَعْجَلْ بِالرَّدِّ وَالْاِنْکَارِ۔

تیسرا جواب معنی تفضیلی کی تقدیر پر یہ ہے کہ مفضل اور مفضل علیہ میں مشارکت بعض صفات میں ہے اور بعض صفات مسکوت عنہ ہیں پس مشارکت بلحاظ مجموعہ کے ہوگی نہ بلحاظ ہر ہر فرد کے۔ اس قسم کا استعمال کہ حکم باعتبار ہر ہر فرد کے نہ ہو بلکہ باعتبار مجموعہ کے ہو قرآن مجید میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ قال اللہ تعالےٰ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ۔ یعنی اے گروہ جنوں اور آدمیوں کے کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے آیہ مذکورہ میں حقیقی معنے کے لحاظ سے یہ مطلب ہوا کہ تمام جنوں پر انہی جنوں میں سے رسول آئے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جن بھی ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اُمت اور آپ کے ماننے والے ہیں پس یہاں مِنْکُمْ میں خطاب جنوں اور آدمیوں کو باعتبار مجموعہ کے ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ انس وجن کے ہر ہر فرد کی طرف اُنہی کی جنس میں سے نبی مبعوث ہوا۔ اور فرمایا اللہ تعالےٰ نے سورہ رحمٰن میں یَخْرُجُ مِنْہُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ۔ یعنی دونوں دریاؤں (میٹھے اور کھاری) میں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو دریا سے موتی نکلتا ہے حالانکہ صرف کھاری سے نکلتا ہے۔ اور فرمایا وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْہِنَّ نُوْرًا۔ اس کا مطلب ظاہری یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ساتوں آسمانوں میں چاند کو روشن کر دیا۔ حالانکہ چاند صرف ایک آسمان میں ہے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ قمر سب آسمانوں میں ہے۔ پس یہاں بھی اشارہ سب آسمانوں کی طرف باعتبار مجموعہ کے ہے۔

قولہ: اگر مان لیا جاوے کہ اللہ اکبر میں صحیح معنی پائے جاتے ہیں تب بھی اس

کا پڑھنا درست نہیں کیونکہ اس کا ثبوت قرآن مجید سے نہیں ہے اور سُبحان رَبِّیَ الْعَظِیم وسُبحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ وغیرہ کی بھی یہی کیفیت ہے اس لئے کہ وہ بھی قرآن مجید سے ثابت نہیں ہیں۔ ان اذکار کو قرآنی اذکار پر ترجیح دینا ناجائز ہے۔

اقول: اذکار مذکورہ قرآن کریم سے ثابت ہیں چنانچہ اللہ اکبر آیہ کریمہ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا سے ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی خوب زیادہ بڑائی کرو اس میں زیادتی کے معنی دو وجہ سے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کبّر باب تفعیل سے ہے دوسرے یہ کہ اس کے ہمراہ مفعول مطلق ذکر کیا گیا پس اسمیں زیادتی کے معنی دو طرح سے پائے گئے۔ اس کی تعمیل اس طرح سے ہوسکتی ہے کہ ایک تو بار بار اللہ کی بڑائی بیان کی جاوے۔ دوسرے یہ کہ اس میں تفضیل یا مبالغہ کا صیغہ بھی استعمال کیا جاوے۔ چنانچہ اسی کے موافق عمل درآمد ہوا تکبیر میں لفظ اکبر جو کہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے استعمال کیا گیا۔ اگر کہا جاوے کہ جب اکبر میں تفضیل کے معنی نہیں مانے جائیں گے تو اس صورت میں قول مذکور درست نہ ہوگا۔ تو کہا جاوے گا کہ اس تقدیر پر بھی صیغہ تفضیل کے استعمال میں کچھ فائدہ ضرور ہے کما مر۔ اسی طرح سُبحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیم آیہ کریمہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ سے نکالا گیا ہے اور سُبحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ آیہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى سے مستنبط ہوا ہے۔ جب آیہ کریمہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی تعمیل رکوع میں کرو اور جب آیہ کریمہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى نازل ہوئی تو فرمایا کہ اس کی تعمیل سجدہ میں کرو۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ رکوع میں انسان کی ذلت کی حالت ہوتی ہے اس وقت اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تصور چاہیئے کیونکہ صغر اور عظم ایک دوسرے کے مقابل ہیں پس رکوع میں سبحان ربی العظیم کہہ کر اپنی عاجزی اور صغر کا خیال کرکے اللہ تعالےٰ کی عظمت کو یاد کرنا بہت ہی مناسب ہے، اور سجدہ میں انسان کی حالت سفل کی ہوتی ہے اُس وقت اللہ عزوجل کے علو کا تصور چاہیئے کیونکہ سفل (پستی) اور علو (بلندی)، دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہیں پس سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کہہ کر اللہ عزوجل کے علو اور بلندی کو یاد کرنا عقلاً بہت ہی مناسب ہے اسی طرح رکوع وسجدہ میں سُبحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي بھی پڑھنا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور یہ دعا آیہ کریمہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (یعنی پس اپنے رب کی حمد و ثنا کیجئے اور اس سے مغفرت طلب کیجئے) کی تعمیل ہے۔ اس آیت میں تسبیح اور حمد اور بخشش مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے سو یہ تینوں باتیں اس دعا میں موجود ہیں جس کو آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم رکوع وسجدہ میں بکثرت پڑھتے تھے۔

اور اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم فرمان باری فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ (سورۃ النحل آیت (۹۸) سے نکالا گیا اور چونکہ بعض جگہ قرآن مجید میں اللہ پاک کا اس طرح بھی ارشاد ہے فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ سورہ حم السجدۃ آیت (۳۶) اس لئے معلّم برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم بھی تعلیم فرمایا ہے کیونکہ پورے طور سے تعمیل جب بھی ہوسکتی ہے جب تعمیل میں وہ صیغے اور الفاظ استعمال کئے جاویں جن کی طرف تعلیم میں اشارہ یا تصریح موجود ہو۔ پس اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ کی تعمیل کامل طور سے نہیں ہوگی اگر اس کی تعمیل میں اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ کہا جائے گا کیونکہ لفظ رجیم وغیرہ جو کہ آیت میں بتلایا گیا تھا اسمیں مذکور نہیں۔ اس سے یہ ہرگز خیال نہ کیا جاوے کہ ہم آیہ رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ کے پڑھنے کو منع کرتے ہیں۔ بلکہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ جس جگہ اعوذ باللہ کی تعلیم دی گئی ہے وہاں وہی مناسب ہے حسب ارشاد باری وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ علاوہ بریں آیت رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (سورہ المومنون آیت (۹۸) خود قرآن ہے اور قرآن پڑھنے سے پہلے استعاذہ باللہ من الشیطان الرجیم ہونا چاہیئے جیسا کہ ارشاد ہے فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ پس آیہ رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ پڑھنے سے پہلے حسب تعلیم محمدی اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھنا چاہیئے ورنہ قراۃ قرآن بلا استعاذہ لازم آوے گی۔

اگر ہم بعض اذکار کو قرآن سے ثابت نہ کرسکیں تو یہ ہمارے تدبر وفہم کا قصور ہے۔ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم پر اعتماد کرنا ہوگا جن کو اللہ پاک نے معلّم بنا کر بھیجا اور جن کا اللہ پاک نے سینہ کھول دیا۔ کما قال تعالٰے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔

قولھم : عذاب قبر قرآن سے ثابت نہیں لہٰذا جو احادیث اس بارہ میں بیان کی جاتی ہیں وہ سب موضوع ہیں. قرآن سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ روح وجسم سب فنا ہوجاتا ہے قَالَ اللّٰہُ تعالٰی کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔

اقول : عذاب قبر قرآن کریم سے بخوبی ثابت ہے قال اللہ تعالٰی : وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْھَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ یعنی فرعونیوں کو آگ پر پیش کیا جا رہا ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی اُس دن حکم ہوگا کہ فرعونیوں کو بہت سخت عذاب میں داخل کرو۔ یہاں پر زیادہ تفصیل کی حاجت نہیں مطلب بالکل صاف ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ آگ پر پیش ہونا تکلیف و عذاب سے خالی نہیں ہو سکتا اور یہ بھی اس سے ظاہر ہے کہ یہ پیش ہونا قیامت سے پہلے ہے کیونکہ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ جس دن قیامت برپا ہوگی اُس دن حکم ہوگا کہ فرعونیوں کو عذاب اشد میں داخل کرو۔ اور یہاں یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ارواح کفار عذاب بھگتنے کے لئے باقی رہتی ہیں۔ دوسری جگہ پر ارشاد باری سے یہ ثابت ہے، کہ ارواح مومنین ثواب و نعمتیں پانے کے لئے زندہ رہتی ہیں۔ جیسا کہ فرمایا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ۔ اور فرمایا : وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ یعنی جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے جاتے ہیں ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں، آیات مذکورہ بالا سے مخالفین کا یہ قاعدہ کلیہ کہ "ہر ایک انسان جسم اور روح کے ساتھ فنا ہوجاتا ہے" ٹوٹ گیا۔ کما لا یخفی۔

رؤیت باری تعالیٰ

قولہ : قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جو کہ احادیث میں مذکور ہے، قرآن کریم کے صریح خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ یعنی اللہ تعالیٰ کا ادراک نظریں نہیں کر سکتیں اور وہ سب نظروں کا ادراک کرتا ہے۔

اقول : آیہ مذکورہ سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ کی رؤیت نہیں ہو سکتی۔ اس سے تو صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں ہو سکتا سو اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کیونکہ شئی کے ادراک کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی حقیقت وکنہ ذات کا احاطہ کر لیا جاوے اور رؤیت کے یہ معنی نہیں ہیں۔ رؤیت کے معنی تو صرف دیکھنے کے ہیں۔ ادراک کی نفی سے رؤیت کی نفی لازم نہیں آتی جیسا کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورہ شعراء میں فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ یعنی جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب نے کہا کہ ہم پالئے گئے یعنی ہمارا ادراک ہو گیا۔ یہ اُس وقت کا قصہ ہے جب کہ فرعون بنی اسرائیل کے پیچھے ان کی گرفتاری کے لئے مع فوج و لشکر آ رہا تھا اور بنی اسرائیل اور فرعونیوں نے آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا موسیٰ نے اپنے ساتھیوں (بنی اسرائیل) کے اس گزارش کو سن کر فرمایا کَلَّا یعنی تمہارا ادراک واحاطہ نہیں ہوا۔ یہاں پہ رؤیت کی خبر تو خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے اُس سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا اور ادراک کا انکار موسیٰ علیہ السلام نے فرما دیا۔ پس ثابت ہوا کہ رؤیت اور ادراک میں تفاوت ہے۔ وَهُوَ الْمَطْلُوْبُ۔

دوسری آیت منکرین رؤیت باری تعالیٰ کی طرف سے یہ پیش کی جاتی ہے۔ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ الآیۃ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو جب کوہ طور پر اللہ کی رؤیت کا اشتیاق ہوا انہوں نے کہا اے میرے رب مجھے تو اپنی ذات پاک کو دکھلا دے اس پر اللہ نے فرمایا تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔ لیکن تم پہاڑ کی طرف نظر کرو اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو

تم بھی مجھے دیکھ لوگے" پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی کی تو پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے جب ہوش آیا تو کہنے لگے (اے اللہ) تو پاک ہے میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں سب سے پہلا مومن ہوں۔ اس سے معتزلہ وغیرہ اس طور پر استدلال کرتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے رؤیت باری تعالیٰ کی درخواست کی تو جواب میں ارشاد ہوا لَن تَرَانِي یعنی تو مجھ کو کبھی ہرگز نہ دیکھے گا نہ دُنیا میں نہ آخرت میں کیونکہ لَنْ تابید کے واسطے آتا ہے یعنی اس میں ہمیشگی کے معنی ہوتے ہیں تو اس میں نفی ہمیشہ (یعنی دونوں جہاں میں رؤیت) کی ہو گئی۔ علاوہ اس کے موسیٰ علیہ السلام نے بعد میں یہ عرض کیا کہ اے اللہ تو پاک ہے (اس سے کہ تو نظر آوے) اور تیری رؤیت کی (درخواست کرنے سے) میری توبہ ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ یہ آیت تو صاف طور پر ہمارے مدعا کی دلیل ہے نہ کہ خصم کی۔ اور لن کی بابت یہ کہنا کہ یہ تابید کے لئے ہے غلط ہے اللہ تعالیٰ یہود کے بارہ میں فرماتا ہے۔ ولن یتمنوہ ابدًا۔ یعنی یہود موت کی ہرگز تمنا نہیں کریں گے۔ یہاں پر تمنائے موت کی نفی صرف دنیا کے لئے ہے۔ اس لئے کہ آخرت میں وہ موت کی تمنا کریں گے جیسا کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا اور فرمایا يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ یعنی قیامت کے روز کفار مٹی ہونے اور زمین میں ملجانے کی آرزو کریں گے اور موسیٰ علیہ السلام کا یہ عرض کرنا کہ اے اللہ تو پاک ہے میں توبہ کرتا ہوں سو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی درخواست قبول نہ ہوئی تو وہ نہایت خائف ہو گئے اور توبہ کرنے لگے کہ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاوے کیونکہ میں نے سوال کر دیا جس کا قبول کرنا اُس کو ابھی منظور نہ تھا اور سوال بھی بغیر اسکے کہ اس سے اس کے متعلق اذن لیا جاوے کیا گیا۔ اگرچہ ظاہر میں یہ ایسی بڑی لغزش نہ تھی لیکن مقربین ذرا ذرا سی بات پر نہایت احتیاط کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرتے ہیں۔ اسی لئے موسیٰ علیہ السلام یہ بات معلوم کر کے کہ اللہ عزوجل کو دنیا میں اپنا دیدار کرانا منظور نہیں ڈر گئے اور اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کر کے توبہ دعاجزی ظاہر کرنے لگے۔ اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ رؤیت باری تعالیٰ محال ہے۔ کما لا یخفی علیٰ من لہ عقل سلیم۔ آیہ مذکورہ سے رؤیت کے محال ہونے کا ثبوت تو

درکنار اس سے تو بخوبی امکان رؤیت ہوتا ہے۔ بچند وجوہ:

وجہ اوّل یہ کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو اس بات کا علم نہ ہو کہ رؤیت باری تعالیٰ محال ہے اور اس کی درخواست کر بیٹھیں اور آجکل کے عوام معتزلہ و نیا چہرہ وغیرہ کو اس کے محال ہونے کا علم ہو جائے اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ موسیٰ علیہ السلام علم اور معرفت میں کم تھے ان مذکورین سے نعوذ باللہ۔ پس ثابت ہوا کہ رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُس کو محال نہ سمجھا۔

وجہ دوم۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رؤیت کو معلّق اور موقوف رکھا ہے استقرار جبل یعنی پہاڑ کا ٹھیرنا فی نفسہ ممکن ہے اور جو شئے امر ممکن پر موقوف ہو وہ بھی ممکن ہے پس ثابت ہوا کہ رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے۔

وجہ سوم۔ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کا ظہور اور تجلّی ہوئی تو پہاڑ کو اس کی تاب نہ ہوئی اور وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس کے ریزہ ریزہ ہو جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کے سامنے وہ چیز آئی جو کبھی نہ آئی تھی اور وہ چیز اس نے دیکھی جو کبھی نہ دیکھی تھی اور وہ چیز جو اس نے دیکھی تھی وہ باری تعالیٰ اور اس کے نور کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے جیسا کہ آیہ فلما تجلّی ربّہٗ سے ظاہر ہے۔ پس اس سے بھی رؤیت باری تعالیٰ کا امکان ثابت ہوا۔ اگر یہ کہا جاوے کہ پہاڑ میں قوت ادراکیہ نہیں ہے جو وہ دیکھ یا سُن یا بول سکے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہاڑوں وغیرہ کے بولنے اور تسبیح کرنے کا بیان جا بجا قرآن کریم میں بکثرت موجود ہے قال اللہ تعالیٰ۔ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ[1] وَقَالَ تَعَالٰى وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ[2] اور فرمایا يَا جِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ[3] اور فرمایا

---

[1] اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں جو کچھ آسمانوں میں اور زمینوں میں ہے[2] نہیں کوئی چیز مگر اللہ کی تعریف کے ساتھ تسبیح بیان کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے[3] اے پہاڑ اور پرندو جواب دو داؤد کے ساتھ (جبکہ وہ زبور کی تلاوت کریں)

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ (سورۃ انبیاء) اور فرمایا إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ (سورہ ص) اور فرمایا وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (رعد) اور فرمایا: يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ (النحل) آیات مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شجر و حجر وغیرہ میں بھی ایک قسم کی حیات و عقل وغیرہ ہے جس کی حقیقت اللہ تعالےٰ ہی کو معلوم ہے ورنہ ان کی تسبیح وغیرہ صحیح نہ ہوگی جبکہ ان کی تسبیح اور تاویب یعنی داؤد علیہ السلام کو جواب دینا معلوم ہوگیا جس سے ان کی گویائی اور سماعت دونوں ثابت ہوتی ہیں تو پھر ان کے اندر رؤیت کا ہونا کون سا تعجب خیز امر ہے۔ رؤیت باری تعالےٰ کا ثبوت قرآن مجید میں کئی جگہ ہے چنانچہ سورہ قیامہ میں فرمایا: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ یعنی قیامت کے روز بہت سے منہ تازگی والے اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہوں گے۔ یہاں پر معتزلہ وغیرہ کا یہ تاویل کرنا کہ اس سے مراد نعمتوں کا دیکھنا ہے غلط اور بلا دلیل ہے۔ ایسے ہی بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ "اس سے یہ مراد ہے کہ اہل جنت اللہ کی طرف نظر کریں گے یعنی غور کریں گے" یہ نہیں کہ وہ دیکھ لیں گے جیسے کہ انتیسواں چاند دیکھا جاتا ہے اور وہ نظر نہیں آتا،" بالکل لغو اور باطل ہے۔ کیونکہ اس سے اہل جنت کی ایک بڑی بھاری تمنا پوری ہونے سے محرومی ثابت ہوتی ہے اور یہ مردود و باطل ہے۔ اللہ تعالےٰ اہل جنت کی بابت فرماتا ہے: وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُوْنَ یعنی جنتی جو چاہیں گے وہ ان کو ملے گا۔

پس یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اہل جنت اللہ تعالےٰ کے دیدار کی آرزو کریں اور وہ پوری نہ ہو۔ کفار کے بارے میں فرمایا: كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ یعنی کفار کو اللہ پاک کا دیدار نصیب نہ ہوگا اور وہ خدا سے الگ حجاب میں ہوں گے۔

ؔلہ اور مسخر کیا ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو کہ خدا کی تسبیح بیان کریں۔

ؔلہ تحقیق ہم نے اس کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کیا کہ وہ شام اور صبح کو تسبیح کرتے تھے۔

ؔلہ اور جو آسمانوں اور زمین میں ہے سب چار و ناچار اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں اور صبح شام ان کے سائے بھی (اس کے آگے جھکتے ہیں)

ؔلہ مخلوقات کی ہر چیز کا سایہ اللہ کے آگے سجدہ کرتا ہوا داہنی طرف اور بائیں طرف کو ڈھلتا ہے اور (سب کے سب) اس کے آگے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں پر بھی یہ تاویل کرنا کہ" وہ خدا کی نعمتوں سے حجاب میں کر دیئے جائیں گے" لغو اور بے دلیل ہے۔

حدیث لَمْ یَکْذِبْ اِبْرَاہِیْمُ اِلَّا ثَلٰثَ کَذَبَاتٍ کی بحث

قولہ: حدیث میں مذکور ہے لَمْ یَکْذِبْ اِبْرَاہِیْمُ اِلَّا ثَلٰثَ کَذَبَاتٍ الحدیث یعنی ابراہیم سلام علیہ نے صرف تین جھوٹ بولے ہیں" یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو صدیق فرمایا تو وہ جھوٹ کس طرح بول سکتے ہیں"

اقول: حدیث مذکور قرآن کریم کے مخالف ہرگز نہیں۔ البتہ اس کے واسطے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ تفصیل اسکی یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تین جگہ تعریض و توریہ سے کام لیا۔ توریہ کے معنی یہ ہیں کہ ظاہر میں کلام کا جو مطلب معلوم ہوتا ہے وہ حقیقت میں مراد نہیں ہوتا بلکہ جو مطلب کہ باطن میں ہے اور غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے اس جگہ وہ مراد ہوتا ہے۔ اور چونکہ وہ ظاہر میں خلاف واقع معلوم ہوتا ہے اس لئے اسے مجازاً کذب کہا جا سکتا ہے اگرچہ وہ حقیقۃً ہرگز کذب نہیں ہے۔ پس اب سمجھ لینا چاہیئے کہ حدیث مذکور انہی معنی سے ہے۔

علاوہ اس کے یہ بات بھی ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبرؑ سے توریہ کا ہونا ایسا ہی بعید ہے جیسا کہ عام مومنین سے کذب۔ اور جس طرح عام مومنین کو بحالت مجبوری توریہ جائز ہے۔ تو جو حکم عام مومنین کے لئے کذب کا ہوا وہی حکم انبیاء کے لئے توریہ کا ہوگا۔ اس لئے حدیث مذکور میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توریہ کو کذب فرمایا گیا۔ اس کا حقیقۃً کذب ہونا مراد نہیں کما لا یخفی علی من لہٗ فھم سلیم و طبع مستقیم۔ اُن تین مواقع میں سے ایک وہ موقع ہے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت شکنی کی اور بڑے بُت کو چھوڑ دیا کما قال تعالیٰ فَجَعَلَھُمْ جُذٰذًا اِلَّا کَبِیْرًا لَّھُمْ۔ جب کفار نے ان سے پوچھا کہ اے ابراہیم کیا تم نے ہمارے بتوں کو توڑا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا بَلْ فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُمْ۔ اس کے ظاہر معنی تو

یہی ہیں کہ ان بتوں میں سے جو بڑا بُت ہے اس نے یہ کام کیا ہے یعنی اس نے ان سب بتوں کو توڑا ہے اور حقیقت میں یہ معنی مراد نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ میں نے ان بتوں کو توڑا ہے اور لفظ کبیر ہم اپنے لئے استعمال کیا کیونکہ انسان بمقابلہ اصنام کبیر ہے۔ اور ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کَبِیْرُھُمْ سے مراد وہی بڑا بت ہو اس لئے کہ وہ سبب ہوا تھا ان سب بتوں کے توڑنے کا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو غصہ بڑے بُت کو دیکھ کر بہ نسبت دوسرے بتوں کے بہت زیادہ آیا اور وہ اس وجہ سے بُتوں کے توڑنے پر آمادہ ہوگئے۔ مگر چونکہ ظاہر میں یہ مطلب بھی معلوم نہیں ہوتا اس لئے یہ بھی توریہ میں داخل ہے۔ دوسرا مقام توریہ کا وہ ہے جس کے بارہ میں اللہ تعالے فرماتا ہے۔ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو دیکھ کر یہ فرمایا کہ میں سقیم ہوں۔ تمہاری عید وغیرہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس کے ظاہر معنی یہی ہیں جو مذکورہ ہوئے اس لئے کفار ان کو بیمار سمجھ کر چھوڑ کر چلے گئے جیسا کہ فرمایا فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ اور دوسرے بعید معنے اس کے یہ ہیں کہ میں تمہارے کاموں میں شریک ہونے سے بیمار ہوں۔ یا یہ کہ اِنِّيْ سَقِيْمٌ کے معنی ہیں کہ میں عنقریب بیمار ہو جاؤں گا۔ جیسا کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ کے معنے ہیں کہ تم عنقریب مرنے والے ہو۔ اور ستاروں کو اس لئے دیکھا تاکہ وہ سمجھیں کہ اس نے اپنے سقم کا حال ستاروں سے معلوم کیا ہے جیسا کہ ان لوگوں کا دستور تھا۔ اس سے وہ یہ خیال کریں گے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے سقم کی بابت ٹھیک فرماتے ہیں: تیسرا موقع توریہ کا وہ ہے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی زوجہ سائرہ کو ظالم جابر بادشاہ کے خوف سے بہن کہہ دیا۔ ظاہر میں تو یہ خلاف واقع معلوم ہوتا ہے مگر باطن میں یہ صحیح ہے کیونکہ ایمان و اسلام کے اعتبار سے سب مومن آپس میں بھائی بہن ہیں۔ قَالَ اللہ تعالے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ اس کو بھی ظاہر اور تبادر الی الفہم نہ ہونے کی وجہ سے مجازاً اکذب فرمایا گیا۔

اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ بحث توریہ و کذب نہ آئے جو کہ ہم نے اوپر بیان کی ہے تو اس سے مختصر طور پر یہ سوال کیا جائے گا کہ انبیاء کو بحالت مجبوری حسب ارشاد باری اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔ کذب بولنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر

نہیں تو کیوں نہیں بحالیکہ قرآن کریم میں یہ مسئلہ موجود ہے اور اگر جائز ہے تو حدیث لم یکذب ابراہیم الا ثلث کذبات الخ پر بھی اعتراض کرنا لغو ہے کیونکہ ایک امر پہ عمل کرنے سے جو کہ قرآن کریم میں موجود ہے ہرگز صدیقیت میں فرق نہیں آسکتا۔ پس اس طرح سے بھی یہی ثابت ہوا کہ حدیث مذکور آیہ کریمہ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا کے خلاف نہیں وہو المطلوب۔

بحث بابت حدیث ملک الموت و موسیٰؑ

قولہ: حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کی آنکھ پھوڑ دی یہ بات ہماری عقل و فہم میں نہیں آتی۔ لہٰذا یہ ہرگز رسول سلامؐ علیہ کی حدیث نہیں بلکہ موضوع قصہ ہے۔

اقول: جو بات عقل و قیاس میں نہ آئے اس میں دخل دینا اور اُس کا انکار کرنا بھی عقل سے بعید ہے قال اللہ تعالےٰ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ ۔ یعنی جس بات کا یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اسی کو لگے جھٹلانے (سورہ یونس آیت ۳۹) یہ امر تو بخوبی قرآن کریم سے ثابت ہے کہ ملائکہ انسانوں کی صورت میں انبیاء علیہم السلام کے پاس آتے تھے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے اور مریم علیہا السلام کے قصہ میں جبرئیل علیہ السلام کی بابت ارشاد ہے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا[1] اور فرمایا وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا[2]۔ پس فرشتوں کا رجل اور بشر ہونا ثابت ہے تو ان کو کسی انسان سے مضرت پہنچنا کیا بعید ہے خاص کر نبی مقرب سے اور وہ بھی جبکہ بامر خداوندی ہو ہرگز خلاف قیاس نہیں۔ اگر ہم کو خلاف قیاس بھی معلوم ہو تب بھی اس کو تسلیم اور اپنے قیاس کو لغو تصور کرنا چاہیے۔ یہ بات ضرور ہے کہ ہر ایک انسان سے ایسا امر صادر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے

---

[1] تو وہ ایک پورے انسان کی شکل میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا،

[2] اور اگر ہم رسول کا مددگار کوئی فرشتہ بنانے تو اسکو بھی آدمی ہی کی (شکل) میں بناتے ۔

رسل و ملائکہ، کا محافظ ہے۔ مگر یہ امر فی نفسہٖ ممکن ہے کہ جب ملائکہ بصورت بشر آویں تو ان کو انسان سے مضرت پہنچ سکے جس طرح نور میں صدمہ پہنچنے سے انضغاط (انقباض) ممکن ہے۔ جیسے کہ جنوں کا حال ہے کہ باوجود اس قدر طاقت و قوت کے بعض اوقات جبکہ وہ کسی جانور وغیرہ کی صورت میں ہوتے ہیں تو انسان کی مار کھا لیتے ہیں۔ بعض اوقات انسان کے مارنے سے مر جاتے ہیں۔ یہ بات بعض لوگوں کے مشاہدہ میں آچکی ہے۔

وحی خفی کا ثبوت

اہل قرآن نے علاوہ قرآن کریم کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے کا انکار کیا ہے خواہ بواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔

اس کا ثبوت کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر علاوہ قرآن کے وحی نازل ہوئی بچند وجوہ ہے۔ وجہ اوّل یہ کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جو اعلیٰ درجہ کی صفات دیگر انبیاء میں پائی جاویں وہ صفات آپ میں نہ ہوں جیسے خدا سے ہم کلام ہونا اعلیٰ درجہ کی صفت ہے، اگر یہ آپ کے اندر نہ مانی جاویگی تو آپ دیگر انبیاء سے افضل نہیں ٹھہرینگے والمفروض خلافہ اور جب آپ کا اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونا ثابت ہوگا تو علاوہ قرآن مجید کے وحی کا ثبوت بھی اس سے ملجاوے گا کیونکہ قرآن کریم بواسطہ جبرئیل علیہ السلام نازل ہوا ہے بلاواسطہ ہم کلام ہونیکی صورت میں نازل نہیں ہوا۔ مولوی عبد اللہ صاحب چکڑالوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر انبیاء پر افضلیت کا انکار کیا ہے لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کے دلائل لکھے جاتے ہیں۔

دلیل اوّل۔ یہ مسلم امر ہے کہ علم ہر شے سے افضل ہے۔ جس کے پاس زیادہ علم ہوگا وہ افضل ہوگا اس سے جس کے پاس علم اس درجہ کا نہیں ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل ہوا جو کہ ایک بڑا بھاری علمی معجزہ ہے اور پچھلے انبیاء کو جو معجزات دیئے گئے وہ علمی نہ تھے جیسے عصائے موسیٰ و ید بیضاء و احیاء موتی و ابراء اکمہ و ابرص برائے عیسیٰ۔ یعنی حضرت موسیٰ کی لاٹھی، سفید چمکتا ہاتھ اور حضرت عیسیٰ کا مُردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرنا وغیرہ اور علمی معجزہ غیر علمی معجزہ

سے افضل ہے۔ پس ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل ہیں اس اعتبار سے کہ قرآن مجید آپ کو ایسا علمی معجزہ ملا جو کہ تمام معجزات سے اعلیٰ و افضل ہے۔

دلیل دوم۔ یہ کہ یہ معجزہ قیامت تک باقی رہنے والا ہے کوئی اس کو مٹا نہیں سکتا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ چنانچہ فرمایا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ اور پچھلے معجزات میں سے کوئی معجزہ باقی نہیں رہا کیونکہ وہ صرف ان انبیاء ہی کی ذات کے ساتھ تھے۔ بلکہ ان کی کوئی کتاب بھی صحیح سالم بلا تحریف کے باقی نہیں رہی اور نہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ پس وہ معجزات و کتب اس معجزہ کے برابر نہیں ہو سکتے جو کہ ہمیشہ رہنے والا ہے اور جس کی حفاظت کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ پس اس لحاظ و اعتبار سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت ثابت ہوئی۔

دلیل سوم۔ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کامل ملا جیسا کہ فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کامل غیر کامل سے افضل اور اعلیٰ ہوتا ہے اس لحاظ سے بھی آپ دیگر انبیاء سے افضل ہیں۔

دلیل چہارم۔ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں آپ پر نبوت ختم ہو چکی اب قیامت تک کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وہ جس پر نبوت ختم ہو جائے اور اس کے بعد کسی نبی کی ضرورت باقی نہ رہے افضل ہے اس نبی سے جس پر کہ نبوت ختم نہ ہو بلکہ اس کے بعد دوسرے نبی کی ضرورت ہو۔ کما لا یخفی علی من لہٗ عقل سلیم۔

دلیل پنجم۔ یہ کہ آپ کی اُمت سب اُمتوں سے زیادہ ہوگی اس لئے کہ جب آپ کی نبوت اور آپ کی لائی ہوئی کتاب قیامت تک رہیگی تو اُمت جس قدر زیادہ ہوگی وہ محتاج بیان نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس کے ماننے والے زیادہ ہوں وہ افضل ہے اس سے جس کے کہ اس قدر ماننے والے نہ ہوں۔

دلیل ششم۔ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہان کے انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے جیسا کہ فرمایا: قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا اور انبیائے سابقین صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے قال اللہ تعالیٰ: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ الخ البتہ تحقیق بھیجا ہم نے نوح کو طرف قوم اس کے۔ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ

هُودًا الخ اور بھیجا ہم نے طرف عاد کے ان کے بھائی ہود کو۔ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا الخ
اور طرف ثمود کے ان کے بھائی صالح کو ۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا وَرَسُوْلًا
اِلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اور موسیٰ علیہ السلام کی بابت فرمایا وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا
اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ اور البتہ تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ کو ساتھ
آیتوں اپنی کے یہ کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے طرف روشنی کے ۔ پس وہ نبی جو کہ
مبعوث ہوا تمام جہان کی طرف افضل ہے اس نبی سے جو کہ مبعوث ہو صرف ایک خاص قوم کی طرف۔ کما لا یخفی۔

دلیل ہفتم یہ کہ آپ جس طرح تمام انسانوں کی طرف بھیجے گئے ہیں اسی طرح تمام
جنوں کے بھی آپ ہی پیغمبر ہیں جیسا کہ فرمایا: وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ
الْقُرْاٰنَ ۔ اور یاد کرو جب پھیرا ہم نے تمہاری طرف ایک جماعت کو جنوں میں سے کان لگا
کر سنتے تھے قرآن کو۔ اور فرمایا قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا
کہہ دے کہ وحی کی گئی طرف میرے کہ تحقیق کان لگایا ایک جماعت نے جنوں میں سے پس کہا
انہوں نے کہ تحقیق ہم نے سنا قرآن عجب ۔ اور قرآن کریم میں جنوں کو مخاطب بھی کیا ہے
چنانچہ فرمایا سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۔ عنقریب
فارغ ہو دیں گے تمہارے لئے اے دو بھاری جماعتو! پس اپنے رب کی کونسی نعمتیں جھٹلاتے
ہو ۔ اس سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت ثابت ہوئی ۔

دلیل ہشتم ۔ یہ کہ جن و شیاطین ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے
آسمان کے پاس جا کر باتیں سننے سے روکے گئے جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے سورہ جن میں جنوں کا
کلام نقل فرمایا: وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّشُهُبًا
ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسکو سخت پہروں اور شہابوں سے بھرا ہوا پایا ۔ اور سورۃ
صافات میں فرمایا: لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا
وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۔ یہ
(شیاطین) ملاء اعلیٰ (فرشتوں) کی (باتوں کی) طرف کان بھی نہیں لگا سکتے اور ہر طرف سے
مارے اور دھکے دیتے جاتے ہیں اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے تاہم اگر کوئی (شیطان) کچھ
خبر لے اڑے تو ایک دھکتا ہوا شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے ۔

دلیل نہم ۔ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت تمام اُمتوں سے افضل ہے۔ قال

اللہ تعالیٰ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۔ پس جب آپ کے اتباع افضل اور بہتر ہوئے دیگر انبیاء کے اتباع سے تو آپ بلحاظ اتباع کے بھی افضل ہوئے انبیائے سابقین سے کیونکہ جب آپ کی امت خیر الامم ہے تو آپ خیر الانبیاء ہیں اس لئے کہ اتباع کی افضلیت سے متبوع کی افضلیت ثابت ہوتی ہے ۔ کما لا یخفی ۔

دلیل دہم ۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں سے عہد کر لیا کہ جب میرا عظیم الشان رسول آئے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی تائید و نصرت کرنی ہوگی ۔ اس پر سب نے پختہ اقرار کیا ۔ اللہ تعالیٰ نے اقرار لے کر یہ فرمایا کہ تم سب گواہ رہو اور میں بھی اس پر گواہ ہوں ۔ قال اللہ تعالیٰ : وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ کا تمام انبیاء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تھا اس لئے کہ آپ ہی وہ عظیم الشان رسول ہیں جو کہ سب انبیا کے بعد تشریف لائے ۔ اس عہد کے پورا ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی اس وقت تمام انبیاء علیہم السلام کی ارواح سے آپ کی ملاقات ہوئی سب نے خوشی سے آپ کی نبوت کا اقرار کیا اور مرحبا کہہ کر آپ کی حوصلہ افزائی اور تائید کی ۔ جس سے لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ کی تعمیل ثابت ہوتی ہے ۔ ایسے موقع پر جبکہ ایک شخص کے مخالف کثرت سے ہوں اس کی تسلی و ہمت افزائی کرنا ایک قسم کی مدد و نصرت کرنا ہے ۔
اس سے وہ شبہ اٹھ گیا جو کہ یہاں پیدا ہوتا تھا کہ انبیائے سابقین رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کس طرح کر سکتے ہیں ؟ اگر معراج والی صورت نہ تسلیم کی جاوے گی تو تاویلات بعیدہ کرنی پڑیں گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر انبیائے سابقین کے ایمان لانے اور مدد کرنے سے یہ مراد ہے کہ ان کی امت کے لوگ آپ پر ایمان لا گے اور آپ کی مدد کریں گے ۔ لہٰذا مناسب بلکہ ضروری ہے کہ معراج والی صورت اختیار کر کے معنے مذکور بالا تسلیم کیا جاوے تاکہ اس تاویل بعید کی حاجت واقع نہ ہووے ۔ تلک عشرۃ کاملۃ ۔ یہ دس دلیلیں آنحضرت کی افضلیت میں بیان ہوئیں ۔ اس دسویں دلیل سے معراج کا ثبوت بھی ہو گیا کما قال اللہ تعالیٰ سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ

بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا وَقَالَ تَعَالَى وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى ۔ پاک ہے (عجز و درماندگی کے عیب سے) وہ (ذات) جو لے گئی اپنے بندے (محمدؐ) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، جس کے ماحول کو ہم نے (بڑی) برکت دی، تاکہ ہم اسے اپنی (کچھ) نشانیاں دکھائیں۔ (۲) وہ آسمان کے بلند کنارے پر تھا، پھر وہ نزدیک ہوا اور جھک گیا۔) مفصل بحث معراج شریف کی علیحدہ لکھی جائے گی انشاءاللہ تعالیٰ۔

پس جبکہ دلائل مذکورہ سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں تو اس سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ آپ کے اندر اعلیٰ درجہ کی صفات تھیں جیسے اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونا وغیرہ جن سے بعض انبیائے سابقین موصوف تھے۔ اور قرآن کریم کے علاوہ وحی کا انکار کرنے کی صورت میں اس صفت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موصوف ہونے کا انکار لازم آئے گا۔ اور یہ بالکل غلط اور باطل ہے۔

وجہ دوم۔ اس بارے میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر علاوہ قرآن کے وحی نازل ہوئی۔ قولہ تعالیٰ إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ۔ یعنی (اے محمدؐ) جب تم ایمان والوں سے کہتے تھے کہ کیا تم کو کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات لوگوں سے اُسی وقت فرما دی تھی جبکہ یہ آیت نازل نہ ہوئی تھی جیسا کہ آیت مذکورہ سے ظاہر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو بذریعہ وحی خفی فرشتوں کے نزول کی بابت حال معلوم ہو گیا تھا۔

وجہ سوم۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ الخ یعنی (یاد کرو) جب اللہ تعالیٰ تم کو دو گروہوں میں سے ایک گروہ کے ملنے کا وعدہ فرماتا تھا اور تم چاہتے تھے کہ تم کو ایسا گروہ ملے جو ہتھیار والا نہ ہو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ پہلے بذریعہ وحی خفی امر مذکور کا وعدہ فرمایا تھا کیونکہ قرآن کریم میں اس وعدہ کا پتہ نہیں ملتا۔ کما لا یخفیٰ۔

وجہ چہارم یہ کہ پچھلے انبیاء پر علاوہ کتب منزلہ تورات، انجیل وغیرہ کے وحی نازل ہوئی جیسا کہ فرمایا: وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ اور فرمایا فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ وغیرھا من الایات -(۱) اور ہم نے وحی کی موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ اپنا عصا (لاٹھی) سمندر پر دے مارو -(۲) پھر ہم نے کہا مارو اپنا عصا پتھر پر۔ یہ وحی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو علاوہ توراۃ کے ہوئی تھی۔ اس لئے کہ توراۃ اس کے بہت عرصہ کے بعد نازل ہوئی۔ نیز وہ انبیاء جن پر کوئی مستقل کتاب نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ پچھلی کتابوں کے تابع رہے ان پر جو وحی نازل ہوئی وہ بھی علاوہ اس کتاب کے تھی جبکہ وہ تابع تھے در آنحالیکہ وہ سابق کتاب ان کے لئے کافی تھی۔ قال اللہ تعالےٰ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا الخ بے شک ہم (ہی) نے تورات نازل کی تھی جس میں ہدایت اور روشنی ہے (بنی اسرائیل کے) تمام نبی جو (اللہ تعالےٰ کے فرماں بردار (بندے) تھے، اسی کے مطابق (فیصلے کرتے تھے) یہودیوں کو حکم دیتے رہے۔ غرضکہ ایسی مثالیں بہت سی ملتی ہیں کہ انبیائے سابقین پر علاوہ کتب کے وحی نازل ہوئی۔ دیکھئے ہارون علیہ السلام پر علاوہ توراۃ کے وحی آئی حالانکہ ان کے پاس مکمل کتاب موجود تھی جو کہ ان پر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی قال اللہ تعالےٰ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ یعنی ہم نے موسیٰ اور ہارون کو کتاب بیان والی عطا فرمائی۔ ہارون علیہ السلام پر وحی نازل ہونے کی دلیل یہ ہے قال اللہ تعالےٰ: اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ - یعنی بیشک ہم نے تمہاری طرف وحی اتاری جس طرح کہ ہم نے نوح کی طرف وحی بھیجی اور دوسرے انبیاء کی طرف جو ان کے بعد ہوئے وحی بھیجی تھی اور جس طرح ہم نے ابراہیم، اسماعیل الخ

اس آیہ شریفہ میں ہارون علیہ السلام پر جو وحی نازل ہونے کا ذکر ہے۔ وہ علاوہ توراۃ کے ہے اگر توراۃ مراد ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کا ذکر ضرور ہوتا کیونکہ اصالتاً توراۃ انہی پر نازل ہوئی تھی۔

وجہ پنجم یہ کہ اللہ پاک نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا تعلیم فرمائی: رَبِّ

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا یعنی اے میرے پروردگار مجھ کو علم زیادہ عطا فرما اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰٓی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا یعنی ہم نے آدم سے عہد کیا تھا پس وہ بھول گئے۔ لیکن ان کا قصد ہماری مخالفت کا نہ تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کی رائے و فہم میں غلطی ہوئی۔ سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم اپنی رائے سے کام نہ لو بلکہ ہم سے علم طلب کرو جو علم ہم تم پر نازل کریں گے وہی ہماری مرضی کے مطابق اور قرآن کی تفسیر ہو سکتا ہے۔ تمہاری رائے میں غلطی واقع ہو سکتی ہے جس طرح کہ ابو البشر آدمؑ نے ہمارے حکم وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ تم ظالموں میں (شمار) ہو گے۔) سورہ بقرہ پ آیت (۳۵) کے سمجھنے میں غلطی کی اور اس کے خلاف کر بیٹھے۔ دونوں آیتوں کے ملانے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا میں جو علم مطلوب ہے، وہ علم تفسیر قرآن ہے جس کو کہ وحی خفی کہا جاتا ہے۔ ورنہ آدم علیہ السلام کا ذکر بعد دعائے مذکور کے غیر موزوں ہوگا۔ فافہم۔ وحی خفی کی بحث تمام ہوئی۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

تتمہ

نماز جنازہ

اہلِ قرآن نماز جنازہ کے منکر ہیں حالانکہ یہ انہی کی مسلمہ ادلہ قرآنیہ سے ثابت ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ یعنی تم منافقین پر نماز جنازہ مت ادا کرو۔ جس سے صاف طور پر نکلا کہ مومنین پر نماز جنازہ ضرور ادا کرنا چاہیئے۔ اگر صلوٰۃ کے معنی صرف دُعا کے لئے جاویں تب بھی مدعا حاصل ہے کیونکہ تکبیر کہنا اور ہاتھ باندھنا اور رفع الیدین کرنا یا کانوں کو پکڑنا حسب تقریر اہلِ قرآن نماز سے خاص نہیں بلکہ عاجزی کی علامات ہیں ان کے دلائل یہ پیش

کیے جاتے ہیں قَالَ تعالےٰ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا - وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ - قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ الخ اے پیغمبر ان سے پوچھو، کیا کبھی تم نے اس بات پر غور کیا کہ اگر اللہ تعالےٰ تمہاری سماعت لے لے — قطع نظر اس کے کہ پہلی آیت سے وَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ کہنا اور دوسری آیت سے ہاتھ باندھنا و تیسری آیت سے کانوں کا پکڑنا ثابت ہے یا نہیں یہ بات ضرور ہے کہ امور مذکورہ نماز کے لئے خاص نہیں ہیں - پس اگر جنازہ کو سامنے رکھ کر تکبیر و رفع یدین کرنے کے بعد ہاتھ باندھ کر میت کے لئے دُعا مانگی گئی تو کون سی قباحت ہوئی - اسی طرح بعد دعا کے سلام پھیرنا بھی نماز سے مخصوص معلوم نہیں ہوتا کیونکہ آیت پیش کردہ اہل قرآن سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر رکھا ہے — کہنے کے موقع پر کسی دلیل سے نماز کی تخصیص نہیں پائی جاتی - پس بعد دُعا برائے میت سلام پھیرنا بھی اہل قرآن کے نزدیک مسلمہ ہونا چاہیئے -

وقت افطار روزہ

اہل قرآن کے نزدیک افطار کا وقت نہیں ہوتا جب تک کہ خوب اندھیرا نہ ہو جائے مگر اُن کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ آیہ وَاَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ میں روزہ کو غروب شمس تک پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے کہ لیل غروب شمس سے شروع ہو جاتی ہے - قاموس میں ہے لیلۃ من مغرب الشمس الی طلوع الفجر الصادق او الشمس یعنی رات غروب آفتاب سے لے کر صبح صادق یا آفتاب کے طلوع تک ہے - اس سے معلوم ہوا کہ غروب آفتاب سے لیل کے شروع ہونے میں اہل لغت کا اختلاف نہیں - اگر اختلاف ہے تو اس میں ہے کہ لیل (رات) صبح صادق تک ہے یا آفتاب نکلنے تک - سو یہ ہمارے مدعا کے لئے کچھ مضر نہیں ہے - پس ثابت ہوا کہ غروب ہوتے ہی افطار کا وقت ہو جاتا ہے اگرچہ خوب اجالا معلوم ہوتا رہے - کیونکہ صیام جو کہ مغیّا ہے لیل میں جو کہ غایت ہے داخل نہیں ورنہ صیام کو اخیر رات تک ماننا پڑے گا - مُغَیّا یعنی وہ حکم جس کی غایت (انتہا) بتائی گئی ہو، یہاں مغیّا صوم ہے - وہذا باطل فافہم -

انبیاء کے نام کے ساتھ علیہ السلام کہنے کی بحث

اہل قرآن کہتے ہیں کہ علیہ السلام نہیں کہنا چاہیئے بلکہ سلامؑ علیہ کہنا چاہیئے اس لئے کہ جا بجا قرآن کریم میں یہی مستعمل ہے۔ جیسا کہ فرمایا سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وغیرہا من الآیات ۔ اسکی بابت جواباً عرض ہے کہ قرآن کریم میں سلامٌ علیہ بھی نہیں پایا جاتا۔ پس کیا یہ تحریف لفظی نہیں ہے۔ اگر یہ تحریف نہیں ہے تو سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِيْمِ اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰى وغیرہ پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے بحالیکہ یہ بھی ذرا سے تغیر کے ساتھ قرآن میں موجود ہیں ایک مقام پر سُبْحَانَ رَبِّیْ اور ایک جگہ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ اور رَبِّكَ الْاَعْلٰى ہے۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مقام ملاکر حکم باری کی تعمیل کی تو کیا قباحت ہوئی اسی طرح تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ کی جگہ تَبَارَكَ اسْمُكَ اور بِحَمْدِ رَبِّكَ کی جگہ بِحَمْدِكَ کہا گیا تو کیا حرج ہوا۔ اس لئے کہ جب جناب باری سے خطاب ہوگا تو تبارک اسمک ہی کہا جائیگا۔ تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ نہیں کہا جاسکتا۔

اہل قرآن ذرا سوچ سمجھ کر بتلادیں کہ لفظ سلامٌ علیہ کہنا دینی بات اور عبادت ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں جبکہ یہ آپ کے نزدیک قرآن سے ثابت ہے اور اگر ہے تو عبادت میں ایسا لفظ کیوں استعمال کیا جاتا ہے جو کہ بعینہٖ قرآن میں موجود نہیں؟ کیا یہ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ کے خلاف نہیں ہے؟ عبادت کے معنی بھی مفصل طور پر بیان فرمائے جائیں ۔

ثبوت روایت و شہادت

اس امر کا ثبوت کہ شرع میں روایت معتبر ہے اوّل رسالہ میں گذر چکا، اس کا بقیہ یہاں پر درج کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ سورہ احقاف میں فرماتا ہے: قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ ۔ یہاں پر اللہ پاک نے بنی اسرائیل کے ایک عالم کی شہادت دربارہ صداقت

قرآن بطور حجت کے بمقابلہ کفار پیش کی ہے جس سے امور تعبدیہ میں شہادت کا معتبر ہونا بخوبی ثابت ہوتا ہے اور سورۃ مومن میں اللہ تعالیٰ ایک مومن مرد کا قول دربارہ موسیٰ علیہ السلام نقل فرماتا ہے اِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْهِ کَذِبُهٗ وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ ۔ یعنی اگر موسیٰ جھوٹے ہیں تو اس کا وبال ان کے ذمہ ہے اور اگر سچے ہیں تو ان کے فرمانے کے مطابق تم کو عذاب پہنچے گا ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص امانت دار صالح متدین کوئی روایت دربارہ احکام ربانی بیان کرے تو اس کو ماننا چاہیئے اگر وہ جھوٹ بیان کرے گا تو اس کا وبال اسی کے ذمہ ہوگا ۔ یہاں پر ایک نکتہ پایا جاتا ہے وہ یہ کہ فعلیہ کذبہٗ میں عَلَیْهِ مقدم ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس روایت میں جھوٹ کا وبال اسی سنانیوالے کے ذمہ ہوگا سننے والے اور ماننے والے کے ذمہ نہ ہوگا ۔ اس مقام پر عَلَیْهِ جس کا حق متوخر ہونا ہے مقدم ہے ۔ اور کَذِبُهٗ جس کا حق مقدم ہونا ہے مؤخر ہے لہٰذا یہاں پر حصر کا ہونا بخوبی ثابت ہوگیا ۔ لِاَنَّ تَقْدِیْمَ مَا حَقُّهُ التَّاخِیْرُ یُفِیْدُ الْحَصْرَ یعنی (علم بلاغت کے قاعدہ کے مطابق) جس کلمہ کو بعد میں لانا چاہیئے، اس کو اگر پہلے ذکر کردیا جاتے تو اس سے قصر یعنی خاص کرنے کا پہلو ظاہر ہوتا ہے ۔

اور فرمایا اللہ تعالےٰ نے سورہ یونس میں فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ۔ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کفار مکہ سے کہدو کہ قرآن کے نازل ہونے سے پہلے میں نے تم لوگوں میں اپنی عمر کا ایک حصہ بسر کیا ہے ۔ پس کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے خلاصہ یہ کہ تم لوگ جانتے ہو کہ میں امین وصادق القول ہوں پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم لوگوں سے تو سچائی کا برتاؤ کروں اور اللہ پاک پہ بہتان باندھوں نعوذ باللہ ۔ اس مقام پر قابل غور یہ امر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی صداقت قرآن کی دلیل ہے اور یہ دلیل صرف کفار مکہ کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام جہان اور قیامت تک کے لئے ایک مضبوط دلیل ہے اور آپ کی زندگی جو کہ صداقت کی دلیل ہے تمام جہان کے لوگوں کو بذریعہ روایات ہی معلوم ہوسکتی ہے ۔ اگر روایت کا اعتبار نہ کیا جاوے گا تو سب کو آپ کا حال معلوم نہ ہوگا اور یہ دلیل صرف کفار مکہ کے لئے ہوگی ۔ حالانکہ آپ جس طرح تمام جہان کی طرف مبعوث ہوتے ہیں اس طرح آپکی زندگی بھی تمام جہان کے لئے آپ کی صداقت کی دلیل ہونی چاہیئے ۔ پس اس تیسری آیت سے نہایت صاف طور پہ روایت کا معتبر ہونا ثابت ہوا ۔ وللہ الحمد ۔

حَدیثِ نبویؐ اور لُغت

قرآن کریم کے معانی میں نہایت فراخ حوصلگی سے اہل لغت کے کلام سے مدد لے جاتی ہے اور ان کے خلاف قرآن کی تفسیر کرنے کو کفر و شرک خیال کیا جاتا ہے مگر نہایت افسوس و حیرت کا مقام ہے کہ تمام اہل لغت و عرب عربا و فصحا ر بلغائے متقدمین کے سچے امام یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو بہت دلیری سے رد کیا جاتا ہے۔ بلکہ آپؐ کا کلام منقول ہونا غیر صحیح خیال کیا جاتا ہے۔ کیا یہ حیرت و تعجب کا مقام نہیں کہ اہل لغت و شعرائے عرب وغیرہ کی نقل تو ہم تک صحیح سالم پہنچ سکتی ہے اس میں کسی قسم کے غلط ملط کا اندیشہ نہیں ہوتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام دربارہ تفسیر قرآن و حل لغات قرآنیہ جس کی روایت کا بڑا بھاری دین میں انتظام ہے، ہم تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس کی کوئی دین میں ضرورت ہے؟ افسوس کہ اہل لغت و شعرائے عرب کے برابر بھی آپ کے کلام کو وقعت نہیں دیگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس قسم کی خرابیاں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم چھوڑنے سے لازم آتی ہیں۔ پس ہم کو چاہیئے کہ ہم آپکی تعلیم مضبوطی کے ساتھ پکڑلیں اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے صاف فرمادیا ہے لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ یعنی اللہ پاک کے رسول میں تمہارے لئے پیروی و اقتدا کرنے کے واسطے عمدہ نمونہ ہے۔ لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ اُس نمونہ کو سامنے رکھ کر تمام اعمال و افعال کو اس کے مطابق کریں۔ اور اُس کی تعلیم کا پورا پورا خیال رکھیں۔ کیونکہ بغیر اسکے ہرگز نجات نہ ہوگی ؎

خلافِ پیغمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ تمام شد۔

الحمد للہ کہ رسالہ دربارہ "اہل قرآن" خیر و خوبی سے تمام ہوا، اللہ تعالےٰ اس سے برادران اسلام کو نفع و فائدہ بخشے اور میرے لئے اجر و ثواب کا باعث بنائے آمین۔ و یرحم اللہ عبدا قال آمینا، حررہ الراجی رحمۃ ربہ ذی المنن، ابو محمد عبد الستار حسن وقاہ اللہ من الشرور والفتن "

مقالات

از

مولٰینا عبدالغفّار حسنؔ رحمانی

عمرپوری مدظلّہ

سُنّت قرآنِ حکیم کی روشنی میں

اس مقالے میں قرآنی آیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ سنّت وحی کی ایک مستقل قسم ہے اس کے بغیر نہ تو قرآن مجید کا صحیح فہم حاصل ہو سکتا ہے اور نہ اسلام کی شاہراہ پہ انسان ایک قدم چل سکتا ہے۔

اصل مضمون کے آغاز سے پہلے چند بنیادی امور کی وضاحت ضروری ہے۔

سُنّت کا مفہوم

سنّت کے اصطلاحی معنی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول، فعل اور تقریر (تقریر کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی کام کیا گیا ہو لیکن آپ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو) تدریب الراوی ج ۱ ص۴۲ طبع بیروت اور قواعد التحدیث للقاسمی ص۶۱۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر بھی تھے اور رسول بھی، جیسا کہ قرآن میں ہے: قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (سورۃ الکہف) "کہہ دیجئے میں تمہارے جیسا انسان ہی ہوں (فرق اتنا ہے کہ) میری طرف وحی کی جاتی ہے"۔ لیکن آپ کے رسول ہونے کی حیثیت غالب تھی۔ آپ کے ہر قول و فعل کو اسی حیثیت سے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ ہاں جس جگہ اس امر کا واضح قرینہ موجود ہو کہ آپ کا یہ مشورہ یا فعل منصبِ رسالت کی حیثیت سے نہ تھا وہاں اس کی نوعیت واجب الاطاعت سنّت کی نہ ہوگی۔

۳۔ منکرین سنّت صرف قرآن کو دلیل قرار دینے کے باوجود اختلاف و انتشار سے نہ بچ سکے۔ اس خیال کے حامی حلقہ میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں، اور پراگندہ خیالی کے نئے نئے نمونے سامنے آ رہے ہیں۔ ذیل میں اس کی ایک دو مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔

(الف) آج سے ساٹھ ستر سال قبل غیر منقسم ہندوستان میں آواز اٹھی تھی کہ

قرآن، تمام اُصول و فروع اور کلیات و جزئیات پر مشتمل ہے ہمیں کسی مسئلے میں قرآن سے باہر رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ۔

جب ان سے دریافت کیا گیا کہ اگر واقعی قرآن میں تمام اصول وجزئیات کا بیان موجود ہے تو بتایئے کہ قرآن مجید میں گدھے کی حُرمت کا کہاں ذکر ہے، تو اس گروہ کی طرف سے جواب مِلا کہ قرآن میں ہے :

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (سُورۃ الجُمعۃ)۔ اس آیت میں بے عمل علمائے یہود کو گدھے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس طرح یہودی علماء اپنے شرک اور فاسقانہ زندگی کی بناء پر ناپاک قرار دیئے گئے ہیں ۔ اسی طرح اس تشبیہ کی بناء پر گدھا بھی ناپاک اور حرام ہوگا ۔

اس کے جواب میں حامیانِ سنّت نے کہا کہ قرآن میں ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ یعنی یہ مشرکین مویشیوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ۔ کیا اس آیت کی بناء پر اونٹ، گائے، بھیڑ بکری کی حُرمت ثابت ہو جائے گی ۔ فبُھِتَ الذی انکر السنۃ (ماہنامہ ضیاء السنہ ج ۱ عدد ۳ بابت ماہ اپریل ۱۹۰۲ء)۔ اس قسم کی مضحکہ خیز تاویلات سے بچنے کے لئے اب مذہب انکارِ سنّت ایک دوسرے رُوپ میں نمودار ہوا ہے ۔

ب ۔ اس دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ قرآن میں صرف اصول وکلیات کا ذکر ہے، باقی رہی جزئیات تو ان کو ہر دور کا مرکزِ ملّت طے کرتا رہے گا ۔ ان حضرات کا یہ بھی ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں خود مرکزِ ملّت تھے اور آپؐ کی اطاعت اسی حیثیت سے اُمت پر واجب تھی ۔ آپؐ کی رحلت کے بعد ضروری نہیں ہے کہ آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنایا جائے ۔

اس مسلک کی رُو سے نماز اور زکوٰۃ کی ان تمام تفصیلات وجزئیات میں ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے ۔ جن پر اب تک چودہ سو سال سے اُمت کا تعامل چلا آرہا ہے ۔ چند شواہد ملاحظہ ہوں :

اگر یہ ثابت بھی کر دیا جائے کہ فلاں روایت یقینی طور پر سچی ہے تو بھی اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں دین کے فلاں گوشہ پر کس طرح عمل کیا گیا تھا ۔ اگر ہمارے زمانے کا مرکزِ حکومتِ قرآنی سمجھے کہ اس عمل میں کسی

ردّوبدل کی ضرورت نہیں تو اسے علیٰ حالہٖ رائج کر دے اور اگر سمجھے کہ ہمارے زمانے کے "اقتضاآت" اس میں ردّوبدل چاہتے ہیں تو اس میں ردّوبدل کر دے۔" (مقام حدیث ج ۱ ص ۴۴ شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام)

"جن امور کی تفصیل قرآن نے خود نہیں بیان کی، ان کی تفصیل قرآنی اصولوں کی روشنی میں از رُوئے بصیرت متعین کی جائے گی۔ یہی رسول اللہؐ نے کیا اور ہمارے لئے بھی ایسا کرنا منشائے قرآنی کے مطابق اور سنّت رسول اللہؐ کے عین مطابق ہے۔ اس باب میں اخلاق، معاملات اور عبادات میں کوئی تفریق و تخصیص نہیں۔" (مقام حدیث ج ۱، ص ۲۲۴)۔

یہ گروہ بھی ذہنی انتشار میں مبتلا ہے کبھی کہا جاتا ہے کہ سنت کا وہ حصہ قبول کیا جا سکتا ہے جو قرآن کے مطابق ہو۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ قرآن اور سنّت کے درمیان مطابقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ذیل کے اقتباسات سے یہ ذہنی انتشار واختلاف واضح ہے۔

حدیث پرکھنے کا معیار قرآن ہے

(الف) "طلوع اسلام" پہلے دن سے اس حقیقت کا اعلان کرتا چلا آ رہا ہے کہ اس کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار (خواہ وہ احادیث ہوں یا کسی اور کے اقوال و اعمال اور آراء و خیالات) قرآن کریم ہے جو بات قرآن کے مطابق ہو اُسے ہم صحیح مانتے ہیں جو اس کے خلاف ہو اسے غلط سمجھتے ہیں۔ (ماہنامہ طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۵۸ء ص ۲۵)

اس عبارت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور افرادِ اُمت کے اقوال و اعمال کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے۔

حدیث پرکھنے کے لئے قرآن بھی معیار نہیں

(ب) مثلاً قرآن میں ہے اٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ یہ اصولی حکم ہے۔ حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ کے معنی ہیں کہ اڑھائی فی صدی کو نہ دو فی صدی کیا جا سکتا ہے نہ تین فی صدی۔ گویا قرآن کے حکم سے مُراد اڑھائی فی صدی ہے۔ اس میں ردّوبدل کر دینے سے دین کی نفی ہو جاتی ہے۔ آپ فرمائیے کہ اس حدیث سے متعلق کس طرح فیصلہ کیا جائے کہ صحیح ہے یا غلط۔ آپ کہتے ہیں کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو، اُسے صحیح مان لیا جائے۔ لیکن یہاں تو یہ سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اڑھائی فی صدی قرآن کے مطابق ہے یا خلاف - اب فرمایئے کہ ہمارے پاس وہ کون سا ذریعہ ہے جس سے ہم یقینی طور پہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا غلط - (مقام حدیث ج ۲ ص ۳۲۸)

(ج) آپ نے دیکھ لیا کہ حدیث کے پرکھنے کے معاملے میں یہ اصول بھی کام نہیں دے سکتا یہی وہ مقام ہے جہاں اقرار و انکارِ حدیث کا سوال پیدا ہوتا ہے - یعنی اقرارِ حدیث والے کہتے ہیں کہ قرآن کے اصولی احکام کی وہی جزئیات شریعت کی حیثیت رکھتی ہیں جو رسول اللہ نے بیان فرما دیں، ان میں ذرا سا ردّ و بدل بھی دین کی نفی ہے - انکارِ حدیث والے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا ہے ہی نہیں جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ فلاں جزئیات فی الواقع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمائی تھیں - (مقام حدیث ج ۲ ص ۳۲۳)

یہاں یہ امر بھی وضاحت طلب ہے کہ حدیث کا انکار کس بنا پر ہے - آیا اس بنا پر کہ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہی نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں جزئیات فی الواقع خود متعین فرمائی تھیں یا اس وجہ سے کہ اصولی طور پر قرآن کے علاوہ کسی دوسری چیز کو مشعلِ راہ بنایا ہی نہیں جا سکتا ؟

ایک اور ذہنی انتشار

مذکورہ بالا اقتباس میں اس گروہ نے خود اپنے آپ کو "انکارِ حدیث والے" کا لقب دیا، لیکن دوسری جگہ ارشاد ہے:-

(د) "منکرِ حدیث کے لفظی معنی ہیں - حدیث کا انکار کرنے والا، ہم پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص ہے جو حدیث کے وجود کا انکار کرے - خود طلوعِ اسلام کے پاس حدیث کی کتابوں کی بڑی بڑی ضخیم جلدیں موجود ہیں" (مقامِ حدیث، ج ۲، ص ۳۸۶)

اس خیال آرائی کو درست تسلیم کر لیا جائے تو سوامی دیانند کو بھی منکرِ قرآن نہیں کہا جا سکتا - اس کے پاس بھی مترجم قرآن اور تفسیر کی ضخیم جلدیں موجود تھیں -

(ﮦ) "ہمیں منکرین حدیث کی بابت معلوم نہیں کہ وہ کون لوگ ہیں، اور ان کا کیا کہنا ہے"۔ (ماہنامہ طلوعِ اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء)

"جب سے حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی ہے اسی وقت سے اہلِ علم کی ایک جماعت ایسی ہوتی

چلی آئی ہے جو اس کی دینی حیثیت سے منکر رہی۔ یعنی انکار کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حدیث کے وجود یا اُس کی حقیقت ہی کو نہیں جانتے یا اس کو بالکل جھوٹ جانتے ہیں، بلکہ صرف یہ ہے کہ اس کو دینی حجت نہیں تسلیم کرتے۔" (مطالعۂ حدیث، ص ۲۵۰ مضمون منکرینِ حدیث از حافظ اسلم صاحب جیراج پوری)

مندرجہ بالا حوالہ جات سے ذہنی انتشار اور فکری خلفشار کے دو شاہکار سامنے آتے ہیں۔

(الف) قرآن، حدیث کے پرکھنے کا معیار ہے بھی اور نہیں بھی۔

(ب) منکر حدیث ہونے کا اقرار بھی ہے اور انکار بھی۔

یہ دماغی عدم توازن نتیجہ ہے سنّت کے انکار کا، اور سرمایۂ حدیث کو عجمی سازش قرار دینے کا، سنّت سے دامن اس لئے چھڑایا گیا تھا کہ انتشار و اختلاف سے محفوظ رہا جائے لیکن صورت حال یہ ہے کہ انکارِ سنّت کی بنا پر اختلاف و انتشار میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَآ اُولِی الْاَبْصَارِ۔

باقی رہا یہ انکشاف کہ اہل علم کی ایک جماعت تدوین حدیث کے زمانے سے حدیث کی منکر ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ سراسر مغالطہ آمیزی ہے۔ آخر معلوم تو ہو یہ کون سے اہل علم تھے جنہوں نے خیر القرون میں انکارِ حدیث کا علم بلند کیا تھا؟

سُنّت اور قرآن

یہ تفصیلات تین اجزاء پر مشتمل ہیں۔

(الف) خود قرآن سے اس امر کا ثبوت کہ قرآنی آیات کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوا کرتا تھا جس کو اہل علم کی اصطلاح میں وحی خفی یا وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سیرت طیبہ کے ماخذِ شریعت اور مدار نجات ہونے پر قرآن حکیم کی محکم شہادتیں۔

(ج) اُن آیات کی صحیح تفسیر و تاویل جن کو سنت کے انکار کے سلسلے میں بطور حجت پیش کیا جاتا ہے۔

وحی خفی کا ثبوت

(۱) وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ (پ ۲ سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۳)، اور نہیں بنایا تھا ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ تھے مگر اس لئے کہ ہم ظاہر کر دیں (چھانٹ دیں، اس کو جو رسول کی پیروی کرتا ہے ان لوگوں سے جو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاتے ہیں۔

اس آیت میں لفظ جَعَلْنَا بتلا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ابتدائی زندگی میں خدا کے حکم سے ہی بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا تھا لیکن یہ حکم قرآن میں کہیں نہیں ملتا۔ ظاہر ہے کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ کی رہنمائی فرمائی تھی۔

۱۔ اس آیت کے جواب میں منکرین سنت کے ایک ترجمان نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی بجائے بیت المقدس کی طرف رخ کسی غیر قرآنی وحی کی بنا پر نہیں کیا تھا، بلکہ یہ بھی قرآن کے ایک ارشاد کی تعمیل تھی۔ قرآن میں حضرت اسحاق، یعقوب، یوسف اور دوسرے انبیاء کرام کے ذکر کے بعد آں حضور کو حکم ہوا ہے۔ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (سورۃ الأنعام آیت ۸۳ تا ۹۰ پ ۷) یعنی آپ ان کی ہدایت کی اقتداء کیجئے۔ ظاہر ہے کہ ان انبیاء کا قبلہ بیت المقدس تھا، اس لئے آپ نے اس کو اپنا قبلہ قرار دیا۔"

لیکن اس موقع پر یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ ان محولہ بالا آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بھی سب سے پہلے موجود ہے اور حضرت اسماعیل کا بھی تذکرہ ہے۔ آخر ان کے تعمیر کردہ کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی بجائے بیت المقدس کو کس بناء پر ترجیح دی گئی؟ اس ترجیح کی وجہ قرآن میں مذکور نہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آپ کی یہ رہنمائی وحی خفی کے ذریعہ کی گئی تھی۔ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء سابقین کی اقتداء کا حکم دیا جا رہا ہے، حالاں کہ ان کو گذرے ہوئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال بیت چکے ہیں اب اگر ان انبیاء کرام کی رحلت کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی اقتداء و اتباع لازمی تھی تو قیامت تک آنے والے انسانوں پر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء واجب کیوں نہ ہوگی۔ اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد یہ مغالطہ بے نقاب ہو جاتا ہے کہ رسول کی اطاعت صرف اس کی زندگی تک محدود ہے۔ عربی میں اطاعت کے معنی ہیں "زندہ

کی فرماں برداری۔ (اسلامی نظام ص ۱۰۷)

حضرت ابراہیم، اسماعیل و اسحاق اور دوسرے انبیاء کرام بھی تو اپنے زمانے کے "مرکز ملت" ہی ہوں گے آخر ان کی اقتدار کا آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں حکم دیا جا رہا ہے؟

معلوم ہوتا ہے کہ اس جواب کا بودا پن محسوس کرتے ہوئے اب اس آیت کی دوسری تاویل کی گئی ہے۔

"اس آیت میں کُنْتَ کے معنے "تو تھا" نہیں، اس کے معنے ہیں "تو ہے" یعنی ہم نے وہ قبلہ جس پر تو ہے اس لئے مقرر کیا ہے تاکہ دیکھیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔ (ماہنامہ طلوع اسلام، اپریل ۱۹۶۱ء)

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہاں کُنْتَ کے معنے "تو ہے" ہونا چاہیئے تب بھی یہ استدلال اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ قرآن مجید سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ تحویل قبلہ عملاً واقع ہوئی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ مدینہ کے قیام کے ابتدائی زمانے میں کس قرآنی حکم کی بناء پر آپؐ نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا تھا؟

ظاہر ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم محض اپنی خواہش یا دوسروں کی خواہشات کی اتباع میں تو ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ قرآن میں آپ کا کردار یہ بتلایا گیا ہے۔ اِنْ أَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔ میں صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں۔ جو میری طرف وحی کی جاتی ہے (سورۃ الأنعام آیت ۵۱) پھر یہ نماز جیسی اہم عبادت کا معاملہ تھا، اس لئے اس بارے میں کسی لچک یا تسامح کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ وہ کون سی وحی تھی جس کی اتباع کرتے ہوئے آپ نے پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنایا؟

۲۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (سورۃ التحریم آیت ۳)

اور جب نبی نے اپنی ایک بیوی سے راز کی بات کہی پھر اس (بیوی) نے (بات) ظاہر کر دی اور اللہ تعالیٰ نے اس (بیوی) کے طرز عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع

کر دیا تو آپ نے اس بات کا کچھ حصہ بتلا دیا اور کچھ سے اعراض کیا۔ پھر جب آپ نے اس بات کی بیوی کو خبر دی تو اس نے کہا آپ کو کس نے خبر دی۔ آپ نے کہا مجھے علیم و خبیر نے آگاہ کیا ہے۔

اس آیت میں أَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ اور نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ۝ یہ دو ٹکڑے زیر نظر مسئلے میں قابلِ غور ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے آپؐ پر کس طرح ظاہر کیا۔ علیم و خبیر کے اطلاع دینے کی نوعیت کیا تھی؟ اس کی تفصیل قرآن میں نہیں ملتی۔ ماننا پڑے گا کہ قرآن کے علاوہ وحی کی کوئی دوسری شکل بھی تھی جسے یہاں أَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ اور نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

اس دلیل کے جواب میں پہلے تو یہ کہا گیا کہ "اس سے کیسے ثابت ہو گیا کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے خدا نے خبر دی ہے۔ کیا اس سے یہ مفہوم نہیں کہ مجھے اس نے خبر دی ہے جس کو اس راز کی علم و آگاہی ہو گئی تھی؟"

ظاہر ہے کہ یہ تاویل و توجیہ انتہائی کمزور ہے۔ اس کے بودے پن کو محسوس کرتے ہوئے فوراً کہا گیا کہ "لیکن میں اس مفہوم پر اصرار نہیں کرتا اور تسلیم کئے لیتا ہوں کہ العلیم الخبیر سے مُراد اللہ تعالےٰ ہی ہیں لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ خدا نے یہ اطلاع بذریعہ وحی دی تھی۔ مثلاً سورہ مائدہ میں ہے، اور جو تم شکاری جانوروں کو سکھاتے ہو تم انہیں اس علم کے ذریعے سکھاتے ہو جو اللہ نے تمہیں سکھایا ہے۔

یا عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ انسان کو سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا یا عَلَّمَ بِالْقَلَمِ قلم کے ذریعے سکھایا۔ یا مثلاً سورۂ بقرہ میں کاتب کے بارے میں فرمایا كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں کہیں بھی عَلَّمَ سے مُراد وحی نہیں ہے۔ اسی طرح عورتوں کے بارے میں فرمایا جب وہ پاک ہو جائیں تو فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ۔ ان کے پاس جاؤ جس طرح اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ یہاں حکم دینے سے مُراد فطری حکم ہے نہ کہ شرعی۔ انتہیٰ ملخصاً۔

یہ تاویل بھی کوئی وزن نہیں رکھتی۔ یہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ حقیقی مفہوم کو چھوڑ کر مجازی معنےٰ یا نسبت وہیں مراد لی جا سکتی ہے جہاں حقیقی معنیٰ کی سرے سے گنجائش ہی نہ ہو، اور مجازی مفہوم مراد لینے کے لئے واضح قرینہ موجود ہو۔ اگر اس قاعدہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو قرآن

بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا۔

جتنی بھی آیات پیش کی گئی ہیں ان میں مجازی مفہوم کے لئے واضح قرینہ پایا جاتا ہے۔ یعنی ان آیات میں مخاطب عام مسلمان ہیں یا عام انسان ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب پر تو وحی نازل نہیں ہوتی، اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ یہاں "علّم" اور "امر" کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مجازی طور پر ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو وحی کا نزول ہوتا تھا۔ اس لئے یہاں اس قسم کی تاویل بالکل بے محل اور بے بنیاد ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھانے اور تعلیم دینے کا ذکر آیا ہے، وہاں شرعی تعلیم مراد ہے یا فطری۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۞ سورۃ النساء آیت ۱۱۲) اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور اس نے آپ کو سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے اور یہ سب اللہ کا آپ پر فضلِ عظیم ہے۔ اگر اس آیت میں بھی فطری تعلیم مراد ہے، تو یہ مقام تو ہر ایک انسان کو حاصل ہے پھر "فضلِ عظیم" کے کیا معنیٰ ہوتے۔

اس کی بعینہٖ مثال قرآن مجید میں لفظ "وحی" کے استعمال کی ملتی ہے۔ یہ لفظ جہاں کہیں غیر انبیاء کے بارے میں استعمال ہوا ہے وہاں اس سے فطری الہام یا اس سے کوئی ملتا جلتا مفہوم مراد ہے۔ مثلاً ایک مقام پر ارشاد ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا۔ اور وحی کی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف کہ پہاڑوں میں گھر بنائے۔ (سورۃ النحل آیت ۶۸)

اس آیت میں شہد کی مکھی کی طرف وحی کے نزول کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں فطری رہنمائی مراد ہو سکتی ہے نہ کہ وحی رسالت، لیکن زیر بحث آیت وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ میں اَظْهَرَهُ اللّٰهُ اور نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ سے مراد شرعی وحی مراد لینے میں کوئی مانع موجود نہیں ہے اس لئے یہاں مجازی مفہوم لینا کسی صورت میں بھی صحیح نہیں ہے۔ اس سورت میں مذکورہ آیت سے قبل متعدد افعال کی نسبت اللہ تعالےٰ کی طرف کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

(الف) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ۔ یہاں حلال ٹھہرانے سے مراد شرعی طور پر حلال ٹھہرانا ہے نہ کہ کچھ اور؟

(ب) آیت نمبر ۲ میں فرمایا قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ یہاں بھی فَرَضَ اللّٰهُ سے شرعی فرض مراد ہے نہ کہ فطری -

اب یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک ہی سیاق و سباق اور ایک ہی واقعہ میں أَحَلَّ اور فَرَضَ سے شرعی اِحلال اور شرعی فرض مراد لیا جائے اور أَظْهَرَهُ اللّٰهُ اور نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ میں شرعی یعنی وحی رسالت کی بجائے کوئی دوسرا مجازی مفہوم لے لیا جائے اور کمال یہ ہے کہ اس دعوے پر نہ کوئی قرینہ اور نہ کوئی دلیل، قرآن فہمی کا یہ عجیب شاہکار ہے -

(۳) إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (پ ۲۹ سورۃ القیامۃ)

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ قرآن مجید کی جمع و ترتیب کا کام اللہ تعالے نے اپنے ذمہ لیا ہے - یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب وہ نہیں ہے جو نزول کے وقت اختیار فرمائی گئی تھی -

نیز یہ بھی امر واقعہ ہے کہ قرآن کی موجودہ جمع و ترتیب کی تشکیل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق ظہور میں آئی تھی - اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی قرآنی حکم کی بناء پر تنزیلی ترتیب کو بدلا گیا تھا یا اسکی کوئی دوسری نوعیت تھی مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ - ظاہر ہے کہ قرآن میں اس بارے میں کوئی حکم موجود نہیں ہے - اب آیت إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ کی روشنی میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب وحی خفی (سنت) کی رہنمائی سے وجود میں آئی ہے -

(۴) (الف) وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا (پ ۶ المائدۃ)

اور جب تم نماز کی طرف (بلانے کے لئے) اذان دیتے ہو تو وہ (مشرکین) اسے کھیل کود بنا لیتے ہیں -

(ب) إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ (۲۸/۲ سُورَةِ الْجُمُعَة) جب جمعہ کے دن نماز کے لئے ندا (اذان) دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو -

ان دونوں آیات میں نماز جمعہ اور عام نمازوں کے لئے (ندا) اذان کا ذکر کیا گیا ہے لیکن قرآن میں اس بارے میں کوئی حکم یا کسی قسم کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ لامحالہ ماننا پڑے گا کہ یہاں وحی خفی کے ذریعہ آپؐ کی رہنمائی فرمائی گئی ہے۔

(۵) فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ (پ ۲، سورۃ البقرہ آیت ۲۳۹)

اس آیت سے قبل بیان ہوا ہے کہ اگر خوف کی حالت ہو تو نماز جس طرح ممکن ہو پڑھ لو۔ پیادہ ہو یا سواری پہ۔ اب اس آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ جب امن کی صورت ہو تو اللہ کو یاد کرو۔ یعنی نماز پڑھو جس طرح اللہ تعالٰے نے تم کو تعلیم دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم قرآن میں تو ہے نہیں۔ لامحالہ ماننا پڑے گا۔ کہ سُنّت میں نماز کے بیان کردہ نقشہ کو بھی اللہ تعالٰے نے اپنی ہی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اور اس کا ذریعہ وحی خفی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

(۶) وضوء کا حکم ۶ھ میں نازل ہوا تھا، جیسا کہ سورۃ مائدہ میں ارشاد ہے:
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ یعنی ایمان والو! جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہرے اور ہاتھ دھو لیا کرو۔
لیکن نماز کا حکم مکّی زندگی میں دیا گیا تھا، جیسا کہ سورۃ مزمّل میں ہے يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا (پ ۲۹، ع ۱۱ سورۃ المزمّل)
چند آیات کے بعد ارشاد فرمایا۔ إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ۔ ان آیات میں قیام اللیل کی تاکید کی گئی ہے۔
سورۃ طٰہٰ میں ارشاد ہے: وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔ یعنی اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور اس پر پابند ہو جا۔
سورہ اسراء پ ۱۵ میں ہے۔ أَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ۔ نماز قائم کر، سورج کے ڈھلنے کے وقت، رات کے اندھیرے تک۔ یہ تمام آیات مکہ میں ہجرت سے قبل نازل ہوئی تھیں۔ قرآن مجید میں سُورۃ مائدہ (جس کا نزول ۶ھ میں ہوا تھا) کے سوا اور کسی مقام پہ وضو کا حکم نہیں ملتا۔

اب دو ہی صورتیں ہیں : یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ ۱۷، ۱۸ سال بغیر وضو کے نماز ادا کرتے رہے یا پھر ماننا پڑے گا کہ وحی خفی کے ذریعہ وضو کا حکم دیا گیا تھا ۔

۷ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بنی نضیر کے موقع پر یہودیوں کے نخلستان کے کاٹ دینے کا حکم دیا تھا ۔ اس پر یہود نے اعتراض کیا تو قرآن مجید میں اس بارے وضاحت کی گئی مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۃ الحشر آیت ۵) یعنی جو تم کھجور کے درخت کاٹتے ہو یا انکو چھوڑ دیتے ہو تو یہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے ہے ۔

یہاں قطع نخلستان کو اللہ تعالےٰ نے اپنے اذن سے قرار دیا ہے حالانکہ قرآن میں اس سے قبل قطع نخلستان کا کہیں بھی حکم موجود نہیں ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نخلستان کے بارے میں یہ پالیسی آپ نے اللہ تعالےٰ کے حکم سے اختیار کی تھی، جس کی طرف آپ کی رہنمائی وحی خفی کے ذریعے کی گئی تھی ۔

اسوۂ حسنہ کے حجت ہونے پر قرآن کی محکم شہادتیں

(۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (پ ۵، سورۃ نساء آیت ۵۹)

اس آیت میں مندرجہ ذیل امور قابلِ غور ہیں :

(الف) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے امر کا صیغہ اَطِيْعُوْا بار بار دہرایا گیا ہے لیکن اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے بجائے لفظ اطیعوا تیسری بار دہرانے کے صرف واؤ عاطفہ پر اکتفا کیا گیا ہے ۔ اندازِ بیان کا یہ فرق صاف واضح کر رہا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو حاصل ہے ۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت دائمی اور غیر مشروط ہے لیکن اولی الامر کی اطاعت عارضی اور مشروط ہے ۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اپنی جگہ پر کوئی امتیازی مستقل حیثیت نہیں

رکھتی تو پھر لفظ اطیعوا کا دوبارہ لانا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

(ب) فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ -

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عوام اور اولی الامر یا عوام کے مختلف گروہوں یا افراد کے درمیان کسی معاملے میں نزاع برپا ہو جائے تو فیصلے کے لئے آخری سند Final Authority صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس آیت نے واضح کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو یہ کہہ کر ختم نہیں کیا جا سکتا کہ رسول کی اطاعت کا قرآنی مطالبہ ایک الگ جداگانہ درجہ رکھتا ہے اور اُولِي الْأَمْرِ کی حیثیت دوسری ہے۔ رسول کی اطاعت کو یہ کہ کر ختم نہیں کیا جا سکتا کہ رسول کی اطاعت کا مطالبہ صرف صاحب امر کی حیثیت سے کیا جا رہا ہے۔ اگر امر واقعہ یہی ہوتا تو قرآن کا انداز تخاطب یہ ہونا چاہیئے تھا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ پھر رسول کو درمیان میں لانے کی ضرورت کیا تھی؟

(ج) اللہ تعالیٰ کے احکام ہم تک براہ راست نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے کلام، قرآن حکیم کی اطاعت کی جائے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد براہ راست آپ سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب اطاعت کی اس کے سوا اور کیا صورت ہو سکتی ہے کہ آپ کے ثابت شدہ اقوال و افعال کو زندگی کے تمام شعبوں میں رہنما مانا جائے۔ یہاں یہ کہنا بھی بے بنیاد ہے کہ اطاعت کا لفظ صرف زندوں کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ گذرے ہوئے انسانوں کی پیروی پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ قرآن یا مستند لغتِ عرب سے کہیں بھی اس کی تحدید ثابت نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پہلے خطبے کے یہ الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ اس بارے میں کسی قسم کی زمانی حد بندی قطعاً غلط ہے۔ خلیفۂ اوّل نے فرمایا: أَطِيعُونِي مَا أَطَعْتُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (سیرۃ ابن ہشام ج ۴ ص ۳۴۲، طبری ج ۳، ص ۲۰۳) یہاں حضرت ابوبکرؓ جیسے اہل زبان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت کر جانے کے بعد آپ کی پیروی کے لئے لفظ اطاعت استعمال کیا ہے۔

(۲) وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿ (پ ۵، سورۃ النساء آیت ۱۱۵)

اس آیت میں " سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ " کو ترک کر کے کوئی دوسری راہ اختیار کرنے

پر شدید وعید سنائی گئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سنّت کے بارے میں چودہ سو سال کے طویل عرصے میں "سبیل المومنین" کیا رہا ہے۔ خوارج اور معتزلہ میں سے چند افراد کے سوا تمام سلف و خلف اس بات پر متفق ہیں کہ سُنّت ماخذ شریعت اور فہم دین کے لئے ایک اہم ذریعہ ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ متفقہ عقیدۂ اُمّت میں اسی تواتر سے منقول ہوتا چلا آ رہا ہے جس تواتر سے قرآن مجید کا کلام الٰہی ہونا شروع سے اب تک مشہور و معروف ہے۔ اس معاملے میں چند منتشر افراد کی غوغا آرائی اُمّت کے اس متفق علیہ عقیدے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ورنہ پھر خود قرآن کی قطعیت بھی مشتبہ ہو کر رہ جائے گی۔ شہرستانی نے لکھا ہے کہ خوارج میں سے فرقہ عجاردہ میمونیہ سورۂ یوسف کے الہامی ہونے کا قائل نہ تھا (الملل والنحل ص ۱۲۶)۔ اب کیا اس شرذمۂ قلیلہ کے اختلاف سے قرآن کے بارے میں اُمّت کا اجتماعی فیصلہ مخدوش ہو سکتا ہے؟

(۳) اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ (پ ۳ سورۂ آل عمران ۳۲)

یہاں اطاعتِ رسول کا اسی طرح مطالبہ کیا گیا ہے جس طرح آیت فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (پ ۲۸، الحدید) میں ایمان بالرسول پہ زور دیا گیا ہے۔ جس طرح ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول بھی لازمی ہے۔ محض ایمان باللہ سے ایمان بالرسول کا مطالبہ پورا نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ محض اللہ کی اطاعت، اطاعتِ رسول کے مطالبے کو پورا نہیں کر سکتی۔ اس مفہوم کی آیات میں ترتیب کلام کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے اس سے اتنا فرق ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اللہ (قرآن) کی اطاعت بہر حال رسول (سنّت) کی اطاعت پر مقدّم ہو گی۔

(۴) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ (سورۂ بقرہ آیت ۱۲۹۔ اور آیت ۱۵۱) ترتیب کلام میں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہی الفاظ آل عمران آیت ۱۶۴، اور سورۃ الجمعہ آیت نمبر ۲ میں بھی ملتے ہیں۔

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار اوصاف بیان کئے گئے ہیں:

(۱) تلاوت آیات (۲) تعلیم کتاب (۳) تعلیم حکمت (۴) تزکیہ۔ یہاں تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب دو جُدا گانہ اوصاف ہیں۔ تلاوت کے معنی ہیں پڑھ دینا اور تعلیم کے معنی ہیں

سکھانا۔ معلم جب کسی کتاب کی تعلیم دیتا ہے تو اپنے الفاظ میں اس کی تشریح کرتا ہے۔ اجمال کی گرہیں کھولتا ہے۔ معنی کے ابہام و اشتراک کی صورت میں مصنّف کی اصل مراد کی طرف رہنمائی کرتا ہے' اور بعض دفعہ اُسے عملی نقشہ کھینچ کر سمجھانا پڑتا ہے۔ یہ نہ ہو تو تعلیم کتاب کا اصل مقصد ہی حاصل نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ زندگی میں اس منصب کے تمام تقاضے باحسن وجوہ پورے کر دکھائے۔ اس طرح سنّت کا وہ ذخیرہ جو قرآنی اجمالات کی شرح کرتا ہے تعلیم کتاب کے ماتحت آجاتا ہے مثلاً قرآن حکم دیتا ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ لیکن اس اجمال کی پوری تفصیل حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول و عمل سے پوری اُمّت کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا وصف تعلیم حکمت بیان کیا گیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ قرآن بھی سراپا حکمت ہے لیکن واوٗ عطف کے ساتھ کتاب کے بعد الحکمۃ کا ذکر واضح کرتا ہے کہ یہاں قرآن کے علاوہ دوسری شئے مُراد ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کے بعد نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے سوا اور کیا چیز حکمت قرار دی جا سکتی ہے۔ اس حکمت و دانائی کے اعلیٰ نمونے ہمیں آپ کے اجتہادی فیصلوں میں نظر آتے ہیں جو آپ نے قرآنی بصیرت کی بنا پر فرمائے ہیں۔

مثلاً قرآن میں ہے۔ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ یعنی دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی' بھتیجی اور خالہ' بھانجی کو بھی بیک وقت نکاح میں رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کی علت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ لیکن اس قسم کے رشتے قطع رحمی کا سبب بن جاتے ہیں۔

ممانعت کی یہ علّت خود ساختہ نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ارشاد فرمائی ہے: وَاِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ فَقَدْ قَطَعْتُمْ اَرْحَامَكُمْ (ابن حبان' نیل الاوطار - الموافقات للشاطبی ج ۳ ص ۱۹۲) اور جب تم یہ کرو گے تو اپنے رشتے کاٹ ڈالو گے۔

توضیحِ مدعا کے لئے مزید مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) قرآن نے ایک واضح اصول کے ماتحت نواقضِ وضوء کی ایک مختصر فہرست پیش

کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اصول کی روشنی میں دُبر سے خارج شدہ ریح اور نیند کو بھی نواقضِ وضوء میں شمار کیا ہے۔

(۳) قرآن نے مَیْتَة کو حرام ٹھہرایا ہے۔ بظاہر لفظ "مَیْتَة" مُردار کی ہر نوع کو شامل ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت مَیْتَة کی اصل علّت کو سامنے رکھتے ہوئے مردہ مچھلی اور ٹڈی کو حلال قرار دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم کتاب کے تحت سُنّت کا وہ ذخیرہ آجاتا ہے جو قرآن کے کسی اجمال کی تشریح کرتا ہے، اور تعلیم حکمت سے سُنّت کا وہ حصہ مراد ہے جو قرآنی اُصول و کلیات کی روشنی میں کئے ہوئے آپؐ کے اجتہادی فیصلوں پر مشتمل ہے۔

(۴) قرآن نے خمر کو حرام قرار دیا ہے۔ لفظ خمر سے بظاہر شراب کی اتنی ہی مقدار کی حُرمت ثابت ہوتی ہے جو نشہ آور ہو۔ لیکن حدیث نے واضح کر دیا۔ مَا أَسْكَرَ كَثِيرُهُ فَقَلِيلُهُ حَرَامٌ یعنی جس مشروب کے دس قطرے نشہ آور ہوں اُس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔

چند شُبہات کا ازالہ

(۱) ازواجِ رسول کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے:

ا۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ (پ۲۲ الاحزاب ۳۴) اس سے معلوم ہوا کہ "حکمت قرآن میں شامل ہے ورنہ حدیثوں کی کون تلاوت کرتا ہے۔"

یہاں اُردو زبان کے محاورے میں "تلاوت" کا جو مفہوم ہے اُسے مندرجۂ بالا آیت پر چسپاں کر کے پر فریب مغالطہ دینے کی سعی کی گئی ہے۔ عربی میں تلاوت کے معنی پڑھنے اور پیروی کرنے کے ہیں لیکن اردو میں تلاوت کا لفظ عام طور پر قرآن پڑھنے کے لئے مستعمل ہے لیکن قرآن مجید میں تلاوت کا یہ لفظ غیر قرآن کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً۔

قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

(پ۴۔ سورۂ آل عمران: آیت ۹۴)

(ب) وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۔ (پ ۱ - البقرہ ۵ آیت ۱۰۱) ترجمہ :- اور انہوں نے پیروی کی اس کی جو شیاطین حضرت سلیمان کے عہد میں پڑھا کرتے تھے ۔

۴ - قرآن میں ہے "ہم نے لقمان کو حکمت دی" کیا لقمان کو خاتم النبیینؐ کی حدیثیں دی گئی ہیں "

یہاں پھر مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اصل میں دعویٰ یہ نہیں ہے کہ لغتِ عرب میں حکمت کے معنی ہی سُنّت کے ہیں، یا قرآن میں جہاں کہیں بھی حکمت کا لفظ آیا ہے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت مراد ہے ۔ بلکہ استدلال یہ ہے کہ قرآن حکیم میں الکتاب (قرآن) کے ساتھ جہاں کہیں الحکمۃ کا ذکر ہے اس سے مُراد سُنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔ کیوں کہ قرآن کے بعد اگر کسی چیز کو حکمت قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ سنتِ رسول ہی ہو سکتی ہے ۔ اس استدلال کو پوری تفصیل کے ساتھ امام شافعیؒ نے اپنی بلند پایہ تصنیف کتاب الام ج ۷ میں بیان کیا ہے ۔

۵ - وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (پ ۱۴، النحل ۴۴) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت (نعوذ باللہ) پوسٹ مین کی سی نہ تھی کہ الکتاب لائے اور اُمّت کے حوالے کر کے رخصت ہوئے بلکہ خود قرآن آپ کو منصب تبیین و تشریح عطا کرتا ہے ۔ اب یہ الذکر (قرآن) کی تبیین آپ نے کس طرح فرمائی اس کی مختلف انواع ذیل کی تفصیل سے معلوم ہو سکتی ہیں ۔

۱ - قرآنی اجمال کی تفصیل

(۱) مثلاً اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۔ (البقرۃ آیت ۴۳) رکعاتِ صلوٰۃ، آدابِ صلوٰۃ ۔ اسی طرح شرح نصاب زکوٰۃ اور اس قسم کے دوسرے متعلقہ اہم مسائل ہم کو حدیث میں ملتے ہیں ۔

(ب) اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا (المائدہ ۵ پ ۶ آیت ۳۸) آیت میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے ۔ مگر کتنا ہاتھ اور کتنی چوری پر ؟ تو یہ سب تفصیلات ہم کو حدیث میں ملتی ہیں ۔

۲۔ معنیٰ مقصود کی تعین

یعنی ایک لفظ جو قرآن میں استعمال ہوا ہے، وہ لغوی لحاظ سے کئی معانی کا متحمل ہے یا ایک ہی معنی اپنے اندر بسیط وسعتیں رکھتا ہے لیکن سُنّت نے تعیین یا تحدید کر دی ہے مثلاً:

الف۔ قرآن میں کہا گیا ہے۔ اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ (پ ۷، سورہ انعام ۸۱) جو لوگ ایمان لائے، اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، تو انہی لوگوں کیلئے امن ہے اور یہ لوگ راہ یاب ہیں"

روایات میں ہے کہ صحابہؓ نے اس آیت کو سن کر کہا تھا کہ اَیُّنَا لَمْ یَظْلِمْ؟ ہم میں سے کون ہے جو ظلم سے آلودہ نہ ہوا ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی پریشانی کو اس طرح دور فرمایا کہ یہاں ظلم سے مُراد شرک ہے (بخاری)۔ اس تفسیر کی تائید قرآن کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان)۔ اگر اس پیغمبرانہ تفسیر کو تسلیم کیا جائے تو لازم آئے گا کہ ظلم کی ہر قسم کا ارتکاب ایک مسلمان کو امن اور نجات سے کلیتہً محروم کر دے گا۔ کیونکہ اُولٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ میں اندازِ حصر اسی کا مقتضی ہے، حالانکہ اصل صورتِ حال یوں نہیں ہے۔

(ب) وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (پ ۱۰۔ التوبہ ۔ ۳۵) کنز کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ لغوی لحاظ سے اس کی کوئی تخصیص نہیں ہے کہ وہ رقم تھوڑی ہو یا زیادہ۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے سوال کیا، تو آپؐ نے فرمایا جس جمع شدہ رقم کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز شمار نہیں ہوگی (ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ)، اصل الفاظ یہ ہیں مَا اُدِّیَ زَکَاتُہٗ فَلَیْسَ بِکَنْزٍ (سنن ابوداؤد ج ۲ صـ۲۱۳ باب الکنز ما ھو؟ - حدیث (۱۵۶۴)، باب ۳)

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَفْرِضِ الزَّکٰوۃَ اِلَّا لِیُطَیِّبَ بِھَا مَا بَقِیَ مِنْ اَمْوَالِکُمْ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض نہیں کی مگر اس لئے کہ اس

کے ذریعہ باقی ماندہ مال کو پاک کر دے۔ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب ۳۲ (۱۶۶۴) باب حقوق المال صہ ۳۰۶ ج ۲ طبع حمص (الشام)

۳۔ واقعاتی پس منظر کی وضاحت

یعنی قرآن میں عہد نبویؐ کے مختلف واقعات ملتے ہیں۔ لیکن انداز بیان اتنا مختصر ہے کہ جب تک سنت کے ذریعے پورا پس منظر سامنے نہ آ جائے اصل واقعہ کے تمام خدوخال نمایاں نہیں ہو سکتے۔ مثلاً:

(الف) وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَن يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ۝ (پ ۹، الانفال - ۷)

اس آیت میں غزوۂ بدر کی طرف اشارہ ہے، لیکن اس بارے میں مفصل معلومات حدیث سے واضح ہو سکتی ہیں۔

اسی طرح وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا۔ (پ ۱۱، التوبہ - ۱۱۸) عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ اور اس قسم کی دوسری آیات کو اس موقع پر پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

(۴) مثلاً: قرآن میں ہے وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ (پ ۵ سورۃ النساء آیت ۲۴) لیکن یہ عورتیں کب حلال ہیں۔ اس کی وضاحت اور اس باب میں شرائط کی پوری تفصیل حدیث میں ملتی ہے۔ حسب ذیل آیات کے عموم کی تخصیص حدیث سے کی گئی ہے۔

قرآن میں ہے يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (پ ۴ النساء آیت ۱۱) "اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت کرتا ہے کہ مرد کے لئے دو عورتوں جیسا حصہ ہے۔"

یہاں اولاد کے وارث ہونے کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ حدیث میں وضاحت ہے کہ اختلاف مذہب، اور قتل، موانع ارث میں سے ہیں۔ یعنی کافر اور باپ کا قاتل وارث نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں ہے۔ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ (پ ۴ - النساء آیت ۱۱)

اس وصیت کے بعد جو تم کرتے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد" یہاں وصیت کے جواز کے لیے عام حکم ملتا ہے۔ لیکن حدیث میں ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ وصیت نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس طرح اصل قریبی رشتہ داروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

د - قرآن میں مَیْتَۃ (مُردار) کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لیکن حدیث میں اس حکم سے دو حیوانات کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ مچھلی اور ٹڈی۔

ہ - قرآنی اصول و کلیات کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادی فیصلے مثلاً:۔

قرآن آپ کا منصب بیان کرتا ہے۔ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (پ ۹ - الاعراف ۱۵۷) یعنی پاکیزہ چیزیں ان کے لئے حلال کرتا ہے اور خبیث و ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔

آپؐ اس اصول کی روشنی میں گدھا، کتّا، پھاڑنے والے جانور اور پنجے دار پرندے حرام ٹھہراتے ہیں۔

۶ - مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (پ ۲۸) سُورۃ الحشر) " جو رسول تمہیں دے اُسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز آجاؤ"

سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول مالِ فےٗ کے بارے میں ہوا ہے لیکن ساتھ ہی الفاظ کے عموم سے جو ایک عام حکم اور کلی قاعدہ معلوم ہوتا ہے اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اس بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس آیت کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے ایک عورت کو وشم سے منع کیا اور آیت مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ پڑھتے ہوئے فرمایا" اس سے وشم (جسم گندوانے کی) بھی ممانعت بھی ہو گئی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ (صحیح بخاری پ ۲۸)

۷ - مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (پ ۵ - سورۃ النساء)
" جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی"

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یُطِعِ الرَّسُولَ سے قرآن کی اطاعت

مراد نہیں ہے۔

بلکہ سُنّت کی پیروی مُراد ہے۔کیونکہ قرآن کی اطاعت کے بارے میں تو کسی کو شک ہی نہیں تھا کہ وہ اللہ کی اطاعت نہیں ہے۔اگر کچھ وہم ہوسکتا تھا تو وہ سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہو سکتا تھا کہ اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہوگی یا نہیں؟ مندرجہ بالا آیت نے اس قسم کے وہم کی جڑ کاٹ دی ہے۔اس آیت کا سا انداز حسب ذیل دو آیتوں میں بھی ملتا ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (پ ۹ - الانفال - ۱۷) اور آپ نے نہیں (تیر) پھینکے جب کہ آپ نے پھینکے لیکن اللہ نے پھینکے۔"

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ (پ ۲۶ - الفتح ۱۰)

بلاشبہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں بس وہ تو اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔"

آپ کا فعل رمی یا مسلمانوں کا آپ سے بیعت کرنا خدا کے حکم سے تھا۔اسی لئے ان دونوں افعال کا تعلق اللہ تعالےٰ سے ظاہر کیا گیا ہے۔اسی طرح رسول کی اطاعت بھی اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، اس لئے اسے بھی اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

۸ - لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (پ ۱۸ سورہ النور ۶۳) یعنی رسول کی پکار کو آپس میں ایک دوسرے کی پکار کی طرح نہ قرار دو!"

قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنْكُمْ لِوَاذًا فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (پ ۱۸ النور ۶۳)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے پناہ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں۔پس چاہیئے کہ ڈریں وہ لوگ جو اُس (نبی) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں کہ مبادا ان کو کوئی فتنہ دبوچ لے، یا دردناک عذاب آگھیرے۔

اس آیت میں رسول کی دعوت (پکار) کو آپس میں ایک دوسرے کی پکار کے برابر قرار دینے سے روکا گیا ہے۔اب اگر رسول کی حیثیت صرف صاحب امر کی مان لی جائے تو پھر کدعاء بعضکم بعضاً کے کیا معنی ہوں گے؟ کیونکہ صاحب امر بھی

تو اُمّت ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ نبی کے ارشادات اُمّت کے تمام افراد سے بالا تر ہیں۔ ہر اُمتی سے خطا ہو سکتی ہے۔ لیکن نبی اپنے قول و فعل میں خطا سے پاک ہوتا ہے۔ اگر اس سے کبھی اجتہاد میں لغزش ہو بھی جاتی ہے، تو فوراً وحیِ الٰہی اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

۹ ۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (پ ۲۲ ۔ سورۃ الأحزاب ۳۶)

"اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لئے اختیار کی گنجائش باقی رہ جائے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسولؐ کے فیصلے کو الگ الگ اور عطف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں کے مصداق بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ یعنی قضاء اللہ سے قرآن، اور قضاء الرسول سے سُنّت مراد ہے۔

۱۰ ۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا (پ ۵ سورۃ النساء ۶۱) "جب ان سے کہا جاتے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور رسول کی طرف تو آپ دیکھیں گے کہ منافقین کس طرح آپ سے اعراض کئے چلے جاتے ہیں۔"

اس آیت میں دو لفظ قابلِ غور ہیں۔ إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ پہلے لفظ سے مراد تو قرآن مجید ہے۔ اب إِلَى الرَّسُولِ کے کیا معنی ہیں۔ کیا اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے سوا بھی کچھ مراد لیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اس قسم کی بیسیوں آیات ہیں۔ آخر کہاں کہاں واؤ عاطفہ کو واؤ تفسیریہ قرار دے کر اطاعتِ رسول کو اطاعت قرآن ہی ٹھہرایا جائے گا۔ کس کس جگہ الرسول سے مرکز ملت مراد لے کر رسول کی امتیازی حیثیت کو ختم کیا جائے گا؟ جب حقیقی معنیٰ بنتے ہوں تو مجازی اور بناوٹی معنیٰ پر اصرار کرنا آخر کون سی زبان دانی ہے۔ مجازی معنیٰ کیلئے بھی قرائن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوں ہی حقیقت کو چھوڑ کر مجاز کے معنی اختیار نہیں کئے جا سکتے۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

خبرِ واحد کی حجیت[1]

(۱) اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا (پ ۲۶ ، الحجرات)

اس آیت میں فاسق کی خبر کے بارے میں چھان بین کا حکم دیا گیا ہے - اس سے معلوم ہوا کہ اگر راوی (خبر دینے والا) ثقہ ہو تو اس کی خبر قابلِ اعتماد ہو گی - اسی آیت کو سامنے رکھتے ہوئے محدثین نے رُواۃِ حدیث کی امکانی حد تک خوب تحقیق کی ، اور اسماء الرجال جیسا عظیم الشان فن مدوّن کر ڈالا -

۲ - فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (پ ۱۱ سورۃ التوبۃ ۱۲۳)

عربی زبان میں طائفہ کا اطلاق فرد اور گروہ دونوں کے لئے آتا ہے - وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (پ ۱۸ سورۃ النور ۲) کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں - الواحد فما فوقہ (المختار من الصحاح) - اسی طرح وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا (پ ۲۶ ، الحجرات) میں طائفہ سے فرد اور طائفہ دونوں مراد ہیں - اس وضاحت کی بناء پر مذکورہ بالا آیت اس بارے میں صریح طور پر ناطق ہے کہ دینی معاملات میں ایک فرد یا دو تین افراد کی خبر یا روایت قابلِ اعتماد ہو گی -

(۳) وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ (پ ۲۰ ، القصص ۲۰) ایک شخص کے خبر دینے سے حضرت موسیٰؑ گھر چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں -

(۴) قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا (پ ۲۰ قصص ۲۵)

---

[1] محدثین کی اصطلاح میں حدیث متواتر کے علاوہ تمام روایات کو خبرِ واحد ہی شمار کیا جاتا ہے - اگرچہ اس کی مختلف اقسام عزیز ، غریب ، مشہور قوت و یقین کے اعتبار سے الگ الگ مدارج رکھتی ہیں ، خبرِ متواتر وہ ہے جس کے راوی ہر دور میں اتنے ہوں کہ عادۃً ان کا اتفاق کذب پر محال سمجھا جائے -

حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی نے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔ میرے والد آپ کو بلاتے ہیں، تاکہ آپ کو پانی پلانے کی مزدوری ادا کر دیں"

دینی معاملات ہوں یا دنیاوی کاروبار، خبر واحد پر اعتماد کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ہاں، اگر کہیں شک کی صورت ہو تو دوسرے قرائن کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ محدثین نے اصولِ روایت میں اس پہلو کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

۵۔ وَاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (پ ۱۸، سورہ الطلاق ۲-)

قرآنِ حکیم نے متعدد مقامات پر عادل شاہدوں کی گواہی کو قابلِ اعتماد ٹھہرایا ہے۔ اگرچہ شہادت اور روایت میں بہمہ وجوہ یکسانیت نہیں ہے تاہم اس حکم سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے اہم معاملات کے بارے میں محض دو عادل گواہوں کی شہادت پر قاضی فیصلہ دے سکتا ہے۔ اسی طرح اُنہی صفات سے متصف عادل راویوں کی روایت کیوں نہ قبول ہو گی [1]

چند آیات سے غلط استدلال

تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (الاعراف ۱۴۰) تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل ۸۹) کہا

---

[1] یہاں یہ بات بھی واضح رہے۔ ایک مسلمان کی جان و مال کی حرمت قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ قطعیت اس شکل میں باقی نہیں رہتی جب کہ عدالت میں دو گواہوں کے ذریعے اس کا قاتل ہونا ثابت کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ دو گواہوں کی شہادت ظن اور گمان غالب سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ غور کیا جائے کیا یہاں ایک قطعی الثبوت حکم کی تخصیص ظنی الثبوت معاملہ کے ذریعے نہیں کی جا رہی ہے۔؟

[2] اس تحریر میں کوشش کی گئی ہے کہ ان آیات کا صحیح مفہوم واضح کیا جائے جن کو منکرین حدیث عام طور پر غلط معنیٰ پہنا کر حدیث سے بے اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح دو فائدے حاصل ہوں گے: (۱) قرآن کے بعض اہم مقامات کی صحیح تاویل و تشریح قارئین کرام کے سامنے آ جائے گی۔ (۲) منکرینِ حدیث کی علمی صلاحیت و دیانت کی حقیقت بھی بے نقاب ہو جائے گی کہ کس طرح انہوں نے خدمتِ قرآن کے پردے میں حقائقِ قرآنی کو توڑا موڑا ہے اور اپنے مقاصد کی خاطر آیات کی معنوی تحریف سے باز نہیں آتے ہیں۔

جاتا ہے کہ جب قرآن کا خود اعلان ہے کہ ہر مسئلے کی تفصیل اس میں موجود ہے تو پھر قرآن سے باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ان آیات کا صحیح مطلب یہ ہے کہ قرآن نے دین کے بنیادی اصول اور مہمات شریعت کو بغیر کسی اینچ پینچ کے پوری وضاحت و تفصیل سے بیان کر دیا ہے کہ اشتباہ و ابہام کا شائبہ تک باقی نہیں رہا ہے۔

یہاں لفظ "کل" حقیقی استغراق (ایسا عموم جو تمام افراد کو شامل ہو) کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ کل ایسا ہی ہے جیسا مندرجہ ذیل آیات میں ہے :-

(الف) ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ (پ ۱۴، نحل ۶۹) تو پھر تو کھا ہر قسم کے پھلوں میں سے،

(ب) وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ - (الحج ۱۷) ترجمہ : لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس پیدل اور ہر اونٹ پر سوار ہو کر پہنچیں گے۔

(ج) وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (نمل ۲۳ - پ ۲۹) اسے دنیا کی ہر چیز دی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہاں تمام قسم کے پھل، اونٹوں کے تمام افراد اور ہر قسم کی تمام چیزیں مراد نہیں ہیں۔ آخری آیت وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ پر مزید غور کر لیا جائے۔ یہاں ملکہ سبا کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ اسے ہر قسم کی چیزوں میں سے عطا کیا گیا تھا۔ یعنی امور سلطنت سے متعلق تمام بنیادی لوازمات اس کے پاس موجود تھے۔

یہ لفظ کل اس موقع پر استعمال ہو رہا ہے جب کہ سلیمان علیہ السلام کے پاس لوازمات حکومت و مملکت ملکہ سبا سے کہیں زیادہ تھے۔

باقی رہا یہ دعوی کہ قرآن تمام اصول و فروع اور کلیات و جزئیات کو تفصیلاً بیان کرتا ہے، تو یہ ایسی خام خیالی ہے کہ جو حقیقت اور مشاہدے کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے کہ ان سے متعلق مسائل تفصیلاً تو کجا اجمالاً بھی قرآن میں نہیں ملتے۔ عقلاً بھی یہ درست نہیں ہے کہ قرآن ہر قسم کی تفصیلات پر مشتمل ہوتا۔ پھر تو اسکی بخوبی بھی بیان نہ کی جا سکتی۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (العنکبوت ۴۹) بلکہ وہ روشن نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے سینوں میں جو علم

کی نعمت سے نوازے گئے ہیں"۔

۲ - مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام ۳۸) ہم نے کتاب میں کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا ہے -

صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پوری آیت کو سامنے رکھا جائے وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ٥ زمین میں کوئی جانور نہیں ہے اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے بازوؤں سے اڑتا ہو مگر یہ کہ وہ تمہاری طرح امتیں ہیں، پھر تم اپنے رب کی طرف جمع کئے جاؤ گے۔

سیاق وسباق بتلا رہا ہے کہ یہاں الکتاب سے مراد علم الٰہی ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے -

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ٥ اور جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے - کوئی پتہ نہیں جھڑتا، مگر وہ اُسے جانتا ہے اور نہ کوئی دانہ ہے زمین کی تاریکیوں میں، اور نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ خشک مگر یہ کہ وہ کتابِ مبین موجود ہے -

نیز ملاحظہ ہو سورہ سبا، آیت ۳)

بالفرض اگر یہاں الکتاب سے قرآن ہی مراد لیا جائے تب بھی اس سے سنّت کا انکار لازم نہیں آتا - اس کا مطلب وہی ہو گا جو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے -

(۳) أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (پ ۲۰۔ عنکبوت)

اس آیت کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ جب قرآن ہمارے لئے کافی ہے اور سراپا رحمت و نصیحت ہے تو پھر سنت وحدیث کے سہارے کی کیا ضرورت ہے - یہاں بھی ہوشیاری کے ساتھ آیت کو اصل سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے پیش کیا گیا ہے - یہ استدلال لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ سے کم مضحکہ خیز نہیں ہے -

اس سے پہلے کی آیت میں مشرکین مکہ کے اس مطالبے کو نقل کیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نشانیاں کیوں نہیں دکھلاتے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۔ انہوں (مشرکین مکہ) نے کہا: اس (نبی) پر اس کے رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوتیں۔ کہہ دیجئے نشانیاں اللہ کے اختیار میں ہیں، میں بس صرف کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

اس کے بعد فرمایا أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ ۔ یعنی یہ مشرکین (حسی) نشانیاں کیوں طلب کرتے ہیں۔ ان کے پاس تو سب سے بڑی نشانی اللہ کی کتاب آچکی ہے۔ کیا وہ کافی نہیں ہے۔ اس روشن اور عظیم ترین معجزے کے ہوتے ہوئے جو کہ سراپا رحمت و نصیحت ہے دوسرا معجزہ طلب کرنا بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے۔ سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں سُنت و حدیث سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اصل مقصود تو مشرکین کے مطالبے کا جواب دینا ہے۔

(۴) وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (۶/۱۹) اور میری طرف یہ قرآن اُتارا گیا ہے تاکہ میں تم کو اس کے ذریعے سے آگاہ کردوں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

دوسری جگہ ہے:

قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُم بِالْوَحْيِ (۲۱/۴۷) کہہ دے کہ میں تم کو وحی کے ذریعے سے آگاہ کرتا ہوں۔

ان آیات کی تشریح میں حافظ اسلم صاحب جیراج پوری لکھتے ہیں[1]۔

"حصر ہے کہ سرمایۂ انذار صرف قرآن ہے اور وہی لوگوں کے آگاہ کرنے کے لئے وحی کیا گیا ہے۔ اُسی کو آں حضرتؐ نے لکھوایا اور لوگوں کو یاد کرایا۔"

یہاں بڑی ہوشیاری سے دونوں آیات کے مطالب کو خلط ملط کرکے یہ معنی لئے گئے ہیں کہ سرمایۂ انذار صرف قرآن ہے۔ پہلی آیت میں بغیر کسی حصر کے یہ کہا گیا ہے کہ

---

[1] رسالہ علم حدیث صفحہ ۳۴ شائع کردہ طلوعِ اسلام۔

میری طرف قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے میں تم کو اور جنکو یہ آواز پہنچے ڈراؤں۔ اس آیت میں اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ قرآن کے علاوہ آپ پر کوئی دوسری وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ ہاں دوسری آیت میں حصر کا لفظ اِنَّمَا موجود ہے۔ لیکن وہاں قرآن کے بجائے وحی کا لفظ ہے جو سلف سے خلف تک پوری اُمّتِ مسلمہ کے نزدیک سنت کو بھی شامل ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ بغیر کسی مغالطہ آمیزی کے، کیا قرآن میں کوئی ایسی آیت دکھائی جا سکتی ہے جو واضح طور پر یہ بتلائے کہ وحی کے طور پر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سوائے قرآن کے اور کوئی چیز نازل نہیں ہوئی؟

قرآن میں معنوی تحریف

مذکورہ بالا تفصیلات کے بارے میں تو کسی حد تک یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کسی غلط فہمی کی بنا پر ان آیات سے سنت کے خلاف استدلال کیا گیا ہو۔ لیکن مندرجہ ذیل استدلال تو قرآنی تحریف اور حدیث دشمنی کا کھلا ہوا شاہکار ہے۔ اس طرزِ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے تو باور نہیں کیا جا سکتا کہ سنت کی مخالفت دیانت دارانہ طور پر محض غلط فہمی کی بنا پر کی جا رہی ہے۔

(۵) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ (سورۂ لقمان) آیت کا ترجمہ حافظ اسلم صاحب کے قلم سے اس طرح شائع ہوا ہے:-

"اور لوگوں میں سے وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں، تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں" (علم حدیث ص مقام حدیث ج ا ص ۱۵۶)

حدیث کے معنی عربی زبان میں بات کے ہیں۔ اس لغوی معنی کے اعتبار سے حدیث کا لفظ خدا کی بات، رسولؐ کی بات، صحابہؓ اور عام مسلمانوں کی بات، بلکہ کافروں کی بات اور شیطان کی بات پر بھی بولا جا سکتا ہے۔

(الف) اَللهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا۔ "اللہ نے ملتے جلتے مضامین والی بہترین حدیث نازل فرمائی ہے" یہاں قرآن کو احسن الحدیث کہا گیا ہے۔

(ب) وَإِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ إِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيثًا (پ ۲۸، سورۃ التحریم)

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگوشی کو حدیث سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(ج) وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ (پ ۲۲ - الاحزاب) "اور نہ مشغول ہوتے ہوئے باتوں میں"۔ یہاں صحابہ اور عام مسلمانوں کی گفتگو پر لفظ حدیث کا اطلاق کیا گیا ہے۔

(د) حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ - یعنی کافر مشرک اگر اپنی مجالس میں اسلام کا مذاق اڑاتے ہوں تو اُن کی ہم نشینی سے اجتناب کیا جائے۔ اِلاّ یہ کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ اس موقع پر اعدائے اسلام اور کفار و مشرکین کی گفتگو پر حدیث کا لفظ بولا گیا ہے۔

(ہ) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ - یہاں اُن تمام شیطانی باتوں اور ہتھکنڈوں کو لہو الحدیث قرار دیا گیا ہے جن سے انسان خدا سے غافل ہو کر انسانیت کے لئے گمراہی اور فساد کا باعث بن جاتا ہے۔

اس آیت کو حدیث کے اُس اصطلاحی معنیٰ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے جو محدثین اور فقہاء کے توسط سے اُمت میں منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ سورۂ لقمان مکی سورتوں میں سے ہے۔ مکی دور میں مسلمان مشرکین مکہ کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ان کو حدیث تو کجا قرآن کی کتابت و ترتیب کا موقع بھی بسہولت فراہم نہ ہوتا تھا۔ ان حالات میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مکی زندگی کے پُر آشوب زمانے میں مسلمان حدیث کے مجموعے یا "مشغلے" خریدتے پھرتے تھے۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ کی اس سے بدترین مثال اور کیا ہو گی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ: فَمَا لِهٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (پ ۵، سورۂ نساء ۷۸) "ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ حدیث (بات) کو سمجھ نہیں پاتے۔"

ایک عام مغالطہ

منکرین سنّت کی طرف سے یہ سوال بار بار اٹھایا جاتا ہے کہ اگر دین میں سُنّت کی کوئی اہمیت ہوتی تو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں سُنّت کی تمام تفصیلات کتابی شکل میں مرتب کروا کر اُمت کے ہاتھوں میں دے جاتے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ آخر قرآن کی کون سی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز دین

ہیں حجت ہو اس کا کتابی شکل میں ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ تو اسی قسم کا مطالبہ یا مغالطہ ہے جو قرآن کے مقابلے میں قریشِ مکہ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے:-

أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ (پ ۱۵، سورہ بنی اسرائیل) یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے پر یقین نہیں کریں گے تاوقتیکہ تو ہم پر ایسی کتاب اُتار کر نہ لائے جسے خود ہم پڑھ سکیں۔

اسی طرح اہلِ کتاب نے مطالبہ کیا تھا:

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَن تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَاءِ۔

اہلِ کتاب سوال کرتے ہیں کہ آپ آسمان سے کتاب اُتار کر لائیں۔

یعنی جب تک قرآن کتابی شکل میں لکھا لکھایا ان کے سامنے نہ آجاتے وہ ایمان لانے کے لئے تیار نہ تھے۔ قرآن پاک نے ان کے اس مطالبے کے جواب میں کہا:

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (سورۃ انعام پ ۷) اور اگر ہم آپ پر کاغذ پر لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کر دیتے، جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے مس بھی کر لیتے تب بھی یہ لوگ کہتے کہ نہیں ہے یہ مگر کھلا ہوا جادو۔

قرآن نے ان کے اس مطالبے کو تسلیم کرنے کے بجائے قرآنی عظمت کی یہ نشانی قرار دی کہ وہ اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ ہے۔ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ (سورۃ العنکبوت پ ۲۱) ٹھیک اسی طرح سُنّت کے ذخائر بھی شروع شروع سینوں میں محفوظ رہے اور پھر آہستہ آہستہ سفینوں میں منتقل ہوتے چلے گئے۔

یہ ایک حقیقت ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سُنّت کا بہت بڑا ذخیرہ قلم بند کر لیا گیا تھا۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سنت نام ہے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول فعل اور تقریر کا۔ اور آپؐ کے قول، فعل اور تقریر کا سلسلہ آپؐ کی زندگی کے آخری سانس تک جاری رہا۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ سنّت کا سارا ذخیرہ آپؐ کی زندگی ہی میں کتابی شکل میں مدوّن ہو جاتا۔ پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ سُنّتِ رسولؐ کے حافظ عہدِ نبویؐ میں ہی مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے تھے۔

ارشادات نبوی کی روشنی میں حدیث کا مقام

مِثْلَہٗ مَعَہٗ : حدیث مثل قرآن ہے

(۱) عَنْ اَبِیْ رَافِع رمولیٰ رسُولِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ قَالَ رسول صلی اللہ علیہ وسلم لا الفین احدکم متکئاً علی اریکتہٖ یاتیہ الامر من اَمری مما امرت بہٖ اونھیتُ عنہ فیقول لا ادری ما وجدناہ فی کتاب اللہِ اتبعناہ (ابوداود باب السنۃ۔ ترمذی۔ باب العلم ابن ماجہ، باب السنۃ بیہقی، دلائل النبوۃ، مسند احمد)

ابُو رافع سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسہری پہ تکیہ لگائے بیٹھا ہو۔ اس کے پاس جب میرے احکام میں سے کوئی امر یا نہی پہنچے تو وہ کہدے کہ میں (ان احکام کو) نہیں جانتا۔ ہم نے جو کتاب اللہ میں پایا ہے اسی کی اتباع کرتے ہیں۔

(۲) عن المقدام بن معدیکرب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا انی اوتیت القرآن ومثلہٗ معہٗ۔ الا یوشك رجلٌ شبعانُ علی اریکتہ یقول علیکم بھٰذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ۔ وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ اَلا لا یحل لکم الحمارُ الأھلی

مقدام بن معدی کرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سنو! میں قرآن دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کے مثل بھی۔ سنو! قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا آسودہ حال شخص اپنی مسہری پر بیٹھ کر کہے گا۔ اس قرآن کو لازم پکڑ لو۔ جو تم اس میں حلال پاؤ اُسے حلال قرار دو اور جسے تم حرام پاؤ اُسے حرام ٹھہراؤ۔ سنو! پالتو گدھا حلال نہیں ہے۔ اور نہ درندے حلال

وَلَاکُلُّ ذِی نَابٍ مِنَ السباع وَلَا لُقَطَۃُ معاھِدٍ الا أن یستغنی عنھا صاحبھا ومن نزل بقوم فعلیھم ان یقروہ فان لم یقروہ فلہ أن یعقبھم بمثل قراہ (ابوداؤد، باب السنۃ ترمذی - دارمی باب العلم - ابن ماجہ باب السنۃ مسند احمد مع الفتح الربانی)

ہیں، اور نہ جس سے معاہدہ ہو اس کی گری پڑی چیز اٹھانی جائز ہے، الا یہ کہ اس کا مالک اس سے بے نیاز ہو - اگر کوئی شخص کسی بستی میں (بطور مسافر) قیام کرے تو وہاں کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی مہمانی کا حق ادا کریں" اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ ان کی اس غفلت، کا تاوان لے سکتا ہے -

سند کی حیثیت

یہ دونوں روایتیں متعدد کتابوں میں منقول ہیں، ان کی سند پر محدثین نے اعتماد کیا ہے (معالم السنن خطابی شرح ابوداؤد، جلد نمبر ۷ صفحہ نمبر ۸)

مشکل لغات

الاریکۃ السریر المزین بالحلل والاثواب کما للعروس کنایۃ عن الترفہ والدعۃ کما ھو عادۃ المتکبر القلیل الاھتمام بالدین (مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ ج ۱ ص ۱۵۵)

(اریکہ) عربی میں اس تخت (یا مسہری) کو کہا جاتا ہے جو دلہن کی مسہری کی طرح بیش قیمت پارچہ جات سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس سے دنیاوی خوشحالی اور عیش پسندی مراد ہے - مغرور اور دین سے بے پرواہ لوگوں کا مزاج اسی قسم کا ہوتا ہے -

تشریح احادیث

ان دونوں حدیثوں سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ آپؐ نے اپنی زبان مبارک سے آج سے بہت پہلے انکارِ حدیث کے فتنہ کی خبر واضح الفاظ میں دیدی تھی کہ ایسے لوگ خوشحال، عیش و عشرت سے مالا مال اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارتے ہوں گے۔ دونوں روایات میں اُن کے حال و مقام دونوں کا نقشہ اس انداز سے کھینچ دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں پیش آسکتی۔ یہ اسی قسم کی پیشین گوئی ہے جیسی کہ آپ نے اپنے بعد جھوٹے مدعیانِ نبوت کے ظہور کی خبر دی تھی اور وہ حرف بہ حرف سچی نکلی۔

یہ دونوں قسم کی تحریکات دین کو مسخ کرنے میں یکساں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اجراءِ نبوت کی تحریک امتی کو نبی کا مقام دلوا دیتی ہے اور انکارِ سنت کی تحریک نبی کو امتی کے درجہ میں رکھتی ہے۔

۲۔ حدیث نمبر ۲ میں سنت کو قرآن کا مثل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قرآن اور سنت ہر لحاظ سے یکساں اور ہم رتبہ ہیں۔ یہ عقیدہ حامیانِ سنت میں سے کسی کا بھی نہیں ہے۔ محدثین کرام نے اس حدیث کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

معناه علی وجهین انه اوتی من الوحی الباطن غیر المتلو مثل ما اوتی من الظاهر المتلو۔	حدیث کے مثلِ قرآن ہونے کی تشریح دو طرح کی جا سکتی ہے (۱) جس طرح آپ کو وحی متلو (وحی جلی) اعطا ہوئی ہے اسی طرح وحی غیر متلو (وحی خفی) سے بھی آپؐ کو سرفراز کیا گیا ہے۔
اوتی الکتاب وحیا یتلیٰ و اوتی مثله من البیان ای اذن له ان یعم ویخص وأن یزید علیه وان یشرع مالیس فی الکتاب له ذکر	(۲) آپؐ کو الکتاب بطور وحی دی گئی ہے اس کے مثل بیان و شرح پر مشتمل وحی بھی آپؐ کو مرحمت ہوئی ہے یعنی آپؐ کو اجازت دی گئی ہے کہ آپؐ قرآن کے عموم کو خاص اور

فیکون ذلک فی وجوب الحکم ولزوم العمل کالظاھر المتلو من القرآن یعنی اوتیت القرآن واحکاما ومواعظ وامثالا تماثل القرآن فی کونھا واجبۃ القبول او فی المقدار فیہ ردٌ علی الخوارج والروافض تعلقوا بظاھر القرآن وترکوا السنن التی قد ضمنت بیان الکتٰب فتحیروا وضلّوا (معالم السنن خطابی جلد ۷ صفحہ ۸)

خصوص کو عام قرار دیں۔ اور قرآن سے زائد احکام بیان فرمائیں اور جن امور کا ذکر قرآن میں نہیں ہے ان کو قانونی طور پر اُمت پر لازم کر دیں۔ یہ مماثلت وجوبِ حکم اور لزومِ عمل کی بنا پر ہے یعنی میں قرآن دیا گیا ہوں اور اس کے علاوہ) احکام، مواعظ اور امثال دیا گیا ہوں جن کا قبول کرنا قرآن ہی کی طرح ضروری ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقدار کے اعتبار سے مماثلت مراد ہو اس میں اُن خوارج[1] و روافض کا رد ہے جنہوں نے قرآن کے ظاہری الفاظ کو لے لیا۔ اور قرآن کی تشریحات پر مشتمل احادیث کو نظر انداز کر دیا۔

اس کے بعد امام خطابی کہتے ہیں۔

وفی الحدیث دلیل علی انہ لاحاجۃ بالحدیث ان یعرض علی الکتاب وانہ مھما ثبت عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان حجۃ بنفسہ وامّا ما رواہ بعضھم انہ قال اذا جاء

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کو قرآن پر پیش کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ جب کوئی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بسندِ صحیح، ثابت ہو جائے۔ تو وہ فی نفسہٖ حجت و دلیل ہے، اس قسم کے منکرین نے ایک روایت

---

[1] واضح رہے۔ کہ خوارج، روافض اور معتزلہ کے تمام فرقوں نے سنت کا انکار نہیں کیا ہے اور نہ سنت کے تمام ذخائر کو ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔ ہاں احادیثِ صفات و معجزات کا انکار یا تاویل کی ہے۔ ملاحظہ ہو صواعق مرسلہ ابن قیمؒ ج ۲۔

احدثکم الحدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ فان وافقہ فخذوہ وان خالفہ فلا تاخذوہ فانہ حدیث باطل لا اصل لہ۔ عن یحییٰ بن معین انہ قال ھذا حدیث وضعتہ الزنادقہ۔
(حوالہ مذکور ص۹)

بھی بیان کی ہے کہ جب تمہیں کوئی حدیث ملے تو اس کو قرآن پر پیش کرو یعنی قرآن سے اس کا موازنہ کرو اگر اس کے موافق ہو تو قبول کر لو اور خلاف ہو تو چھوڑ دو حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث سراسر باطل اور بے بنیاد ہے۔ (مشہور محدث) یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ یہ حدیث زنادقہ نے گھڑی ہے۔ اس کی سند انتہائی ناقابل اعتماد ہے۔

اس روایت کی سند پر تفصیلی کلام اس طرح کیا گیا ہے کہ یہ حدیث شام کے راویوں سے منقول ہے۔ یعنی۔ عن یزید بن ابی ربیعۃ عن ابی الاشعث عن ثوبان۔ واضح رہے کہ یزید بن ابی ربیعہ مجہول راوی ہے۔ اس کا سماع ابوالاشعث سے ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح ابوالاشعث اور ثوبان کے درمیان بھی ایک واسطہ غائب ہے (حوالہ سابق)

ایک ثقافتی بزرگ نے لکھا ہے کہ مثلہ معہ کا عقیدہ شرک ہے۔ کلام اللہ اور کلام الرسول دونوں یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ (او کما قال) یہ وہم قطعاً بے بنیاد ہے، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے واضح ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں حدیث کو پرکھنے کے جہاں اور معیار پیش کئے گئے ہیں وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث عصری تقاضوں اور انفرادی و اجتماعی مصالح سے متصادم نہ ہو۔ (ثقافت ماہ جنوری ۱۹۶۲ء) لیکن یہ ایک ایسی کسوٹی ہے کہ اس کی زد میں بہت سی قرآنی آیات بھی آجاتی ہیں۔ جیسا کہ ایک اور ثقافتی بزرگ نے انکشاف کیا ہے کہ قرآن حکم دیتا ہے: اِتَّبِعُوا اَحْسَنَ مَا اُنزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَّبِّکُمْ، اُن کے استدلال کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیات دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک احسن (بہت اچھی) اور دوسری حسن (اچھی)۔ ہم سے احسن کی پیروی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، نہ کہ حسن کی۔ حالات کی رفتار بتلا رہی ہے کہ متجددین اور مغربی

ثقافت زدہ مہربانوں نے سُنّت کو اپنی جدّت طرازیوں کا نشانہ بناتے بناتے قرآن پہ بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب اگر عصری تقاضوں یعنی مغربی ثقافت بازُو سی کثافت کا لحاظ رکھا جائے تو نہ سُود کی حرمت باقی رہتی ہے، نہ زنا حرام رہ جاتا ہے اور نہ شراب سے پرہیز ضروری قرار پاتا ہے، کیونکہ عصری تقاضے اس پہ مُصر ہیں کہ ان سب امور کو بالکلیہ یا اُن کی بعض اقسام کو حلال وطیب ٹھہرائیں۔ اور جو کام قرآن وسنت اور اجماع اُمت کی روشنی میں جائز اور حلال قرار دیئے گئے ہیں، وہ عصری تقاضوں اور خود ساختہ انفرادی اور اجتماعی مصلحتوں کی بنا پر عصری مجتہدین کے نزدیک وحشیانہ شمار ہوں۔ مثال کے طور پر تعدد ازواج کے مسئلہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

احادیث کے پرکھنے کے لئے ایک اہم معیار یہ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ قرآن سے متصادم نہ ہوں۔ اس معیار پر گفتگو سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے لحاظ سے احادیث کا تجزیہ کر لیا جائے۔ تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قرآنی مطالب کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی کتنی قسمیں ہو سکتی ہیں۔

مضمون کے لحاظ سے حدیث کی اقسام

پہلی قسم: ایسی احادیث جو قرآنی آیات سے ملتے جلتے مضامین پر مشتمل ہیں۔ بنیادی عقائد واخلاق پر مشتمل بہت سی احادیث اسی نوع میں شمار ہوتی ہیں۔ اس قسم کی روایات، قرآن مجید سے صرف الفاظ میں مختلف ہوتی ہیں، معنوی لحاظ سے دونوں میں پوری مطابقت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس طرح کی بے شمار روایات میں سے صرف ایک حدیث بطور مثال پیش کی جاتی ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَيُّ الذَّنْبِ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ قَالَ اَنْ تَدْعُوَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ قَالَ ثُمَّ اَيٌّ قَالَ اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ اَنْ يَطْعَمَ	ابن مسعود سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے سوال کیا، اللہ کے ہاں سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، یہ کہ تم اللہ تعالےٰ کے لئے شریک (اسم تپہ، ٹھہراؤ" اُس نے پوچھا

مَعَكَ، قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ اَنْ تُزَانِیَ حَلِیْلَةَ جَارِكَ، فَاَنْزَلَ اللهُ تَصْدِیْقَهَا وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللهِ اِلٰهًا آخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ

(مشکوٰۃ باب الکبائر بخاری ومسلم)

"پھر کون سا گناہ؟" آپؐ نے فرمایا "یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس اندیشے سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گی۔" اُس نے سوال کیا، "پھر کون سا گناہ؟" آپؐ نے فرمایا "کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرو۔" ان ارشادات کی تصدیق وتائید میں اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ "(رحمان کے بندے وہ ہیں) جو اللہ تعالےٰ کے ساتھ دوسرا معبود نہیں پکارتے' اور نہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جس کو اللہ تعالےٰ نے حرمت والا ٹھہرایا ہے' اِلّا یہ کہ کسی حق کی بنا پر اس کا قتل جائز ہو۔ اور نہ وہ بدکاری کرتے ہیں۔"

سورۂ بنی اسرائیل میں قتلِ اولاد کے سلسلے میں فرمایا، وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ، یعنی اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ مشکوٰۃ کتاب الایمان اور کتاب النفاق والکبائر میں اس نوع کی متعدد احادیث ملتی ہیں جو اجمال و تفصیل میں بھی قرآن سے یکساں مطابقت رکھتی ہیں۔

دوسری قسم: ایسی احادیث جن میں قرآن سے زائد مضمون ملتا ہے، اس کی چند شکلیں ہیں۔

(الف) قرآنی اجمال کی تفصیل و تشریح:۔ مثلاً قرآن میں ہے۔

اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ سے متعلق تفصیلات حدیث سے معلوم ہوتی ہیں۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۔ (النساء ۱۰۳)	نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز متعین اوقات میں ادا کرنی ضروری ہے، لیکن اوقات کی پوری تفصیل اور حد بندی حدیث سے واضح ہوتی ہے ۔

(ب) معنی مقصود کی تعیین :-

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۔ (بقرہ ۲۳۱)	پھر بھی اگر طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوتی جب تک ایک اور خاوند سے نکاح نہ کرے ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری طلاق کے بعد بیوی، شوہر پر حرام ہو جاتی ہے۔ اب وہ از سر نو نکاح کر کے بھی اسے اپنے گھر میں آباد نہیں کر سکتا۔ ہاں صرف اس صورت میں جبکہ کسی دوسرے شخص سے وہ نکاح کر لے، اب اگر یہ دوسرا شوہر اس کو طلاق دیدے تو پھر پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے ۔ اس آیت میں نکاح کے معنی صرف ایجاب و قبول کے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد جنسی تعلق بھی ہے، یہ تعیین و وضاحت حدیث سے معلوم ہوتی ہے ۔ اسی قسم کے واقعہ میں آپؐ نے ایک عورت سے فرمایا تھا حَتّٰى تَذُوْقِىْ عُسَيْلَتَهٗ (مشکوٰۃ ج ۲ ۔ باب ۔ المطلقہ ثلاثا، بحوالہ بخاری و مسلم) یعنی محض نکاح (ایجاب و قبول) ہی کافی نہیں ہے بلکہ جنسی تعلق سے عہدہ برا ہونا بھی ضروری ہے ۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰى أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمٰى ۔ (عبس ۱۔۲)	پیشانی پر بل ڈالے اور رُخ پھیر لیا۔ اس بنا پر کہ اس کے پاس نابینا آیا تھا ۔

قرآن مجید سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پیشانی پر بل کس نے ڈالے اور یہ آنے والا نابینا شخص کون تھا۔ اس آیت کا پورا پس منظر حدیث ہی سے معلوم ہوتا ہے ۔

إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ ۝	اور جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اپنے چہرے دھو لو۔

اس آیت میں وضو کا حکم دیا گیا ہے ۔ آیت کے الفاظ عام ہیں، خواہ انسان پہلے سے

با وضو ہو یا بے وضو، بظاہر ان دونوں ہی حالتوں میں اُس پر وضو فرض کیا گیا ہے۔ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باوضو شخص کے لئے تجدید وضو ضروری نہیں ہے، ہاں یہ عمل مزید ثواب کا باعث بن سکتا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ تم پر مردار حرام کر دیا گیا ہے۔

(المائدہ-۳)

کا لفظ عام ہے۔ ہر نوع کے مردے کو شامل ہے۔ لیکن شریعتِ اسلامیہ مردہ مچھلی اور ٹڈی کو حلال ٹھہراتی ہے۔ یہ تخصیص و استثناء حدیث ہی کی بنا پر عمل میں آیا ہے۔

تیسری قسم: سرمایۂ سنت کی تیسری قسم وہ ہے جو قرآن سے زائد ہے اور قرآن اس بارے میں بظاہر خاموش ہے۔ سنت سے ثابت شدہ اس طرح کے احکام کے بارے میں یہ کہنا اپنی جگہ درست ہو گا کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل قرآن میں ضرور پائی جاتی ہے، یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس کا علم نہ ہو سکے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اعلام الموقعین ابن قیمؒ۔ ج ۱ - ص۱۴۱) بلکہ سنت سے ثابت بعض احکام ایسے بھی ملتے ہیں جو قرآن کے ظاہری الفاظ کے مخالف ہوتے ہیں لیکن تعاملِ اُمّت بتلاتا ہے کہ کسی قابلِ ذکر گروہ یا فرقے نے ان سے اختلاف نہیں کیا ہے مثلاً:

قرآن مجید نے سکھائے ہوئے، سدھائے ہوئے شکاری کتّے کا شکار حلال ٹھہرایا ہے، (مائدہ-۵) اس سے معلوم ہوا کہ اگر کتّا باقاعدہ شکار کے لئے تربیت یافتہ نہ ہو تو اس کا شکار حلال نہیں ہے۔ اب ایک صورت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ اگر تربیت یافتہ کتّا شکار میں سے کچھ کھالے تو یہ شکار حلال ہو گا یا نہیں؟ اس بارے میں کوئی واضح ضابطہ قرآن میں نہیں ملتا، لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکار بھی حرام ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح۔ بحوالہ ابوداؤد)

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مُحرِم کے لئے مطلقاً شکار ممنوع ہے، اور جو عمداً شکار کرے اس پر جزاء واجب ہے، (المائدہ-۹۶) لیکن جو احرام میں غلطی سے شکار کر ڈالے اس کی جزاء کی نوعیت کیا ہو گی؟ اس سے قرآن خاموش ہے لیکن حدیث

نے اس کو واضح کیا ہے کہ عمداً اور خطاً دونوں صورتیں جزاء کے لحاظ سے یکساں ہیں۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ ۝ (النساء ۲۳) دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا تمہارے اوپر حرام کر دیا گیا ہے۔

لیکن حدیث اسی پر اکتفاء نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کو بھی بیک وقت نکاح میں رکھنے سے روکتی ہے۔ بظاہر اس اضافے کی کوئی بنیاد قرآن میں نہیں ملتی، لیکن اگر وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ کی علت پر غور کیا جائے تو قرآن ہی سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی اصل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی دو بہنوں کو سوکنوں کی شکل میں رکھنا ان کے رشتۂ اخوت کو قطع کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ یہی علت، خالہ، بھانجی اور پھوپھی، بھتیجی کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنے کی ممانعت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی وضاحت خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے موقع پر فرما دی ہے۔ وَاِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ قَطَعْتُمْ اَرْحَامَكُمْ: اور جب تم یہ کام کرو گے تو اپنی قرابتیں کاٹ ڈالو گے۔

(نیل الاوطار کتاب النکاح بحوالہ ابن حبان، الموافقات شاطبی ج ۳ ص ۱۹۳)

قرآن میں رضاعی رشتے صرف دو حرام قرار دیئے گئے ہیں۔ ماں اور بہن۔ (النساء۔۱۵۲) لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ بھی متعدد رشتے رضاعت کی بنا پر حرام ہیں۔ (مشکوٰۃ ج ۲ باب المحرمات بحوالہ صحیح بخاری)

قرآن مجید میں ایک واضح اصول کے ماتحت نواقض وضو کا ذکر کیا گیا ہے، سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ نیند اور دُبر سے خارج شدہ ریح بھی نواقض وضو میں شامل ہیں۔

قرآن نے خمر کو حرام ٹھہرایا ہے۔ لفظ خمر سے بظاہر شراب کی اتنی ہی مقدار کی حرمت ثابت ہوتی ہے جو نشہ آور ہو لیکن حدیث نے مزید بتلایا۔ مَا اَسْكَرَ كَثِيْرُهٗ فَقَلِيْلُهٗ حَرَامٌ۔ (مشکوٰۃ باب بیان الخمر بحوالہ ترمذی و ابوداؤد) جس مشروب کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ یہ ممانعت، اصولِ سدِّ ذریعہ کی بنیاد پر ہے۔

اب چند مثالیں ایسی بیان کی جاتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ حدیث یا اجماعِ امت کی بنا پر قرآن کا ظاہر مفہوم ترک کر دیا جاتا ہے مثلاً وَرَبَائِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ

(نساء - ۲۳) تم پر وہ ربیبہ[1] لڑکیاں حرام ہیں جو تمہاری نگرانی میں پرورش پا رہی ہوں۔ -
حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ربائب بہر صورت حرام ہیں خواہ وہ زیر پرورش ہوں یا نہ ہوں - اس آیت میں "فی حجورکم" کی قید محض اظہارِ واقعہ کے لئے ہے - کسی قانونی پابندی کے اضافہ کے لئے نہیں ہے - (ابن کثیر ج ۱ صلا۱۷۲ بحوالہ بخاری، مسلم)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا -	اگر تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں اگر نماز میں اختصار کرو -

(نساء - ۱۰۱)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے خوف کی حالت ہی میں نماز قصر کی جا سکتی ہے - لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف کی حالت ہو یا امن کی، دونوں صورتوں میں بحالت سفر قصر کی جا سکتی ہے - بلکہ بعض ائمہ کرام کے نزدیک قصر واجب ہے -

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى -	اے ایمان والو! تم پر قصاص لازم کیا گیا ہے - آزاد، آزاد کے بدلے - غلام، غلام کے بدلے - عورت، عورت کے بدلے -

(بقرہ - ۱۷۹)

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر ڈالے تو وہ مرد قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا - حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں تمام مسلمان یکساں ہیں - تَتَكَافَأُ دِمَائُهُمْ - اس لئے عورت کے بدلے مرد قتل کیا جائے گا - (ابن کثیر ج ۱ صلا۲۱۰)

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا -	بے شک صفا، مروہ پہاڑیاں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جس نے حج یا عمرہ کیا تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے -

(بقرہ - ۱۵۹)

---

[1] وہ لڑکیاں جو عورت کے پہلے خاوند سے ہوں، دوسرے خاوند کے لئے وہ ربائب کہلائیں گی -

اس آیت سے بظاہر صفا اور مروہ کے طواف (سعی) کا جواز معلوم ہوتا ہے، یعنی اگر کوئی ایسا کرلے تو کسی قسم کا گناہ لازم نہ آئے گا، لیکن حدیث میں اس آیت کا جو پس منظر بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفا و مروہ کا طواف واجب ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۹۹ بحوالہ بخاری، مسلم)

لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۗءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (نور - ۳۳)	اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔ اگر وہ عفت و پاکبازی کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔

اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر وہ لونڈیاں عصمت و پاک دامنی کی بجائے کسی اور وجہ سے بدکاری پر آمادہ نہ ہوں تو ان کو اس پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ حدیث میں اس آیت کا جو شانِ نزول بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی قید اتفاقی یعنی اظہار واقعہ کے لئے ہے، احترازی نہیں ہے۔ (ابن کثیر ج ۳ ص ۲۸۹)
خلاصۂ کلام یہ ہے کہ احادیث اپنے مطالب و مضامین کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہیں (۱) قرآن کے مترادف (ہم معنی) (۲) قرآن سے زائد یعنی اس کے اجمال کی تفصیل یا عموم کی تخصیص وغیرہ۔ (۳) ایک الگ حکم کا اثبات جس سے بظاہر قرآن ساکت ہے، بلکہ بعض مواقع پر قرآن کا ظاہری مفہوم حدیث سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ اب اگر قرآن سے عدمِ تصادم اور عدمِ مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ صرف پہلی قسم کی احادیث کو قبول کیا جائے باقی دونوں قسموں کو رد کر دیا جائے تو اس طرح کا خیال اُمّت کے متفقہ تعامل کے یکسر خلاف ہے۔ اس متفقہ تعامل کو قرآن نے سبیل المؤمنین قرار دیا ہے اور اس سے انحراف پر عذابِ جہنم کی شدید وعید سنائی ہے۔
اگر پہلی قسم کی احادیث ہی کو قبول کیا جائے تو یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ پہلی قسم کی احادیث تو قرآن کے ہم معنیٰ ہیں۔ ان کے قبول یا عدمِ قبول سے دینی معاملات میں کوئی فرق نہیں پڑتا، بہرحال اس تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ دوسری اور تیسری قسم کی روایات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو قرآن کا صحیح مفہوم ہی مختل اور پراگندہ ہوکر رہ جائے گا اور نئے نئے مفسرین جب سنت سے بے نیاز ہوکر قرآن کی تفسیر کرینگے

تو امّت کی وحدت پارہ پارہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ مذکورہ بالا شواہد و نظائر سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

خلفاء راشدین اور حدیث نبوی

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت کہ انہوں نے پانچسو احادیث کا مجموعہ نذرِ آتش کر دیا تھا۔ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں :۔ قالت عائشۃ جمع ابی الحدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فکانت خمس مائۃ حدیث، (تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۵) اس روایت کے نقل کرنے کے بعد حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ اس مجموعے کو جلا ڈالنے کا واقعہ صحیح سند سے ثابت نہیں ہے ۔ اگر بالفرض اس روایت کو درست بھی مان لیا جائے تب بھی یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حدیث کو حجت تسلیم نہیں کرتے تھے ۔

ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ کوئی دوسری ہو ۔ جیسا کہ قرآن مجید کے بارے میں بعض مستند روایات میں ملتا ہے ۔ "وقال عثمان للرھط القرشیین الثلاثۃ، اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیئٍ من القرآن فاکتبوہ بلسان قریش فانما نزل بلسانھم ففعلوا حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمان الصحف الی حفصۃ وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواہ من القرآن فی کل صحیفۃ او مصحف ان یحرق" بخاری بحاشیہ السندی ج ۳ ص ۲۲۶ باب جمع القرآن)

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مسلمانوں کو اختلاف قرأت سے بچانے کیلئے تین قریشی صحابہ عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبداللہ بن الحارث سے فرمایا جب تمہارے اور زید بن ثابت کے درمیان (قرآن کے بارے میں) اختلاف ہو جائے تو قرآن کو قریش کی زبان میں لکھو، اس لئے کہ قرآن ان کی زبان میں ہی نازل ہوا ہے ۔

انہوں نے ایسا ہی کیا جب وہ قرآن کے اجزاء کو مصاحف میں لکھ چکے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اصلی قرآنی اجزاء حضرت حفصہ کو واپس بھجوا دیئے ۔ اور ان کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں میں بھیجدیں، ان کے علاوہ جو مصاحف بچے ان کے جلانے کا حکم دیدیا ۔ اس روایت کے مضمون کو منکرینِ حدیث کے مشہور راہنمانے بھی تسلیم کیا ہے ۔ لکھتے ہیں: "بیان کیا جاتا ہے کہ مصحف اصلی کی نقل لینے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بعض متفرق صحیفوں کو جو لوگوں کے پاس تھے اور صحیح قرأت کے مطابق نہ تھے جلانے کا حکم دے دیا۔ بعض فرقے اس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصائب میں بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور ان پر تحریف کا الزام لگاتے ہیں ۔ لیکن عقل کے نزدیک اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کا یہ فعل نہایت مستحسن تھا ۔ کیونکہ ان اجزاء سے اختلافِ

قرأت کا اندیشہ تھا جس سے وہ اُمّت کو بچانا چاہتے تھے۔ اس لیے ایسی حالت میں جب کہ باتفاقِ صحابہ قرأتِ صحیحہ کے مطابق قرآن لکھ لیا گیا، ان اختلافی مواد کا جلا دینا اُمّت پر بہت بڑا احسان تھا۔ (تاریخ القرآن ص۲۱ مصنفہ حافظ اسلم جیراج پوری)

۲۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں ابن سعد نے نقل کیا ہے:۔

الاحادیث کثرت علی عمرؓ فانشد الناس ان یأتوہ بھا فلما اتوہ بھا امر بتحریقھا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص۵)

" یعنی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں احادیث کثرت سے پھیل گئی تھیں، حضرت عمرؓ نے لوگوں سے قسم دے کر کہا کہ وہ احادیث کو ان کے پاس لے آئیں، جب لوگ ان کے پاس احادیث لے کر حاضر ہوتے تو وہ اُن کو جلا ڈالتے"

یہ واقعہ بھی سند کے لحاظ سے ثابت نہیں ہے یعنی یہ روایت منقطع ہے۔ اس واقعہ کے راوی حضرت عمرؓ سے قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق ہیں۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کا زمانہ ہی نہیں پایا، قاسم کی ولادت ۳۶ھ میں ہوئی ہے اور حضرت عمرؓ کی شہادت کے تقریباً تیرہ سال بعد وقوع میں آئی ہے اس طرح سند کی ایک کڑی غائب ہے جب تک اسکا علم نہ ہو اور اسکی ثقاہت قابل اعتماد نہ ہو یہ روایت بھی ناقابلِ قبول ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد ج ۵ ص۱۸۸۔

افسوس ہے کہ منکرینِ حدیث اس قسم کی روایات و آثار کو تو بہت نمک مرچ لگا کر پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کے راویوں پر محدثین نے جو تنقید کی ہے اس کا ذکر تک بھی نہیں کرتے۔ آخر یہ کون سی عمل بالقرآن کی قسم ہے۔

۳۔ مرض الموت کی حالت میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لکھوانے کے لئے قلم دوات طلب کی تھی، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا:۔

"حسبنا کتاب اللہ" یعنی ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ حضرت عمرؓ حدیث کے منکر تھے۔ بلکہ اصل مدعا یہ تھا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت شدید مرض میں مبتلا ہیں اگر اس موقع پر دوات قلم (حسب ارشاد) لائے گئے تو ہو سکتا ہے، کہ آپ کو مزید زحمت و مشقت برداشت کرنی پڑے، اس لئے حضرت عمرؓ نے ازراہِ محبت اس حکم کی تعمیل کو ملتوی کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے یعنی دین کے تمام اصول و کلیات تو قرآن میں موجود ہیں اگر کوئی جزوی ضرورت پیش آ ہی گئی تو قرآن

کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اور اس سے استنباط ہو سکتا ہے، اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کربناک حالت میں مزید تکلیف دینے سے کیا فائدہ؟

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اجتہاد اور استنباط کی دو شکلیں ہیں۔

۱۔ نئے حوادث اور نئی ضروریات کے لئے اگر قرآن و حدیث سے کوئی متعین تفصیلی شکل نہ مل سکے تو پھر قرآن کے پیش کردہ اصول و کلیات کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد و استنباط کی راہ اختیار کی جائے اور اس بارے میں سنت سے بھی مدد لی جائے۔

۲۔ حدیث سے بالکل صرفِ نظر کرتے ہوئے محض قرآن مجید ہی سے استنباط کیا جائے۔

حضرت عمرؓ کی زندگی کے تمام واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسلک پہلا تھا نہ کہ دوسرا۔ اس سلسلہ کی مزید تفصیل آئندہ عرض کی جائے گی۔

۴۔ عن قرظة بن كعب قال لما سيّرنا عمرؓ الى العراق، مشى معنا عمر وقال اتدرون لما شيعتكم قالوا نعم تكرمة لنا قال ومع ذالك انكم تاتون على قرية لهم دوي بالقرآن كدوي النحل فلا تصدوهم بالاحاديث فتشغلوهم جرّدوا القرآن واقلوا الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم (تذكرة الحفاظ ج ۱ ص۴)

”یعنی قرظہ بن کعب کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ہم کو عراق کی طرف روانہ کیا اور ہمارے ساتھ پا پیادہ چلے، آپ نے سوال کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میں تمہیں رخصت کرنے کے لئے کیوں چل رہا ہوں؟“

ہم نے جواب دیا۔ ”ہماری عزت افزائی کے لئے“ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں ایک وجہ یہ بھی ہے اور اس کے ساتھ میرا مقصد یہ بھی ہے کہ تمہیں یہ ہدائت دے دوں کہ تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جن کو قرآن سے خاص شغف ہے ان کے قرآن پڑھنے کی گنگناہٹ تم اس طرح سنو گے جس طرح شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ تم احادیث سنا کر ان کو (قرآن سے) باز نہ رکھنا، قرآن مجید کی تعلیم علیحدہ دو اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم بیان کرو۔

اس روایت کے آخری الفاظ ”اقلوا الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم“ نے حدیث کے بارے میں حضرت عمرؓ کے مسلک کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ ان کا منشا یہ تھا (بشرطیکہ یہ روایت صحیح ہو) کہ احادیث کی نقل و روایت اس کثرت

اور انہماک سے نہ کی جائے کہ انسان بے احتیاطی کا شکار ہو جائے، رطب و یابس کے جمع کرنے میں کوئی تمیز نہ رہے اور تلاوتِ قرآن و تدبّر قرآن کا جو فریضہ مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے اس میں کمی آجائے۔

اس امر کی طرف راہ نمائی خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمائی ہے :-
مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ مسلم ج ۲ صہ ۴۱۴ -
یعنی جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے!
ظاہر ہے کہ جب احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا تو مذکورہ بالا وعید کا مستحق بنے بغیر انسان نہیں رہ سکتا۔

۵ - حضرت عمرؓ کی طرف یہ واقعہ بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بار صحابہ کرام کو جمع کیا اور احادیث کی جمع و تدوین کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ صحابہ کرام نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے کچھ سوچنے کے بعد یہ کہتے ہوئے اپنا ارادہ فسخ کر دیا کہ " لا أشوب كتاب الله بشئ أبداً وفي رواية لا ألبس " یعنی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی دوسری چیز کی آمیزش نہیں کرنا چاہتا یا میں اللہ کی کتاب کو مشتبہ کرنا نہیں چاہتا "
(تدریب الراوی ص ۱۵۱ بحوالہ البیہقی فی المدخل ص ۴۰۷)

تنویر الحوالک بحوالہ ذم الکلام للہروی سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ سے اس روایت کے راوی عروہ ہیں جن کی ولادت ۲۳ھ یا دورِ عثمانی میں ہوئی ہے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت بھی ۲۳ھ ہی میں ہوئی ہے۔ اس لئے یہ روایت بھی منقطع اور ناقابلِ اعتماد ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تہذیب ابن حجر۔ ج ۷ ص ۱۸۲

بالفرض اگر اس روایت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی حدیث کے ماخذِ شریعت ہونے پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

حضرت عمرؓ کا کتابتِ حدیث سے اختلاف اس بنا پر تھا کہ کہیں قرآن و حدیث کے نوشتے خلط ملط نہ ہو جائیں اسی اندیشہ کی بنا پر بعض دوسرے صحابہ بھی متردد تھے، لیکن اس کے باوجود حدیث کو دینی حجت مانتے تھے۔ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد کتابتِ حدیث کی

قائل تھی۔ ملاحظہ ہو جامع بیان العلم اور مقدمہ ابن الصلاح۔ اس بارے میں مزید تفصیل آئندہ عرض کی جائے گی (ان شاء اللہ)

۶۔ قیل لابی ھریرۃ اکنت تحدث فی زمن عمر ھکذا قال لوکنت اُحدث فی زمن عمر مثل ما احدثکم لضربنی بمخفقتہ (تذکرۃ الحفاظ ذھبی ج ۱ ص ۷)

حضرت ابوہریرہؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا تم حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی اسی طرح حدیث بیان کرتے تھے؟" حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسی طرح حدیث بیان کرتا جس طرح اب بیان کرتا ہوں تو وہ میری دُرّے سے خبر لیتے۔"

یہ روایت انتہائی ضعیف (منقطع) ہے امام ذہبیؒ (ف ۷۴۸ھ) نے اسے دراوردی یعنی عبدالعزیز بن محمد کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ دراوردی کی وفات ۱۸۶ھ میں ہوئی (اللباب ابن الاثیر ط ۴۹۶) یعنی دراوردی دوسری صدی میں ہوئے اور امام ذہبیؒ کا زمانہ آٹھویں صدی کا ہے یوں دونوں کے درمیان پانچسو سال کا فاصلہ ہے۔ بیچ کی بہت سی کڑیاں غائب ہیں

ایک مرتبہ اسی محتاط طرز عمل کی بنا پر جس میں کبھی کبھی شدت بھی آجایا کرتی تھی حضرت ابی بن کعب نے حضرت عمرؓ کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

امیر المومنین! آپ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اتنی شدت کیوں اختیار کئے ہوئے ہیں؟"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا "اُرید ان اتثبت" یعنی احادیث کے نقل و روایت کے بارے میں یہ سختی اس بنا پر ہے کہ احادیث خوب تحقیق اور چھان بین کے بعد بیان کی جائیں۔"

(ملاحظہ ہو الرسالہ للامام شافعی، ص ۴۳۴)

ابن حزمؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابی بن کعب کی اس فہمائش کے بعد روایات میں سے خبر واحد کو بھی دوسرا شاہد طلب کئے بغیر قبول کر لیا کرتے تھے۔ اصل الفاظ یہ ہیں " بعد العتاب کان یقبل خبر الواحد من غیر شاھد" (الاحکام ج ۲ ص ۱۴۰)

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ خبرِ واحد کو دوسرے شاہد کے بغیر قبول نہ کرتے تھے۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے اپنی پوری زندگی میں صرف ایک بار یعنی توریث جدّہ (دادی کو وارث بنانے) والی روایت میں گواہ طلب کرنا منقول ہے کسی دوسرے موقع پر آپ کا یہ طرزِ عمل ثابت نہیں ہے:۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کبھی کبھار کسی خبرِ واحد کے معاملہ میں احتیاط اور اطمینانِ قلب

کے لئے گواہ طلب کر لینے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ حضرات شیخین (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) حدیث کو شریعت کا ماخذ ہی نہیں مانتے تھے۔

۷۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں ایک واقعہ یہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابودرداء، ابن مسعود اور ابومسعود انصاری کو روایتِ حدیث کی بنا پر نظر بند کر دیا تھا۔ یہ واقعہ نہ سنداً درست ہے اور نہ درایتہً اس کی صحت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اس روایت کی سند منقطع ہے یعنی حضرت عمرؓ سے اس واقعہ کے راوی ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف ہیں، انہوں نے سنِ رُشد کی حالت میں حضرت عمرؓ کا زمانہ ہی نہیں پایا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے وقت اُن کی عمر صرف تین سال تھی (ملاحظہ ہو الاکمال فی اسماء الرجال للخطیب صاحب المشکوٰۃ ص۵۸۶)

پھر یہ بات بھی ناقابلِ فہم ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کردہ احادیث کی تعداد (۸۴۸) حضرت ابوالدرداء کی (۱۷۹) اور ابومسعود انصاری کی اس سے بھی کم ہے، حضرت ابوہریرہ کی مرویات کی تعداد (۵۳۷۴) ہے۔ اب جن حضرات کی روایات تعداد میں کم ہیں اُن کو بند کر دیا گیا اور حضرت ابوہریرہ کو جو کثیر الروایہ ہیں آزاد چھوڑے رکھا۔ بلکہ مستند روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو عراق اور حضرت ابودرداء کو شام کا مُعلّم بنا کر بھیجا تھا یہ حضرات اپنے اپنے مقام پر قرآن و حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے (تذکرۃ الحفاظ ا ص۱۳-۲۴)

۸۔ حضرت علیؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حدیث قبول کرنے سے پہلے راوی سے حلف لیا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے اس طرزِ عمل کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا حضرت علیؓ حدیث کو دین میں حجت ہی نہیں مانتے تھے۔

اس بارے میں مصر کے مشہور عالم ابوزہرہ نے لکھا ہے:

"علیؓ کان یستحلف فی جمیع الامور والشھادات، کان یقول ان خبرہٗ کان مزکّیٌ بیمینہ" (حیات ابی حنیفہ ص۲۷۷)

حضرت علیؓ تمام معاملات اور شہادتوں میں حلف لیا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اس طرح قسم اور حلف کے ذریعے خبر پاکیزہ اور قابلِ اعتماد ہو جاتی ہے۔" یعنی ان کا یہ طرزِ عمل صرف حدیث ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ بلکہ عام طور پر تمام اہم معاملات اور شہادات میں بھی اطمینانِ قلب کے لئے ایسا ہی کرتے تھے۔

دوسرا رُخ

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے مندرجہ بالا واقعات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ معاملہ کا دوسرا رُخ بھی سامنے رہے۔

۱۔ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب کسی مسئلہ کے بارے میں حل طلب کیا جاتا تو پہلے آپ قرآن مجید کی طرف رجوع فرماتے اور پھر سنت سے راہ نمائی حاصل کرتے۔ حافظ ابن القیمؒ کا بیان ہے کہ:

عن میمون بن مهران قال كان ابوبكر الصديق اذا ورد عليه حكم نظر في كتاب الله فان وجد فيه ما يقضي به قضى به وان لم يجد في كتاب الله نظر في سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم فان وجد فيها ما يقضي به فقضى به فان اعياه ذلك سأل الناس هل علمتم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قضى فيه بقضاء فربما قام اليه القوم فيقولون قضى فيه بكذا وبكذا، فان لم يجد سنة سنها رسول الله صلى الله عليه وسلم جمع رؤس الناس فاستشارهم فاذا اجتمع رأيهم على شئ قضى به وكان عمر يفعل ذلك فاذا اعياه ان يجد ذلك في الكتاب والسنة قال هل كان ابوبكر قضى فيه بقضاء فان كان لابي بكر قضاء قضى به والا جمع الناس واستشارهم فاذا اجتمع رأيهم على شئ قضى به۔

(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۶۲)

"میمون بن مہران سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا معمول تھا کہ جب ان کے پاس کوئی فیصلہ طلب معاملہ آتا تو پہلے کتاب اللہ میں غور کرتے اگر اس میں فیصلہ کرنے کے لئے حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر ڈالتے اور اگر کتاب اللہ میں نہ پاتے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں غور و فکر کرتے، اگر وہاں کوئی حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرماتے اگر یہاں بھی دشواری پیش آتی تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ کیا تمہیں علم ہے کہ اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فیصلہ فرمایا ہے۔ بسا اوقات

ایسا ہوتا کہ لوگ کھڑے ہوجاتے اور بتلاتے کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اور ایسا فیصلہ دیا ہے۔ اگر اس شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فیصلہ کا علم نہ ہوتا تو آپ لوگوں میں جو رہنمائی اور سیادت و قیادت کا منصب رکھتے تھے ان کو جمع کرتے اوران سے مشورہ لیتے جب کسی ایک رائے پر اتفاق ہوجاتا۔ تو آپ اس کے مطابق فیصلہ کرلیتے حضرت عمرؓ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔ جب ان کو کتاب و سنت سے کوئی حکم نہ ملتا تو لوگوں سے معلوم کرتے، کیا حضرت ابوبکرؓ نے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہے، اگر حضرت ابوبکرؓ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اسی کے مطابق وہ خود بھی زیرِ غور معاملہ کو حل فرماتے ورنہ لوگوں کو جمع کرتے اوران سے مشورہ لینے کے بعد متفق علیہ رائے کے مطابق فیصلہ کرتے۔"

۲ - یہی بات حضرت ابوبکرؓ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمائی ہے:-

اطیعونی ما اطعتُ اللہ ورسُولہ، میری اطاعت کرو جب تک کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر کاربند رہوں (البدایہ والنہایہ ج ۶ ص۳۰۱) اس کے بعد فرمایا، فاذا عصیتُ اللہ ورسولہُ فلا طاعۃ لی علیکم، جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کردوں تو پھر میری اطاعت تم پر لازم نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ رُواۃ کے لحاظ سے یہ خطبہ قابلِ اعتماد ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔

اس خطبہ میں اطاعتِ رسول سے مراد سنتِ رسول ہی سکتی ہے کیونکہ قرآن کی اطاعت تو پہلے ہی مَا اطعت اللہ میں مذکور ہے۔

منکرینِ حدیث نے زیادہ تر حضرت عمرؓ کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی ہے اور روایت حدیث کے بارے میں ان کے محتاط رویہ کو اس طرح مبالغہ آرائی بلکہ غلط بیانی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ایک بے خبر شخص دھوکہ کھا سکتا ہے۔ لیکن اگر مندرجہ ذیل ارشادات پر سرسری نظر بھی ڈال لی جائے تو حضرت عمرؓ کا مسلک پوری طرح واضح ہوکر سامنے آجائے گا۔

۱ - حضرت عمرؓ نے فرمایا :-

سیاتی قوم یجادلونکم بشبہات القرآن فخذوھم بالسنن فان اصحاب السنن اعلم بکتاب اللہ (مقدمۃ المیزان للشعرانی ص۶۲)

"عنقریب ایک قوم آئیگی جو قرآن میں شبہات پیدا کرکے تم سے بحث و مناظرہ کرے گی۔ ایسے لوگوں پر احادیث کے ذریعے گرفت کرو۔ اس لئے کہ سنت کی معرفت رکھنے

والے اللہ کی کتاب سے زیادہ باخبر ہیں۔"

۲ - ان عمر بن الخطاب کان یقول اصحاب الرای اعداء السنن أعیتھم الاحادیث ان یعوھا، واستحیوا حین سئلوا ان یقولوا لانعلم، فعارضوا السنن برأیھم فإیاکم وایاھم۔ اعلام الموقعین (۱ ج ا ص۴۵)

"حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے، رائے اور قیاس والے سنت کے دشمن ہیں، احادیث کا یاد رکھنا ان کو دشوار ہو گیا ہے، اور جب اُن سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا ہے تو انہیں لانعلم (ہم نہیں جانتے) کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ لوگ اپنی ذاتی آراء (دماغی اختراعات) سنت کے مقابلہ میں لے آتے، ان سے دور رہو۔"

۳ - قال عمرؓ ردوا الجہالات الی السنۃ۔

جن باتوں کا علم نہ ہو ان کو سنت کی طرف لوٹاؤ۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص۱۸۷)

۴ - قال عمر تعلموا الفرائض والسنۃ کما تتعلمون القرآن ۰

(جامع بیان العلم ج ۲ ص۱۲۳)

"حضرت عمرؓ نے فرمایا فرائض (احکام وراثت) اور سنت اس طرح سیکھو جس طرح قرآن مجید سیکھتے ہو۔

حضرات شیخین (حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ) کے یہ چند نمایاں اقوال جو مستند اور قابل اعتماد راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں ان کی تفصیل تھی۔ اب ذیل میں چند ایسے واقعات وشواہد پیش کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہو سکتا ہو، کہ خلفائے راشدین عملاً حدیث پر کس طرح کاربند رہتے تھے۔

خلفاءِ راشدین کا طرزِ عمل

۱ - امام بخاری کہتے ہیں:-

وکانت الائمۃ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستشیرون

الأمناء من أهل العلم، فی الامور المباحۃ لیاخذوا بأسهلها فاذا وضح الکتاب والسنۃ لم یتعدوہ الی غیرہ اقتداء بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم، ورای ابوبکر قتال من منع الزکوٰۃ، فقال عمر کیف تقاتل وقد قال رسول اللہ امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ فاذا قالوا لا الٰہ الا اللہ عصموا منی دماءھم واموالهم الا بحقها وحسابهم علی اللہ فقال ابوبکر واللہ لاقاتلن من فرق بین ما جمع رسول اللہ ثم تابعہ عمر فلم یلتفت ابوبکر الی مشورۃ اذ کان عندہ حکم رسول اللہ فی الذین فرقوا بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ وارادوا تبدیل الدین واحکامہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بدل دینہ فاقتلوہ۔

(صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۱۳ ص۳۳ کتاب الاعتصام باب قول اللہ تعالیٰ وامرھم شوریٰ بینھم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے اسلام مباح امور میں قابلِ اعتماد اہل علم سے مشورہ لیا کرتے تھے تاکہ سہل ترین راہ اختیار کرسکیں جب کتاب وسنت کا واضح حکم سامنے آجاتا تو پھر کسی دوسری چیز کی طرف رُخ نہ کرتے کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی طرزِ عمل تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا آپ ان پر کیسے فوج کشی کرسکتے ہیں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ کلمہ پڑھ لیں۔ اس طرح وہ مجھ سے اپنی جانیں اور مال محفوظ کرلیں گے الّا یہ کہ اسلام کا حق ان سے وابستہ ہو۔ اور انکا محاسبہ اللہ کے ذمّہ ہے حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا۔ بخدا میں ان لوگوں سے جہاد کروں گا جو ان چیزوں کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں جن کو اللہ کے رسولؐ نے ایک سی حیثیت دی ہے۔ آخر حضرت عمرؓ بھی انہی کے ہمنوا ہوگئے۔

حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مشورہ کی پرواہ نہ کی کیونکہ ان کے پاس نماز اور زکوٰۃ کے مابین تفریق کے قائلین کے بارے میں حکم رسولؐ موجود تھا۔ اس قسم کے لوگ دین کے احکام بدل دینا چاہتے ہیں۔ ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو دین تبدیل کرے اسے قتل کرڈالو۔"

اس بارے میں غور طلب معاملہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنے سے حدیث کی بنیاد پر روکا تھا۔ اب اگر حضرت ابوبکرؓ حدیث کو صرف تاریخ دین سمجھتے تھے تو ان کو چاہیئے تھا کہ وہ حضرت عمرؓ کو حدیث پیش کرنے پر روکتے، لیکن اس کے بجائے انہوں نے حدیث کا ایسا مطلب بیان کیا جس سے ان کی غلط فہمی رفع ہوگئی اور ان کی پیش کردہ روایت کا مفہوم بھی واضح ہوگیا۔

۱ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب دورِ صدیقی میں حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ نے اپنے اپنے حصے کا مطالبہ کیا (بخاری پ ۲)

اور ازواج مطہرات نے حضرت عثمانؓ کے ذریعے اپنا حق وراثت طلب کیا (بخاری ومسلم) تو حضرت ابوبکرؓ نے سب کو ایک ہی حدیث سنا کر مطمئن کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا نورث ما ترکنا صدقۃ"، یعنی انبیاء کرام کا متروکہ مال میراث کے طور پر تقسیم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اُمت کے غربا کا حق ہے۔ (بخاری ومسلم، مشکوٰۃ ص۵۵۰) حضرت فاطمہؓ جنہوں نے اس مطالبہ پر اصرار کیا تھا بعد میں راضی ہوگئیں (بیہقی ج ۶ ص۳۰۱)

۲ - حضرت عمرؓ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ مقتول شوہر کی دیت سے اس کی بیوی حصہ پائیگی یا نہیں۔ حضرت عمرؓ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ اس موقع پر ضحاکؓ بن سفیان حضرت عمرؓ سے کہتے ہیں کہ میرے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نوشتہ موجود ہے آپ نے اشیم ضبابی کی بیوی کو اپنے شوہر کی دیت سے حصہ لینے کا حقدار ٹھہرایا تھا یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلے سے رجوع فرمایا اور اس حدیث کے مطابق فیصلہ دیا۔

(ابوداؤد۔ موطا امام مالک ص۲۷۸ ج۲)۔

۳ - حضرت ابوبکرؓ سے جب دادی کے حق کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ اپنے پوتے کی میراث میں سے کتنا حصہ لے گی تو حضرت ابوبکرؓ نے اس بارے میں صحابہ سے دریافت کیا محمد بن سلمہؓ اور مغیرہؓ بن شعبہ نے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

(موطا امام مالک باب میراث الجدہ)

۴ - اسی طرح جنین کی دیت کے بارے میں حضرت عمرؓ حمل بن مالک کی روائت قبول کر لیتے ہیں، اس موقع پر حضرت عمرؓ تو ضحاک بن سفیان سے کہتے ہیں کہ بھائی تم تو نجد کے رہنے

والے ہو اور نہ حمل بن مالک سے فرماتے ہیں کہ تم تو تہامہ کے باشندے ہو تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت و صُحبت کا بہت کم موقع ملا۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ تمہاری یہ روائیتیں مہاجرین و انصار کے علم میں نہ آئیں اور تمہیں یہ شرف حاصل ہو گیا، ایک آدمی روایت کے بارے میں بھول کا بھی شکار ہو سکتا ہے اور اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ بھی دونوں روایات کو بغیر کسی جرح قدح کے قبول فرما لیتے ہیں۔

۵ - حضرت عثمانؓ کا خیال تھا کہ جس عورت کا شوہر مر جائے تو وہ جہاں چاہے عدّت گذار سکتی ہے لیکن جب ابو سعید خدری کی بہن فریعہ بنت مالک نے اپنا واقعہ پیش کیا کہ میرا شوہر قتل کیا گیا تھا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپؐ نے شوہر کے مکان پر عدّت گذارنے کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت عثمان رضؓ نے اسی روایت کے مطابق فیصلہ کیا۔ (موطا امام مالک مطبع مجتبائی دہلی ، باب مقام المتوفی عنہا زوجہا)

۶ - حضرت علی رضؓ کے پاس چند مرتد افراد لائے گئے آپ نے ان کو آگ میں جلا ڈالنے کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے حدیث پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ من بدل دینہ فاقتلوہ۔ یعنی مرتدین کا خاتمہ تلوار سے کیا جا سکتا ہے نہ کہ آگ میں جلا کر۔ حضرت علی رضؓ نے یہ سن کر فرمایا۔ صدق ابن عباس۔ یعنی حضرت عباس نے سچ بات کہی ہے۔ (ترمذی ابواب الحدود)۔

اختلافِ حدیث

منکرینِ سُنت کی طرف سے ایک شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ احادیث آپس میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی اور ٹکراتی ہیں۔ ایک حدیث میں کسی بات کا اثبات ہے تو دوسری جگہ اس کی نفی ہے۔

یہ شبہ بھی دراصل اس بنا پر پیدا ہوا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے علمِ حدیث کی پوری تفصیلات نہیں ہیں ۔ یہ اختلاف و تعارض صرف ظاہری شکل میں ہے، معنوی اعتبار سے نہ احادیث میں تضاد پایا جاتا ہے اور نہ تناقض۔ اس اختلاف و تعارض کی نوعیت تقریباً مندرجہ ذیل آیات کے ظاہری اختلاف سے ملتی جلتی ہے:

ا۔ سورہ انعام میں مشرکین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنے مشرکانہ عقائد سے برأت کا اظہار کریں گے اور قسم کھا کر کہیں گے۔ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (پ انعام آیت ۲۳) لیکن دوسری آیت میں مشرکین کے بارے میں ارشاد ہے، وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا وہ اللہ تعالےٰ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے (پ۵ سورہ النساء آیت ۴۲)

ب۔ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ پ۲۰ سورہ قصص آیت ۷۸۔ اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں پرسش نہ ہوگی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ پ۱۴ سورہ حجر آیت ۹۲/۹۳ تیرے رب کی قسم ہم ان سب سے پوچھیں گے ان اعمال کے بارے میں جو وہ کرتے رہے ہیں۔

ج۔ فَلَا اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ۔ (پ۱۸ سورہ المومنون آیت ۱۰۱) یعنی اس دن وہ آپس میں ایک دوسرے سے سوال نہ کریں گے۔ اور وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ (پ۲۳ سورہ الصافات آیت ۱۲۷) اور ایک دوسرے پر سوال کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔

امام بخاریؒ نے اپنی جامع صحیح میں اسی نوع کی آیات جمع کر کے حضرت ابن عباسؓ کی بیان کردہ تطبیق اور رفع تعارض کی تفصیلات کو نقل کیا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ جن محدثین کو منکرینِ حدیث "عجمی سازش" کا بانی مبانی قرار دیتے ہیں انہی میں سے

ایک عظیم المرتبت شخصیت کو قرآن مجید کے تحفظ اور دفاع کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صحیح بخاری مصری کتاب التفسیر سورہ حم سجدہ ج ۳ ص ۱۸۳

محدثین کرام نے احادیث کے درمیان تعارض رفع کرنے کی متعدد شکلیں پیش کی ہیں:۔

۱ - پہلے کوشش کی جائے گی کہ دو متعارض روایات کی ایسی تشریح بیان کی جائے کہ بغیر کسی تکلّف کے دونوں روایات کا تعارض رفع ہو جائے۔

۲ - اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر غور کیا جائے گا۔ ان دونوں میں سے ناسخ روایت کون سی ہے اور منسوخ کون سی۔

۳ - اگر ناسخ منسوخ کا پتہ بھی نہ چل سکے، تو پھر اس روایت کو ترجیح دی جائیگی جو راویوں کی کثرت یا ان کی عدالت و ثقاہت کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتی ہوگی۔ محدثین نے ترجیح کے سلسلے میں پچاس وجوہ لکھی ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص۱۴۳)

اسی بنا پر حافظ ابن الصلاح نے محدث ابن خزیمہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نہیں مانتا کہ دو صحیح السند روایات کے درمیان حقیقی تعارض بھی ہو سکتا ہے اگر کسی کے پاس ایسی دو حدیثیں ہوں تو میرے پاس لائے تاکہ میں ان کے درمیان جمع و تطبیق کی شکل نمایاں کر کے دکھلا دوں (بعض متعارض روایات کی مثالیں آئندہ پیش کی جائیں گی۔ انشاء اللہ)

چار لاکھ روایات

منکرین حدیث کی طرف سے بڑی شدّومد کے ساتھ ایک شبہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب "الجامع الصحیح" "چار لاکھ" احادیث میں سے منتخب کر کے ترتیب دی ہے۔ صحیح بخاری کی تمام احادیث کی تعداد سات ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آخر روایات کی یہ عظیم تعداد کہاں سے آئی اور کیوں نظر انداز کر دی گئی۔ اسی طرح دوسرے محدثین امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہم کے بارے میں بھی منقول ہے کہ انہوں نے لاکھوں احادیث میں سے اپنے مجموعے مرتب کئے۔ او کما قال۔

اس بارے میں صحیح شکل یہ ہے کہ تین چار لاکھ کی تعداد سُن کر متوحش ہونے کے بجائے یہ سوچا جاتے کہ اس تعداد کی اصل وجہ کیا ہے۔

(الف) کہ یہ کثرتِ تعداد اس بنا پر ہے کہ ایک ایک حدیث کی متعدد سندیں ہیں، محدثین کے نزدیک ایک ایک سند اپنی جگہ ایک حدیث شمار ہوتی ہے تلقیح ابن الجوزی ص۱۸)

مثلاً اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اس حدیث کی سندوں کی تعداد تین سو تک پہنچتی ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ ایک حدیث نہیں بلکہ تین سو احادیث ہیں۔ لیکن اگر متنِ حدیث کے لحاظ سے دیکھا جائے تو حدیث صرف ایک ہی ہے۔

(ب) محدثین نے صحابہ کے آثار (اقوال و افعال) اور تابعین کے فتاویٰ کو بھی حدیث کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو مرفوع یعنی براہ راست آنحضورؐ کے اقوال و افعال پر مشتمل روایات کی تعداد اور بھی کم رہ جاتی ہے۔

(ج) قرآن مجید کی تفسیر کے سلسلے میں بعض آیات کی تفسیر میں صحابہ یا تابعین کے متعدد اقوال منقول ہیں۔ مثلاً لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ کی تفسیر میں دس قول مروی ہیں، اسی طرح ماعون کی تفسیر میں سلف کے سات اقوال ملتے ہیں، علماء سلف کے عرف میں ہر قول ایک حدیث شمار کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فرق صرف اصطلاح کے لحاظ سے ہے نہ کہ اصل حقیقت اور معنویت کے اعتبار سے اس تفصیل کو سامنے رکھتے ہوئے امام حاکمؒ کا یہ بیان اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ اعلیٰ قسم کی احادیث کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔" اسی طرح اگر تمام رطب و یابس روایات کو شمار کیا جائے۔ تو ان کی تعداد پچاس ہزار سے متجاوز نہ ہوگی۔

سُنّت اور اتحادِ ملّت

پس منظر

اصل موضوع کو زیرِ بحث لانے سے پہلے اس عنوان کا پس منظر اور ان محرکات کا تذکرہ کرنا مناسب ہے جو اس موضوع کے انتخاب کا سبب بنے۔

کچھ عرصے سے ہمارے ملک میں ایک ایسا گروہ میدانِ عمل میں مصروفِ کار ہے جس نے سنّت کے بارے میں طرح طرح کی بے بنیاد غلط فہمیاں اور شبہات پھیلا رکھے ہیں۔ یہ حضرات سادہ لوح اور بے خبر عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے سب سے بڑا حربہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ فقہی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سنت ہی دراصل سرچشمۂ اختلاف ہے کہ جس کی بناء پر بے شمار فرقے بنے اور اُمتِ مسلمہ کئی ٹولیوں میں منقسم ہو گئی، اور اختلاف سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ سنت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا جائے۔ اس پر بس نہیں بلکہ اس گروہ کی طرف سے سنّت کے قیمتی ذخیرے کو "عجمی سازش" کا نام دیا جاتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ گروہ سُنّت کا دامن چھوڑ کر صرف قرآن سے وابستہ ہونے کا دلفریب دعویٰ کرتے ہوئے اپنے خود ساختہ افکار کو اُمت میں پھیلانا چاہتا ہے۔

گو آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے بھی اس قسم کی آواز اٹھی تھی، لیکن اس دور میں یہ تحریک ایک نہایت سائنٹیفک لبادہ اوڑھ کر میدان میں آئی ہے۔

اس وقت مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت حسبِ ذیل چار نکات تک ہی گفتگو محدود رہے گی۔

کیا سُنّت باعثِ اختلاف ہے؟

اس گروہ کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ سنّت اب تک اُمّتِ مسلمہ میں تفریق و اختلاف کے بیج بوتی چلی آتی ہے۔ آیئے، تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے دیکھیں کہ کیا قرآن کریم سے غلط استدلال کرتے ہوئے قرآن کریم ہی کو مرجعِ اختلافات نہیں بنا یا گیا، اور کیا قرآن کریم سے غلط دعاوی اور باطل مزعومات ثابت کرنے کیلئے حجّت بازی نہیں کی گئی۔ اگر یہ بات ثابت ہوجائے تو منکرینِ سُنّت قرآن مجید کے بارے میں کیا رویّہ اختیار کریں گے؟ اس گذارش کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن کی بنا پر اختلاف پیدا ہوا۔ بلکہ یہ تو لوگوں کا اپنا قصورِ فہم تھا کہ انہوں نے قرآن مجید کو اختلافات کا سرچشمہ بنادیا، یا پھر غور و فکر اور طریقِ اجتہاد میں اختلاف کی بنا پر ایک سے زیادہ آراء اُمت کے سامنے آئیں۔

حدیث کی تاریخی حیثیّت

(۲) منکرینِ سنت اگرچہ حدیث کو دینی حیثیت نہیں دیتے، لیکن تاریخی حیثیت سے اُن کو بھی انکار نہیں ہے۔ یہاں اس "تاریخ" سے چند واقعات بیان کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد کئی ایسے بڑے بڑے اختلافات سامنے آئے جن کی بنا پر اُمت میں شدید اختلاف کا امکان تھا۔ لیکن اس وقت حدیثِ نبویؐ ہی وہ واحد قوت تھی، جس نے آنِ واحد میں تمام اختلافات ختم کردیئے اور اُمت کا شیرازہ بکھرنے سے بچ گیا۔

انکارِ حدیث سے اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی ہے

(۳) منکرینِ سنت حدیث کو تو سرچشمۂ اختلاف گردانتے ہیں۔ لیکن ہمیں دیکھنا ہوگا کہ آیا یہ حضرات حدیث کا دامن چھوڑ کر خود اختلافات کا شکار ہونے سے بچ گئے یا ان میں اور زیادہ اختلاف پیدا ہوا۔ اور اُمت کا شیرازہ اور زیادہ بکھر گیا۔

(۴) گو سنّت کی بنا پر فقہی مسائل اور جزئیات میں اختلاف بڑھ کر دَورِ انحطاط میں شدّت اختیار کر گیا۔ لیکن تمام ائمہ کرام کے درمیان بڑی رواداری اور محبت تھی۔ آپس میں اختلافات کے باوجود ان کے درمیان نہایت گہرے دوستانہ روابط قائم تھے اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا قطعاً ناگوار محسوس نہ کرتے تھے۔ تاریخ میں اس قسم کی بہت سی مثالیں اور نظائر موجود ہیں۔

اب ان چاروں نکات سے متعلق تفصیل ترتیب وار عرض کی جاتی ہے۔

جہاں تک پہلے عنوان کا تعلق ہے تو ہمیں تاریخ میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے افراد اپنے مفاد کی خاطر قرآنِ کریم کو نشانۂ اختلاف بناتے رہے ہیں۔

قرآن اور اختلافِ اُمّت

اسلامی تاریخ میں سب سے پہلا اختلاف گروہی شکل میں خوارج کی طرف سے نظر آتا ہے جو حامیانِ علیؓ اور معاونینِ معاویہؓ کے خلاف عملاً میدان میں نکل آیا تھا۔ ان کا اختلاف کسی حدیث یا فرمانِ نبویؐ کی بنا پر نہ تھا، بلکہ انہوں نے سب سے پہلے قرآن کی یہ آیت ہی پیش کی:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ - حاکمیت صرف خدا ہی کے لئے ہے۔

وہ اس آیت کی بنا پر حضرت علیؓ کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے کہ انہوں نے انسانوں کی ثالثی قبول کیوں کی۔ (البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۲۸۱)

ایک اور مثال لیجئے، رحلتِ نبویؐ کے فوراً بعد ہی مسیلمہ کذاب کا فتنہ سامنے آیا۔ مسیلمہ کے ماننے والوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے مسیلمہ کذاب پر ایمان لاتے ہوئے نعرہ بلند کیا تھا۔

كَفَانَا هِدَايَةُ الْقُرْاٰنِ - ہمیں قرآن کی ہدایت کافی ہے۔

ان کا موقف یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ان کی زندگی تک محدود تھی، اور آپؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کی اطاعت فرض نہیں رہی۔ موجودہ منکرینِ سنّت کی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ آنحضورؐ اپنی زندگی میں مرکزِ ملّت کی حیثیت رکھتے تھے،

لیکن آپؐ کی وفات کے بعد ہر دور میں ایک نیا مرکزِ ملت ہوگا جو عصری تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی قوانین واحکام میں تبدیلیاں کرنے کا مجاز ہوگا -

واضح رہے کہ مسیلمہ کذاب کے حامی گروہ نے اپنے موقف کی تائید میں کسی حدیث کو پیش نہیں کیا تھا ، بلکہ انہوں نے مسیلمہ کی رسالت پر قرآن ہی سے استدلال کیا تھا - ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں ہے :

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا - ہم نے تمہاری طرف اسی طرح رسول بھیجا ہے تم پر گواہ بنا کر ، جس طرح کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا -

فرعون کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام بھیجے گئے تھے - لیکن ان کے ساتھ ان کی اعانت کے لئے حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی بھیجا گیا تھا - اسی آیت کریمہ میں کما (جس طرح) کا لفظ لا کر پیغمبر علیہ السلام کی بعثت کو حضرت موسیٰ ؑ کی بعثت سے تشبیہ دی گئی ہے - اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاون کی طرح آنحضورؐ کا بھی کوئی معاون ہونا چاہیئے اور وہ معاون مسیلمہ ہے -

یہ تھا ان کا غلط استدلال جس کے لئے اس آیت کریمہ کو ہدف بنایا گیا (تفصیل کے ساتھ ملاحظہ ہو : تاریخ ابن خلدون اور الملل والنحل از شہرستانی) -

ہم آج کے دور میں بھی منکرین سُنّت کے موجودہ گروہ کی طرف سے یہی آواز سن رہے ہیں کہ اطاعت کا لفظ صرف زندہ شخص ہی کے لئے بولا جا سکتا ہے -

قادیانیت ہی کو ملاحظہ کیجئے - ان کے تمام استدلالات کا منبع ومرجع سب سے پہلے قرآن کریم ہی ہے - گو استدلالات کا غلط ہونا ایک الگ بات ہے - لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا انہوں نے سب سے پہلے قرآن کریم ہی کو اپنا مرکزِ استدلال نہیں بنایا ؟ اموی اور عباسی دور میں مختلف فرقے جیسے کرامیہ ، معطلہ ، جہمیہ ، معتزلہ وغیرہ سب سے پہلے قرآن کریم ہی کو اپنے عقائد کی بنیاد بناتے تھے - مقصد یہ ہے کہ اگر کسی ماخذ کی تفصیلات سمجھنے میں اختلاف پیدا ہو تو یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ اسے بالکل ہی چھوڑ دیا جائے -

سُنّت اور وحدتِ اُمّت

اب ہم دوسرے عنوان کو لیتے ہیں کہ سنت ہی وہ واحد قوت تھی جس نے بڑے بڑے اختلافات دور کرنے میں مدد دی ہے۔

آنحضورؐ کی رحلت کے معاً بعد یہ زبردست اختلاف سامنے آیا کہ منصبِ خلافت کس کو سونپا جائے۔ انصار اس کے زیادہ حقدار ہیں یا مہاجرین؟ انصار کا اعلان تھا کہ:

مِنَّا اَمِیْرٌ وَمِنْکُمْ اَمِیْرٌ۔ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم میں سے۔

یہ اختلاف ظاہر ہے کہ بڑے خطرناک اور دور رس نتائج کا حامل تھا۔ اور اس اختلاف کا باقی رہنا اُمّتِ مسلمہ کے لئے ایک بڑے فتنے کا باعث بنتا۔ اس نازک موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ۔ امام قریش میں سے ہوں گے۔

بعض روایات میں اتنا اضافہ ملتا ہے:

فَلَمَّا سَمِعُوا الْحَدِیْثَ اَذْعَنُوْا لَہٗ وَرَجَعُوْا لَہٗ وَرَجَعُوْا عن قولھم

یعنی جب انصار نے یہ حدیث سُنی تو تسلیم خم کر دیا اور اپنا دعویٰ انہوں نے واپس لے لیا۔

(فتح الباری شرح صحیح بخاری مطبع انصاری پ ۱۴ ص ۳۶۵)

(تاریخ الامت ج ۲ ص ۳، از حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قریش اسلام لانے میں بھی سبقت رکھتے ہیں، اور دوسرے تمام عرب میں جو اثر و رسوخ اور رعب و دبدبہ ان کا ہے وہ اور کسی قبیلے یا گروہ کو حاصل نہیں ہے۔ اس لئے ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی امامت کا کامیاب رہنا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہے اس بات کو دوسری حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

خِیَارُکُمْ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُکُمْ فِی الْاِسْلَامِ اِذَا فَقِھُوْا۔ (صحیح مسلم و مشکوٰۃ ص ۳۲) جو جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر شمار ہوں گے بشرطیکہ ان کو دین کا فہم اور تفقہ حاصل ہو۔

آں حضورؐ کا یہ نہایت ہی حکیمانہ ارشاد تھا جس سے ایک بڑا فتنہ بڑی آسانی سے دب گیا۔

ایک دوسری مثال لیجئے۔ جس طرح کہ عام اشخاص کا ورثہ ان کی موت کے بعد ان کے

اعزہ و اقارب میں تقسیم ہوتا ہے اس طرح آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت فاطمہؓ کا خیال تھا کہ آپ کا ورثہ بھی وارثین میں تقسیم ہو۔ اُس وقت حضرت ابوبکرؓ جن پر منکرِ سنت ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے آگے بڑھے اور یہ حدیث پیش کی:

لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ۔ ہمارا ورثہ تقسیم نہیں ہوتا۔ ہم جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہے۔ (بخاری ص ۲۷، مسلم ص ۹۲ مشکوٰۃ ص ۵۵۰)

چنانچہ یہ واضح ہوتے ہی کہ نبی کا ورثہ اولاد کو نہیں ملتا بلکہ تمام اُمت کا ہوتا ہے حضرت فاطمہؓ مطمئن ہوگئیں (بیہقی ج ۶، ص ۳۰۱)

اُس وقت یہ اختلاف بھی پیدا ہوا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نعش مبارک کو کہاں دفن کیا جائے؟ بعض حضرات کا خیال تھا کہ آپ کو اپنے آبائی وطن مکہ لے جاکر سپردِ خاک کیا جائے اور بعض کہتے تھے کہ نہیں مدینہ ہی کو یہ سعادت ملنی چاہیئے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ بیت المقدس میں لے جایا جائے، کیوں کہ وہاں دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی مدفون ہیں۔ اس بات پر اختلاف بڑھا، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث پیش کرکے یہ مشکل حل کردی۔

حدیث یہ تھی:

إِنَّهُ لَمْ يُدْفَنْ نَبِيٌّ قَطُّ إِلَّا حَيْثُ يُقْبَضُ۔ نبی وہیں دفنایا جاتا ہے جہاں کہ اس کی روح قبض ہوتی ہے۔ (ترمذی، باب الجنائز باب ۳۲ حدیث ۱۰۲۳)

چنانچہ جس حجرہ مبارکہ میں آپؐ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جاملے تھے وہیں قبر کھودی گئی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۶۶)

ایک اور مثال لیجیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں ملک شام کی طرف جارہے تھے کہ راستے میں سرغ مقام پر یہ اطلاع ملی کہ شام میں شدید طاعون پھیل گیا ہے۔ اس موقع پر کچھ حضرات کا خیال تھا کہ واپس جایا جائے جن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے اور بعض حضرات شام جانے پر مصر تھے۔ حضرت عمرؓ سے یہ بھی کہا گیا کہ:

أَتَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللهِ۔ کیا آپ تقدیرِ خدا سے بھاگتے ہیں؟

جس پر انہوں نے جواب دیا:

نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰهِ - ہم خدا کی تقدیر سے اسی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں -

اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے یہ حدیث پیش کی کہ: "جہاں وَبا پھیلی ہو وہاں سے نہ کوئی نکلے اور نہ کوئی ایسے علاقہ میں داخل ہو"

اس پر حضرت عمرؓ نے اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا کی کہ ان کی رائے حدیث کے موافق ہی نکلی (زادالمعاد ج ۱ ص ۲۷ - تاریخ الامّت ج ۲ ص ۹۸)

ان چند مثالوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرنِ اوّل میں سُنّت، ملّت کے اختلاف نہیں بلکہ اتحاد کی بُنیاد تھی۔

انکارِ سنت کا نتیجہ اختلاف و انتشار

ہماری تیسری شق یہ تھی کہ منکرینِ سُنّت چالیس پچاس سال کے قلیل عرصے میں باہم جس اختلاف کا شکار ہوئے ہیں وہ سُنّت کے اختلاف سے کہیں زیادہ ہے - یہاں پر سردست دوسرے مسائل سے قطع نظر صرف نماز کے بارے میں منکرینِ سنّت کی آراء کو پیش کیا جاتا ہے -

برق صاحب اپنی کتاب "ایک اسلام" میں رقم طراز ہیں کہ:

"اللہ تعالےٰ نے قرآن میں عبادت کی کوئی خاص صورت متعیّن نہیں کی - کہیں فرمایا ہمارا ذکر کرو - کہیں صلوٰۃ کی تاکید کی، اور کہیں قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ تقدیس کا حکم دیا - قرآن کریم نے عبادت کی یہ تمام صورتیں منظور کی ہیں بلکہ ایک مقام پر تو یہود و نصاریٰ کی عبادت کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کیا ہے - ذکر و عبادت کے یہ مختلف طریقے قابلِ اعتراض نہیں بلکہ مستحق ستائش ہیں" -

("ایک اسلام" ص ۳۹، ۴۰)

قِیَامًا وَّقُعُوْدًا (کی تشریح بھی انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

مسلمانوں کا کام یَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِیَامًا... الخ اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالےٰ کا پروپیگنڈا کرنا (ایک اسلام ص ۳۱۳)

منکرینِ سُنّت کا ایک مسلک تو یہ ہوا - ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمایئے -

" قرآن کریم میں دو ہی نمازیں مذکور ہیں : فجر۔عشاء " - (از خواجہ عباد اللہ اختر رطلوع

اسلام اگست سنہ ۱۹۵۰ء)

ایک اور صاحب گل فشانی فرما رہے ہیں :

" قرآن سے صرف فجر، عصر، اور عشاء کے اوقات واضح ہیں، ظہر اور مغرب کا ذکر نہیں"
(مطالعۂ حدیث ص ۱۴۹، از سید مقبول احمد ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر)

ظہر اور مغرب کی زیادتی کیوں ہوئی - اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"معاشی ترقی روکنے کے لئے نماز کے اوقات میں اضافہ ہوا، زنادقہ کی طرف سے یہ شرارت ہوئی" (مطالعۂ حدیث، ص ۱۴۹)

منکرینِ سنت کے موجودہ گروہ کے سربراہ نماز کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

" عجم میں مجوسیوں (پارسیوں) کے ہاں پرستش کی رسم کو نماز کہا جاتا ہے - یہ لفظ انہی کے ہاں کا ہے - لہٰذا صلوٰۃ کی جگہ نماز نے لے لی" (طلوع اسلام ص ۵۱)

یہ حضرات اُقِیمُوا الصَّلٰوۃَ سے مُراد نظامِ صلوٰۃ لیتے ہیں اور اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" مذہب میں بھی نظامِ صلوٰۃ نماز پڑھنے میں تبدیل ہو گیا جس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا" (طلوع اسلام، ص ۵۰)

نظامِ صلوٰۃ کیا ہے ؟ لیکن قرآن نے اس تمام تفصیل کو سمٹا کر ایک فقرے میں لکھ دیا ہے یعنی وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ" (سلیم کے نام ص ۲۷۴)

غرض یہ نیا گروہ صلوٰۃ سے وہ نظامِ ربوبیت مراد لیتا ہے جو قرآنی اساس پر قائم کیا جائے اور اس میں غرباء و مساکین کو کھانا کھلایا جائے -

منکرین حدیث کی نماز کی کیفیت

(۱) اذان اور اقامت بدعت ہے -

(۲) تکبیر تحریمہ کا طریقہ یہ ہے کہ نمازی کانوں تک اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کانوں کو مس کرے -

(۳) دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر باندھتے ہوئے دل پر رکھے اور زبان سے یہ کلمات نکالے هو العلی الکبیر (یعنی اللہ اکبر کی جگہ)۔
(۴) اور امام مقتدیوں سے آگے کھڑا نہ ہو بلکہ ان کی صف میں شامل ہو۔
(۵) پہلی رکعت میں یہ آیات تلاوت کرے :-
(ا) انی وجهت وجهی للذی فطر السموت والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔
(ب) ربنا علیك توکلنا و الیك انبنا ... انت العزیز الحکیم تک۔
(ج) علی الله توکلنا ربنا .... الظلمین تک۔
(۶) اور ہر رکعت میں بسم اللہ، سورة الفاتحه قل هو الله احد پڑھی جائے۔
(۷)۔(ا) اور رکوع میں سبحان ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا۔
(ب) قل الحمد لله الذی لم یتخذ ..... من الذل تک۔
(ج) ربنا اصرف عنا عذاب جهنم .... مقاما تک۔
(د) ربنا وسعت کل شیٔ رحمة وعلما.... الفوز العظیم تک۔
(۸) رکوع سے کھڑے ہو کر یہ آیت پڑھی جائے :-
ربنا ما خلقت هذا باطلا ...... انك لا تخلف المیعاد تک۔
(۹) سجدہ میں وہی پڑھا جائے جو رکوع میں پڑھنا بتایا گیا ہے۔
(۱۰) اور دونوں سجدوں کے درمیان وہی کچھ پڑھا جائے جو رکوع کے بعد پڑھا گیا ہے۔
(۱۱) اور قعدہ میں حسب ذیل آیات پڑھی جائیں۔
(ا) ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا ..... آخر سورة تک۔
(ب) ربنا افرغ علینا صبرا ..... آخر آیت تک۔
(ج) ربنا لا تزغ قلوبنا .... آخر آیت تک۔
(د) ربنا انك جامع الناس لیوم لا ریب فیه ..... آخر آیت تک۔
(ہ) وسع ربنا کل شیٔ علما ...... آخر آیت تک۔

(و) ربنا آتنا من لدنك رحمة ...... آخر آیت تک۔
(ز) ربنا آتنا فی الدنیا حسنة ...... آخر آیت تک۔
(ح) سبحان ربك رب العزة ...... آخر سورۃ تک۔

(۱۲) عبداللہ چکڑالوی صاحب نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے:۔
(ا) جنبی، حائضہ اور نفساء کے لئے تلاوت قرآن جائز ہے۔
(ب) حیض اور نفاس کی مدت کا تعین کرنا لوگوں کی طرف سے اپنی خود ساختہ شریعت ہے
(نزہتہ الخواطر ج ۸ ص ۲۹۰ مؤلفہ مولانا عبدالحی فخرالدین الحسینی)

عبداللہ چکڑالوی کے چند عقائد

قارئین کی دلچسپی کے لئے یہاں منکرین حدیث کے ایک لیڈر مولوی عبداللہ چکڑالوی کے عقائد کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے ان کی قرآن فہمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱) قرآن مجید میں جہاں کہیں اطیعوا الرسول آیا ہے یا صرف رسول کا تذکرہ ہے اس سے مراد قرآن مجید ہے۔

(۲) ارشادِ باری تعالیٰ "ان اللہ وملئکته یصلون علی النبی" یہاں النبی سے تمام انبیاء مراد ہیں اور یہ آیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیاء پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

(۴) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انکار۔

(۵) مالی اور بدنی عبادت کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا۔ یعنی ایصال ثواب کا کلی طور پر انکار

(۶) عبداللہ چکڑالوی نے اپنی جماعت کا نام اہل الذکر والقرآن رکھا تھا۔ (تلخیص وترجمہ از کتاب نُزہتہ الخواطر ج ۸ ص ۲۹۰ مؤلفہ مولانا عبدالحی فخرالدین الحسینی)۔

اب بتائیے کہ ان بھانت بھانت کی بولیوں میں کس کو مانا جائے۔ سنت کے شیدائیوں کو اختلاف کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس ایک مسئلے میں حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ واضح ہوجائے گا کہ اختلاف کے شکار منکرین سنت ہیں یا شیدائیانِ سنت۔

مسلمانوں کے تمام فرقے نمازوں کے پانچ ہونے میں اختلاف نہیں رکھتے۔ اوقات کے تعین کے لحاظ سے اوقاتِ نماز میں بھی کوئی اختلاف نہیں، صرف ایک یا دو مثل اِسفار یا غلس کا معمولی سا اختلاف ہے، لیکن کہاں یہ اختلاف کہ سرے سے نماز ہی غائب ہے یا صرف دو یا تین نمازوں کا فتویٰ دیا جا رہا ہے۔ نماز کے صریح منکر حضرات بھی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ کا مسلک ہے کہ نماز سے مراد غرباء و مساکین کی شکم پروری ہے اور دوسرے کا خیال ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے خدا کا پروپیگنڈا کرو۔

درحقیقت یہ شیرازہ سنت ہی کے طفیل باہم مربوط چلا آ رہا ہے ورنہ انکارِ سنّت نے تو اس میں نت نئے اختلافات پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

فقہی اختلافات کی حیثیت

چوتھی شق یہ تھی کہ فروعی مسائل میں اختلاف کیوں کر پیدا ہوا۔ اور اس نے شدت کیوں کر اختیار کر لی۔ اسلامی تاریخ کے مستند اور قابلِ اعتماد ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہی یا فروعی اختلافات نے صحابہ، تابعین اور امامانِ دین کے زمانے میں وہ شدت اختیار نہیں کی تھی جو بعد میں رونما ہو گئی۔ دراصل یہ شدّت اور فرقہ وارانہ جنبیت و عصبیت دورِ انحطاط کی پیداوار ہے نہ کہ عہد سعادت اور دورِ ترقی کی۔

اسلاف کرام میں فقہی اختلاف کے متعدد اسباب ہیں جنھیں سے ایک سبب کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہاں وضاحت کی جاتی ہے۔

سلف کا اختلاف

حدیث میں ہے آپؐ نے بنی قریظہ (یہودی قبیلے) پر حملہ کے موقع پر صحابہؓ کی ایک جماعت کو حکم دیا: لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدُكُمْ صَلٰوةَ الْعَصْرِ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ۔ (صحیح مسلم مع شرح النووی ج ۲ ص ۹۷) یعنی تم میں سے کوئی نماز عصر ادا نہ کرے مگر بنی قریظہ کے علاقہ میں۔ لیکن اتفاق سے راستہ ہی میں عصر کا وقت آ گیا۔ اس موقع پر فرمانِ نبویؐ کی تشریح میں فہم کے اختلاف کی بنا پر دو رائیں ہو گئیں۔

ایک رائے یہ تھی کہ حدیث کے ظاہری الفاظ کی بنا پر ہمیں بنی قریظہ ہی میں جا کر نماز ادا کرنی چاہیے۔ دوسری رائے یہ تھی کہ اس ارشاد کا اصل منشاء یہ ہے کہ ہم

اتنی جلدی مسافت طے کریں کہ عصر کے وقت بنی قریظہ کے علاقہ میں لازماً پہنچ جائیں۔ اب جب کہ باوجود کوشش کے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکی ہے تو ہمیں نماز قضا کرنے کی بجائے راستہ ہی میں ادا کرلینی چاہیئے۔

جب آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اس اختلاف کی تفصیل پیش کی گئی تو آپؐ نے ان دونوں میں سے کسی کو بھی ملامت نہ کی۔ (صحیح بخاری مصری ج ا ص ۱۶۸، باب صلوٰۃ الخوف۔ زاد المعاد، ج ا ص ۳۲۸ مکتبہ میمنیہ مصر)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ سلف صالحین کے درمیان ایک سے زیادہ آراء کا ظہور اس بناء پر ہوا کہ کسی آیت یا حدیث کے مفہوم کو متعین کرنے میں اختلاف رونما ہو گیا۔ یہ اختلاف سمجھ بوجھ کا اختلاف تھا نہ کہ کوئی بنیادی اور حقیقی اختلاف۔ اس بنا پر سلف صالحین اس اختلاف رائے کے باوجود باہمی عناد و مخالفت کا شکار نہیں ہوئے اور نہ انہوں نے کبھی یہ گوارا کیا کہ ملت اسلامیہ اس قسم کی صورت حال کی بناء پر مختلف اُمتوں اور فرقوں میں تقسیم ہو جائے اور نوبت یہاں تک پہنچے کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا ہی گوارا نہ ہو۔

اسلاف کی رواداری

فقہی اختلافات کو سلف صالحین کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ان کی وسعتِ ظرف کا کیا حال تھا، اس کی چند مثالیں ذیل میں عرض کی جاتی ہیں:

۱ - امام احمدؒ کا مسلک تھا کہ فصد کھلوانے اور سینگی لگوانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ ایسے شخص کی اقتداء میں نماز ادا کرلیں گے جس نے فصد کھلوانے کے بعد وضو نہ کیا ہو۔ امام احمد نے جواب دیا: کیا میں سعید بن المسیّبؒ اور امام مالکؒ جیسے اہل علم اور اصحاب فتویٰ کی اقتداء میں نماز ادا کرنے سے گریز کرسکتا ہوں؟ مطلب یہ تھا کہ یہ دونوں بزرگ مذکورہ بالا صورت میں وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کے مسلک کی بناء پر نماز درست ہوگی۔ (حجۃ اللہ البالغہ باب حکایۃ حال الناس قبل المائۃ الرابعۃ وبعدھا ج ا ص ۱۲۷ مطبع خیریہ مصر)۔

۲ - امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بدن سے خون نکلنے پر وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالکؒ کے مسلک اور اجتہاد کی بناء پر سینگی لگوانے کے بعد از سر نو وضو نہیں کیا بلکہ سابقہ وضو کی بنیاد پر لوگوں کو نماز پڑھائی۔ قاضی ابو یوسفؒ نے بھی ان کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ بعد میں

نماز کو لوٹایا نہیں۔ (حجۃ اللہ البالغۃ باب حکایۃ حال الناس قبل المائۃ الرابعۃ وبعدھا ج ا ص۱۲۵ مطبع خیریہ مصر)۔

۳۔ امام شافعی رحمہ صبح کی نماز میں دعائے قنوت کے قائل تھے اور اس پر پوری پابندی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بغداد کی مسجد امام ابوحنیفہ میں ان کو صبح کی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو انہوں نے دعائے قنوت ترک کر دی۔ (مقدمۃ المغنی ص۱۵ مرتبہ علامہ رشید رضا)

اس قسم کے واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلاف کے نزدیک فقہی اختلاف کی کیا حیثیت تھی۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ شریعت کے احکام و مسائل دو قسم کے ہیں:

الف۔ ایسے مسائل جن پر پوری امت کا اتفاق ہے یا اگر اختلاف ہے بھی تو نہایت ہی ناقابلِ ذکر۔

ب۔ ایسے مسائل جن کے بارے میں نظر و فکر کا اختلاف ابتدا سے چلا آ رہا ہے اور ایک سے زیادہ آراء شروع ہی سے پائی جاتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مسائل میں شدت اور تعصب برتنا دین میں غلو کے ہم معنی ہے جس کی ممانعت قرآن پاک میں موجود ہے۔ اہل کتاب سے کہا گیا ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ۔ (سورۃ النساء، آیت ۱۷۱) اے اہل کتاب اپنے دین کے معاملے میں غلو نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف صرف ایسی باتیں منسوب کرو جن کی بنیاد حق پر ہے (اللہ تعالیٰ پر غلط الزامات اور بہتان نہ تراشو)

باقی رہے پہلی قسم کے مسائل تو ان کے بارے میں کسی قسم کی مداہنت یا رواداری برتنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم اسلام کے اصل تابناک چہرے کو مسخ ہوتے دیکھنا گوارا کر سکتے ہیں۔ (العیاذ باللہ۔)

اس تمام تفصیل سے مقصود یہی ہے کہ حامیانِ سنت گروہی اور فرقہ وارانہ عصبیت اور جمود کو چھوڑ کر باہمی اتحاد کو زندگی کا اولین مقصود قرار دیں اور آپس میں محبت، رواداری کی وہ درخشندہ مثالیں از سرِ نو تازہ کریں جو کہ ہمارے اسلاف کا طرۂ امتیاز تھیں۔

ضرورت ہے کہ ہم ان فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر اصل فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بنیان مرصوص بن جائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آزادی

پاکستان کے حصول یا وطن کی آزادی کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ انگریز اور ہندو کی حکومت سے نجات پاکر اللہ اور رسول صلعم کے تمام احکام کی آزاد فضا میں بغیر کسی روک ٹوک کے سمع وطاعت کی جائے۔

لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں اور قسم قسم کی آزادیاں جنم لے رہی ہیں۔

۱۔ ایک گروہ ایسا ہے جو دہریت والحاد کا شکار ہو گیا ہے ثقافت وادب کے نام سے ملک میں کمیونزم کے جراثیم پھیلا رہا ہے۔ اس گروہ کے نزدیک یہ تمام سرگرمیاں حریت فکر اور آزاد خیالی کی نشانی ہیں۔ ان پر پابندی لگانا تہذیب وتمدن اور روشن ضمیری کے یکسر خلاف ہے۔

۲۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے انتہائی مرعوب ومسحور ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان میں یہ بل بوتا بھی نہیں پایا جاتا کہ کھلم کھلا اسلام سے خروج کا اعلان کر دیں۔ ان لوگوں کے نزدیک آزادی کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس ترقی اور روشنی کے زمانہ میں اسلامی احکام کی وہ تعبیر صحیح ہے، جو مغربی نظریات وخیالات سے ہم آہنگ ہو۔ اگر کسی نے اسلامی احکام کی وہ تشریح پیش کر دی جو اسلام کے مقدس اسلاف سے منقول ہے اور جس پر پوری اُمّت چودہ سو سال سے بغیر کسی اختلاف کے عمل کرتی چلی آ رہی ہے۔ تو اس پر ملائیت، دقیانوسیت اور تنگ نظری کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی افراد پر قرآن مجید کی یہ آیات صادق آتی ہیں:۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ۔ (پ سورہ البقرہ آیات ۱۱-۱۲)۔

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپا مت کرو، تو وہ کہتے ہیں ہم ہی تو ہیں جو صرف اصلاح کے علمبردار ہیں، خبردار! بلاشبہ یہی لوگ فساد برپا

کرنے والے ہیں، لیکن یہ شعور نہیں رکھتے۔)

اسی گروہ میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو گوتم بدھ کے مشرکانہ آثارِ قدیمہ کو پاکستان کا آبائی ورثہ قرار دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ اور ایسے افراد بھی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو مدارِ نجات نہیں قرار دیتے۔ ان کے نزدیک اس قسم کا عقیدہ تنگ نظری کے ہم معنیٰ ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

۳۔ غلط رو آزادی کی تیسری قسم ہے اطاعتِ رسول سے آزادی۔ اس آزادی کے حامی اپنے بہت سے نظریات و افکار میں پہلی دونوں قسموں سے ملتے جلتے ہیں۔ (تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ)

اشتراکی خیالات و نظریات کو مسلم معاشرے میں مقبول بنانے کے لئے "قرآنی نظام ربوبیت" کا لبادہ اوڑھا گیا ہے، اور مغربی ثقافت کو فروغ دینے کے لئے سنت کو تمسخر اور استہزا کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اور محدثین کرام کی دینی خدمات اور علمی کارناموں کو "عجمی سازش" کا نام دیا گیا ہے۔

آج کی صحبت میں اسی تیسری قسم کی آزادی پر کچھ تفصیل سے عرض کیا جا رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے یہ مفروضہ قائم کیا گیا ہے کہ آپ کی اطاعت "مرکزِ ملت" کی حیثیت سے صرف آپ کی زندگی تک محدود تھی۔ اس دعوے پر دلیل دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ (سورۃ الانفال ۲۰)

(ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور اسکے رسول کی اور اس سے روگردانی نہ کرو جبکہ تم سن رہے ہو۔)

تشریح ملاحظہ ہو "جبکہ تم سن رہے ہو" کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ عربی زبان میں اطاعت کے معنیٰ ہیں کسی زندہ کے احکام کی تابعداری، اسلامی نظام میں اطاعت امام موجود کی ہو گی" (اسلامی نظام از پرویز صاحب ص ۱۱۲)

اور "پھر اس اطاعت پر ہی غور کیا؟ جس میں سننا شرط ہے۔ یہ بالمشافہ اطاعت زندہ مرکز کی نہیں تو اور کیا؟" (سلیم کے نام ص ۲۳)

"اور جس حال میں تم سن رہے ہو کی قید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اطاعت بالمشافہ ہے اور عربی میں اطاعت کے معنی ہیں زندہ کی فرماں برداری" (اسلامی نظام صفحہ ۱۳۱)
اطاعت کے معنی ہیں "زندہ کی تابعداری" یہ ایک ایسا اچھوتا انکشاف ہے جو چودہ سو سال میں پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔ اتنا بڑا دعویٰ مگر دلیل سے تہی دامن۔ لغت عرب کی مستند کتابیں دیکھ جائیے کہیں بھی اس کی تصریح نہیں ملے گی۔ لسان العرب میں ہے۔

طَاعَ ، اَطَاعَ : لَانَ ، اِنْقَادَ - فَاِذَا مَضٰى لِاَمْرِهٖ فَقَدْ اَطَاعَهٗ فَاِذَا وَافَقَهٗ فَقَدْ طَاوَعَهٗ وَفِى الْحَدِيْثِ هَوًى مُّتَّبَعٌ وَشُحٌّ مُّطَاعٌ

(لسان العرب ج ۸ صفحہ ۲۴۰)

باقی رہا "جبکہ تم سن رہے ہو" سے استدلال تو یہ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ اگر "بالمشافہ" کی وضاحت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا دوسرے علاقوں میں مقیم تھے ان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت لازم نہ تھی۔ کیونکہ وہ بالمشافہ آپ کے ارشادات نہیں سن سکتے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کی اطاعت کا حکم ہے، کیا وہ بھی بالمشافہ ہوتی ہے؟ ایں چہ بوالعجبی ست۔

علاوہ بریں اگر اطاعت کے لئے بالمشافہ احکام سننا ضروری ہے تو یہ زندہ حکام کے بارے میں بھی ہر جگہ اور ہر حال میں کہاں ممکن ہے؟ کتنے لوگ ہیں جنہیں پوری زندگی میں ایک بار بھی اپنے حکمرانوں کی ایک جھلک دیکھنا میسر نہیں آتی چہ جائیکہ وہ بالمشافہ احکام سنیں۔

اس گروہ کے نزدیک اتباع اور اطاعت دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ مثلاً کہا گیا ہے۔ " وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ (سورۃ المائدہ ۹۲)
چونکہ رسول سب سے پہلا مرکز ملت ہوتا ہے، اس لئے اس کی اطاعت مستقل اطاعت نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے قوانین کی اطاعت ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا:
وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ..... اسی کی اطاعت سے خدا کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ"
(معارف القرآن (صفحہ ۶۳۱) اسلامی نظام صفحہ ۱۲)

یہ انداز بیان ظاہر کر رہا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اتباع اور اطاعت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

یہی اتباع کا لفظ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے۔ للذین

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا۔

"ابراہیم علیہ السلام سے قریب تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی اور مومنین (سورہ آل عمران) یہ قرب ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو حضرت ابراہیم کی پیروی کی بنا پر ہی حاصل ہوا ہے۔ دوسری آیت میں مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ۔

(ترجمہ تمہارے لئے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں اُسوہ حسنہ ہے)۔ بعینہٖ یہی الفاظ قرآن میں آنحضورؐ کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (سورۃ الاحزاب)

اُسوہ کی تشریح کرتے ہوئے امام راغب لکھتے ہیں۔

الأسوة والاسوة كالقدوة والقدوة وهي الحالة التي يكون الانسان عليها في اتباع غيره ان حسنا وان قبيحا وان سارا وان ضارا ولهذا قال تعالى لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة (مفردات القرآن صلا)

یعنی اُسوہ اور قدوہ وزن اور معنیٰ کے لحاظ سے یکساں ہیں۔ اُسوہ اس حالت کو کہتے ہیں جس کی بنا پر انسان دوسروں کی اتباع کے لئے نمونہ بنتا ہے۔ خواہ اچھا کام ہو یا بُرا، مسرت انگیز ہو یا ضرر رساں۔ اسی لئے قرآن میں ارشاد ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء کار کی زندگی بعد میں آنے والوں کے لئے اُسوہ حسنہ بن سکتی ہے تو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہمارے لئے مشعل راہ کیوں نہیں بن سکتی؟ کیا اُسوہ حسنہ کی پیروی کا دوسرا نام اطاعت نہیں ہے؟ ایک اور آیت سُنئے:

سورۃ انعام میں اللہ تعالےٰ نے مشہور اولوالعزم انبیاء کرام ابراہیم، اسحاق، یعقوب نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحیٰی، عیسیٰ، الیاس اور اسماعیل، الیسع یونس، لوط علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:۔

اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (پ آیت ۸۲ تا ۹۰) یہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالےٰ نے ہدایت سے نوازا، آپ ان کی ہدایت کی اقتدار کیجئے۔ اقتدار کا لفظ قدوہ سے ماخوذ ہے جس کی تشریح لسان العرب میں اُسوہ سے کی گئی ہے۔ یعنی اقتدار اور اتباع دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

اس آیت سے واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء سابقین کی اقتدار و اتباع کا حکم دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ان کو گذرے ہوئے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال بیت چکے ہیں۔ اب اگر ان انبیاء کرامؑ کی رحلت کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی اقتدار و اتباع لازم تھی تو قیامت تک آنے والے انسانوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار واجب کیوں نہ ہو گی؟

حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل اور دوسرے انبیاء کرام بھی تو اپنے زمانہ کے "مرکزِ ملت" ہوں گے آخر ان کی اقتدار و اتباع کا آں حضورؐ کو کیوں حکم دیا جا رہا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ تعالےٰ کی اطاعت کی طرح قیامت تک کے لئے دائمی اور مستقل ہے۔ جس طرح اللہ تعالےٰ کی اطاعت قرآن کی پیروی سے انجام پاتی ہے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سنت کی اتباع سے تکمیل تک پہنچتی ہے۔

یہ کہنا بہت بڑی جسارت اور شانِ رسول میں گستاخی ہے کہ آں حضورؐ کی اطاعت اور اب تک کے رؤساء وزراء اور خلفاء (مرکزِ ملت) کی اطاعت درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے یکساں ہیں۔

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۔

سورہ نور میں ارشاد ہے۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۞ یعنی رسول کی پکار کو آپس میں ایک دوسرے کی پکار کی مانند مت قرار دو۔

اس آیت میں رسول کی دعوت (پکار، بلاوے) کو آپس میں ایک دوسرے کی پکار کے برابر قرار دینے سے روکا گیا ہے۔ اب اگر رسول کی حیثیت صرف مرکزِ ملت یا صاحبِ امر کی مان لی جائے تو پھر كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا کے کیا معنیٰ ہوں گے؟ کیونکہ "مرکزِ ملت" بھی تو اُمت ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ نبی کے ارشادات اُمت کے تمام افراد کے اقوال و احکام سے بالاتر ہیں۔ کیونکہ خود نبی کی ذات سب سے درجہ میں بالاتر ہے۔ ہر اُمتی سے خطا ہو سکتی ہے۔ لیکن نبی اپنے قول و فعل میں خطا سے پاک ہوتا ہے۔ اگر کبھی اس سے اجتہاد میں لغزش بھی ہو جاتی ہے تو فوراً وحی الٰہی اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی تصریحات سے یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع کے بغیر دنیاوی و اُخروی نجات و سعادت قطعاً ناممکن ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، اقتداء اور اطاعت ہی دُنیا میں آزادی و خوشحالی اور آخرت میں سرخروئی و سرفرازی کی ضامن ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

محمدؐ کی اطاعت سند ہے آزاد ہونے کی
خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

مخالفِ قرآن روایات؟

مضمون کے لحاظ سے حدیث کی چوتھی قسم ایسی احادیث پر مشتمل ہے جو قرآنی آیات سے متصادم ہیں۔

واضح رہے کہ یہ تصادم و تعارض صرف ظاہر نظر میں ہے، جو معمولی غور و تامل سے رفع ہوسکتا ہے۔ اس قسم کے اختلاف کو حقیقی تعارض نہیں قرار دیا جاسکتا۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

نحن نقول قولا کلیا نشهد الله وملائکته، ان لیس فی حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم، ما یخالف القرآن ولا ما یخالف العقل الصریح بل کلامه بیان للقرآن وتفسیر له وتفصیل لما اجمله وکل حدیث من ردّه بزعمه انه یخالف القرآن فهو مطابق للقرآن وغایته، ان یکون زائدا علی ما فی القرآن وهذا الذی امر رسول الله صلی الله علیه وسلم بقبوله (الصواعق المرسله ج ۲ ص۴۴۱)

ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کو گواہ ٹھہراتے ہوئے (بغیر کسی استثناء کے) کُلّی اور عمومی طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو قرآن کے مخالف ہو یا عقل صریح سے ٹکراتی ہو بلکہ آپؐ کے ارشادات قرآنی آیات کے بیان قرآنی اجمال کی تفصیل و توضیح ہیں۔ ہر وہ حدیث جس کو یہ خیال کرتے ہوئے رَد کیا گیا ہے کہ وہ قرآن کے مخالف ہے (واقعہ یہ ہے کہ) وہ قرآن کے مطابق ہے انتہائی بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ اس قسم کی روایات قرآن سے زائد مضمون پیش کرتی ہیں (لیکن واضح رہے کہ) ایسی روایات کے قبول کرنے کا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔

امثال و نظائر

حدیث کی زیرِ بحث قسم کی وضاحت کے لئے چند نظائر و شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فہمِ حدیث کے لئے کس قسم کی دیدہ وری کی ضرورت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ۔ (صحیح بخاری جلد۳ صـ۱۵۱)۔	بے شک میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی بنا پر عذاب دیا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے مرنے کے بعد اس پر ماتم کیا جائے، نوحہ اور سینہ کوبی جیسے اعمال کا مظاہرہ ہو تو مردے کو اس کے رشتہ داروں کے ان اعمال کی بنا پر عذاب کا مزہ چکھنا پڑتا ہے اس حدیث کا ظاہری مفہوم قرآن مجید کی آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ (کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) سے متصادم ہے۔

امام بخاریؒ نے اس اشکال کو اس طرح رفع کیا ہے۔

اذا كان النوح من سنته لقوله تعالىٰ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا، وقال النبي صلى الله عليه وسلم كلكم راعٍ وكلكم مسئولٌ عن رعيته فاذا لم يكن من سنته فهو كما قالت عائشةؓ لا تزر وازرة وزر اخرىٰ وهو كقوله وان تدع مثقلة الى حملها لا يحمل منه شيءٌ (صحيح بخاری مصری ج۱ صـ۲۲۲)	میت کو گھر والوں کے ماتم کی بنا پر عذاب اس صورت میں ہوگا، جب کہ یہ نوحہ و ماتم خود اس کا طریق کار رہا ہو، کیونکہ قرآن میں ارشاد ہے "اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ"، اسی طرح ارشادِ نبویؐ ہے تم میں سے ہر ایک راعی اور نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت (ماتحتوں) کے بارے میں باز پرس ہوگی، لیکن اگر اس کا یہ طرزِ عمل زندگی میں نہیں تھا تو اس شکل میں حضرت عائشہؓ

کے قول کے مطابق آیت وَلَا تَزِرُ
وَازِرَةٌ اس پر چسپاں ہوگی یعنی
اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی
(اسی طرح) دوسری آیت میں ہے
کہ اگر کوئی گناہوں سے بوجھل شخص
کسی دوسرے کو اپنے گناہوں کا بوجھ
اٹھانے کے لئے بلائے گا تو اس کا
بوجھ اٹھایا نہ جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اسی قسم کا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے یا اس قسم کے منکرات پر وہ نفرت و بیزاری کا اظہار نہیں کرتا یا مرتے وقت سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کی وصیت کر جاتا ہے تو ان سب صورتوں میں مذکورہ بالا احادیث کے مطابق وہ عذاب کا سزاوار ہوگا۔

دورِ جاہلیت میں اس نوع کی وصیت کرنے کا عام رواج تھا جیسا کہ طرفہ بن العبد اپنی بھتیجی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

فَاِنْ مِتُّ فَانْعَيْنِي بِمَا اَنَا اَهْلُه
وَ شُقِّي عَلَيَّ الْجَيْبَ يَا ابْنَةَ مَعْبَدِ

"یعنی اگر میں مر جاؤں تو میری موت کی خبر ایسی مداح سرائی کے ساتھ نشر کرنا۔ جس کا واقعی میں مستحق ہوں، اور اے بھائی معبد کی بیٹی! میرے مرنے پر اپنا گریبان چاک کرنا" (جواہر الادب للہاشمی ج ۲ ص ۴۲۵)۔

اس کے برعکس اگر مرنے والا اس قسم کے رسم و رواج سے روکتا رہا ہے یا کم سے کم اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا رہا ہے تو خدا کے ہاں اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی۔

جمہور اہلِ علم نے یہی توجیہ اختیار کی ہے، یعنی مذکورہ بالا قرآنی ضابطہ کے مطابق زیرِ غور حدیث کا عموم اپنی جگہ قائم نہ رہا۔

یہ ایسی معقول توجیہ ہے جس کی بنا پر نہ قرآنی آیت کی تاویل کرنی پڑی اور نہ حدیث کو رد کرنے کی نوبت آئی۔

حضرت عائشہ رضؓ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کے سہو و نسیان اور خطاءِ فہم پر محمول کیا ہے۔ فرماتی ہیں کہ اصل بات یہ تھی کہ۔۔۔۔

إِنَّمَا مَرَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى يَهُوْدِيَّةٍ يَبْكِيْ عَلَيْهَا أَهْلُهَا فَقَالَ إِنَّهُمْ لَيَبْكُوْنَ عَلَيْهَا وَإِنَّهَا تُعَذَّبُ فِيْ قَبْرِهَا۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری کتاب الجنائز ج ۳ ص ۱۵۲)۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک بار ایسی یہودیہ کی قبر کے پاس سے ہوا جس کے گھر والے اس پر ماتم کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ لوگ اس پر ماتم کر رہے ہیں، حالانکہ وہ اپنی قبر میں مبتلائے عذاب ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس یہودیہ کے رشتہ دار تو اس کی مدح و تعریف میں مشغول ہیں اور اس کے فراق میں نالہ و شیون بپا کیا ہوا ہے حالانکہ وہ اپنی بداعمالیوں کی بنا پر عذاب کی سختیاں جھیل رہی ہے۔ یہاں نوحہ خوانی اور میّت کے عذاب پانے کے درمیان علت و معلول کا تعلق نہیں ہے بلکہ دونوں امور اپنی اپنی جگہ الگ الگ ہیں۔

صحیح مسلم کی روایت میں مزید یہ الفاظ ملتے ہیں۔

قالت عائشة يغفر الله لابي عبدالرحمٰن (اما انه لم يكذب ولكنه نسي او أخطأ۔ (صحیح مسلم مع شرح نووی کتاب الجنائز ج ٦ ص ۲۳۲)۔	حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ ابن عمر) کو معاف فرمائے اصل بات یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولے ہاں ان سے بھول چوک اور خطا ہو گئی ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ نے اس حدیث کے بعض الفاظ میں راوی کا وہم بتاتے ہوئے حدیث کا ایسا منظر بیان کیا ہے کہ جس کی بنا پر قرآن و حدیث کے درمیان تعارض کا کوئی احتمال ہی باقی نہیں رہتا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ حدیث صرف حضرت عبداللہ بن عمر ہی سے مروی نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ دوسرے متعدد صحابہ بھی اس حدیث کے راوی ہیں (ملاحظہ ہو سبل السلام

ج ۲ صفحہ ۱۵۳) اس لئے وہم راوی قرار دینے کے بجائے جمہور اہل علم کی توجیہ زیادہ قرین صواب ہے"
امام قرطبیؒ نے تعارض کو رفع کرنے کے لئے ایک دوسرا نکتہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآنی آیت " لا تزر وازرۃ " کا تعلق آخرت سے ہے یعنی قیامت کے دن کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ باقی رہی مذکورہ بالا حدیث تو اس کا تعلق برزخی حالات سے ہے جو ایک گونہ دنیاوی احوال کے مشابہ ہیں۔ دنیاوی عذاب کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (اور اس فتنہ سے بچو، جس کا نشانہ صرف ظالم لوگ ہی نہیں بنیں گے، بلکہ اس کی لپیٹ میں غیر ظالم بھی آجائیں گے)۔

اگر غور کیا جائے تو نتیجے کے لحاظ سے جمہور اہل علم کی توجیہ اور اس نکتہ میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ محدثین کرام نے قرآن و حدیث کے باہمی تعلق کو کیسے حکیمانہ اسلوب سے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جزاهم الله عنا خير الجزاء۔

اس صورت حال کی وضاحت کے لئے قرآن کی مندرجہ ذیل دو آیتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

۱ - مشرکین کے بارے میں سورہ نساء آیت ۴۲ میں فرمایا گیا ہے۔ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ٥ یعنی مشرکین قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے کہ مشرکین کہیں گے: وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (سورہ انعام ۲۳) یعنی قسم ہے ہمارے رب کی ہم مشرک نہ تھے۔

بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض ہے لیکن حضرت ابن عباسؓ نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ مشرکین قیامت کے ابتدائی مرحلے میں تو اپنے شرک کا انکار ہی کریں گے لیکن جب منہ پر مہر لگ جائے گی اور اعضاء گواہی دیں گے تو پھر مشرکین کوئی بات اپنے رب سے مخفی نہ رکھ سکیں گے۔ (صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۸ صفحہ ۵۵۵ کتاب التفسیر حم السجدہ)

جس طرح ان دونوں آیات کو مختلف حالات پر محمول کیا گیا ہے اسی طرح زیر بحث آیت اور حدیث کے دو محمل الگ الگ مانے جا سکتے ہیں۔

۲ - قرآن سے متعارض ہونے کی دوسری نمایاں مثال صحیح بخاری کی وہ حدیث ہے جس

میں ذکر ہے کہ کذب اِبرَاھیم عَلَیْہ السَّلام ثلث کذبات۔
(صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۶ ص ۳۷۸ کتاب الانبیاء) یعنی حضرت ابراہیمؑ نے تین مواقع پر کذب بیانی سے کام لیا، کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث قرآنی آیت وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰهِیْمَ اِنَّهٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا ہ سے متصادم ہے کیونکہ قرآن تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انتہائی راست باز نبی قرار دیتا ہے لیکن حدیث سے ان کے تین جھوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ روایت ناقابل قبول ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کچھ غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ تعارض و اختلاف رفع ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

الکلامُ لَہٗ نسبتان، نسبۃٌ اِلی المتکلم وقصدِہٖ وَاِرادتِہٖ ونسبۃٌ الی السامع و افھام المتکلم ایاہ مضمونہ فاذا اخبر المتکلم بخبر مطابق للواقع وقصد افھام المخاطب ایاہ، صدق بالنسبتین فان المتکلم ان قصد الواقع وقصد افھام المخاطب فھو صدق من الجھتین و ان قصد خلاف الواقع وقصد مع ذلك افھام المخاطب خلاف ما قصد بل معنیً ثالثًا لا ھو الواقع ولا ھو المراد فھو کذب من الجھتین بالنسبتین معًا وان قصد معنیً مطابقا صحیحًا وقصد

کلام و گفتگو کی دو نسبتیں یا حیثیتیں ہوتی ہیں۔ (۱) متکلم کے قصد و ارادے کے لحاظ سے (۲) سامع کے اعتبار سے، یعنی متکلم سامع کے ذہن میں کیا بات اُتارنا چاہتا ہے ان دونسبتوں کے لحاظ سے کلام کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) متکلم اصل واقعہ کے مطابق خبر دے اور اس کی نیت بھی یہی ہو کہ صحیح صورتِ حال سے مخاطب آگاہ ہو جائے۔
یہ صورت مذکورہ بالا دونوں نسبتوں کے اعتبار سے صدق پر مشتمل ہوگی۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ خلاف واقعہ خبر دی جائے اور جو متکلم کا مقصود ہے وہ بھی مخاطب پر ظاہر نہ ہونے دیا جائے بلکہ کوئی تیسرا مفہوم مخاطب

مع ذلك التعمية على المخاطب
وافهامه خلاف ماقصده
فهو صدق بالنسبة الى
قصده كذب بالنسبة الى
افهامه ومن هذا الباب
التورية والمعاريض، وبهذا
اطلق عليها ابراهيم الخليل صلى
الله عليه وسلم، اسم الكذب
مع انه الصادق فى خبره
ولم يخبر الا صدقا فتامل
هذا الموضع الذى اشكل
على الناس وقد ظهر
بهذا ان الكذب لا يكون
قطّ الا قبيحا، وان الذى
يحسن ويجب انما هو التورية
وهى صدق -
وقد يطلق عليه الكذب
بالنسبة الى الافهام لا
الى العناية

(مفتاح دار السعادة و
منشور العلم والارادة
ج ۲ ص ۳۹)

کے ذہن میں اُتارنے کی کوشش کی جائے
جو نہ واقع کے مطابق ہو اور نہ متکلم
کا مطمح نظر ہو، اس صورت کو دونوں
نسبتوں کے لحاظ سے کذب (جھوٹ)
مانا جائے گا۔

(۳) تیسری شکل یہ ہے کہ متکلم کے
پیش نظر واقع کے مطابق صحیح خبر
دینا ہی مقصود ہوتا ہے۔ لیکن وہ گفتگو
کا اسلوب ایسا اختیار کرتا ہے کہ
مخاطب کا ذہن متکلم کے اصل مقصد
کو سمجھنے کے بجائے ایسے امر کی طرف
منتقل ہو جائے جو متکلم کا منشا
نہیں ہے۔

یہ صورت اصل واقعہ کے لحاظ سے
صدق ہے، لیکن مخاطب کے فہم کے
اعتبار سے اس پر کذب کا اطلاق
ہو سکتا ہے اس قسم کے اسلوب کلام
کو توریہ اور تعریض کہا جاتا ہے۔
اسی پہلو کے پیش نظر حضرت ابراہیمؑ
نے اس پر کذب کا اطلاق کیا ہے۔
ورنہ اصل واقعہ کے لحاظ سے دیکھا
جائے تو حضرت ابراہیمؑ اس گفتگو میں
سچے ہیں۔

حدیث کی اس تشریح و توضیح پر انتہائی
غور و فکر کی ضرورت ہے، یہ مقام بہت

سے لوگوں کی ذہنی اُلجھن کا باعث

بن گیا ہے ۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کذب بہر حال قبیح ہو گا، ہاں کوئی امر اگر (بوقت ضرورت) پسندیدہ یا لازم ہو سکتا ہے تو وہ 'توریہ' و تعریض ہو سکتا ہے (نہ کہ حقیقی کذب) یہ توریہ اصل واقعہ کے لحاظ سے صدق پر مشتمل ہوتا ہے، ہاں اس پر کذب کا اطلاق اس اعتبار سے کر دیا جاتا ہے کہ واقعہ کے مطابق اصل مقصود مخاطب کو باور کرانا مطلوب نہیں ہوتا ۔

ان مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی صحیح السند حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتی ۔ اگر کہیں قرآنی آیت اور حدیث کے درمیان بظاہر تعارض محسوس بھی ہوتا ہے تو معمولی غور و فکر سے اس کو رفع کیا جا سکتا ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسے قرآنی آیات کے باہمی تعارض و اختلاف کو بآسانی دور کیا جا سکتا ہے ۔ حدیث کو پرکھنے کا ایک معیار عقل بھی شمار کی جاتی ہے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس کی عقل؟ اگر عقل سے مراد وہ عقل ہے جو روسی اشتراکیت، فرنگی تہذیب یا امریکی ثقافت سے مرعوب ہو تو حدیث کی کیا بساط ہے خود قرآن بھی اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا اور اگر عقل سے مراد عقل سلیم ہے جو قلبِ منیب کی نگرانی میں ہو تو اس شکل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ کوئی حدیث بھی خلافِ عقل نہیں پیش کی جا سکتی ۔

نوٹ

مفتاح دار السعادۃ کا یہ حوالہ ایک گفتگو کے دوران شیخ الحدیث مولانا عبداللہ صاحب امرتسری مہتمم مدرسہ دار القرآن والحدیث فیصل آباد سے معلوم ہوا تھا حفظہ اللہ تعالیٰ وجزاہ عنا خیرا لجزاء ۔

حضرت ماعزؓ اور روایاتِ حدِّ رجم

جو لوگ احادیثِ نبویہ کو اس بنا پر رد کر دیتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کے خلاف ہیں ان کے اس طرزِ عمل کا ایک نمونہ حدِ رجم کی روایات کے بارے میں ان کا موقف ہے۔ یہاں ہم اس موقف کا ناقدانہ تجزیہ کرتے ہوئے اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے۔

حدِ رجم کے بارے میں ایک مسلک تو یہ ہے کہ شادی شدہ زانی کے لئے رجم ہے اور غیر شادی شدہ کے لئے سَو کوڑے ہیں۔ اس مسلک کی طرف اشارات قرآن مجید میں ملتے ہیں، جن کی تفصیل ایک الگ مستقل مضمون میں بیان کی جائے گی۔ ان شاءاللہ اور احادیث میں صراحت کے ساتھ حدِ رجم کا بیان موجود ہے۔ تقریباً چالیس صحابہؓ سے رجم کی روایات ملتی ہیں۔ پھر ہر دور میں ان روایات کو نقل کرنے والے کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ نیز اس حد پر خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں عمل ہوا اور محدثین کرام اور فقہاء، مجتہدین سب نے اس پر اتفاق کیا۔ اہل سنت والجماعت کے تمام مسلک اس پر متفق ہیں حتّٰی کہ شیعہ حضرات بھی اس سے متفق ہیں۔ خوارج اور نظامؔ معتزلی کے سوا پوری امت کا اس پر تعامل اور اجماع پایا جاتا ہے۔ خوارج کا بھی صرف ایک فرقہ ازارقہ رجم کا قائل نہیں ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ چونکہ رجم کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ اسلئے بدکار مرد و عورت کو، خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، صرف سَو کوڑے لگائے جائیں گے۔ قرآن سے یہی ثابت ہے۔ یہ رائے خوارج اور بعض معتزلہ نے اختیار کی ہے۔ اور اس دور کے منکرین سنت بھی اسی خیال کو زور شور سے پیش کر رہے ہیں۔

تیسرا مکتب فکر دوسرے مسلک سے ملتا جلتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ اگر بدکار مرد یا عورت عادی مجرم ہوں یا اُن میں دہشت گردی اور غنڈہ پن پایا جاتا ہو، تو اُن کو آیتِ محاربہ کی روشنی میں رجم کیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ عادی مجرم نہ ہوں تو پھر کسی زانی کو محض شادی شدہ ہونے کی بنا، پر رجم نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف سَو کوڑے مارے جائینگے۔ کیونکہ قرآن میں

صرف یہی ایک سزا مذکور ہے۔ یہ رائے مولانا حمید الدین فراہی کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے حضرات کی ہے۔ یہ بالکل انوکھی رائے ہے اور نیا اجتہاد ہے جو چودہ سو سال کے بعد منکشف ہوا ہے۔ اس رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ بدکار، عادی مجرم، خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، اس کو رجم کیا جائے گا، ورنہ سَو کوڑے لگائے جائینگے۔

زیرِ مضمون میں تیسرے مسلک پر تبصرہ کرنا مقصود ہے ——— "تدبّرِ قرآن" میں اس بارے میں تحریر ہے:

"مجرم دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جن سے چوری یا قتل یا زنا یا قذف کا جرم صادر ہو جاتا ہے، لیکن اُن کی نوعیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ معاشرے کے لئے آفت اور وبال بن جائیں یا حکومت کے لئے لاء اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔

دوسرے وہ ہوتے ہیں جو اپنی انفرادی حیثیت میں بھی اور جتھا بنا کر بھی معاشرے اور حکومت دونوں کے لئے آفت اور خطرہ بن جاتے ہیں۔

پہلی قسم کے مجرموں کے لئے قرآن میں معیّن حدود اور قصاص کے احکام ہیں جو اسلامی حکومت انہی شرائط کے مطابق نافذ کرتی ہے جو شرائط قرآن و حدیث میں بیان ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے مجرموں کی سرکوبی کے لئے احکام سورۂ مائدہ کی آیات نمبر ۳۳ اور ۳۴ میں دیئے گئے ہیں" (صفحہ ۵۰۴، جلد ۴)

دوسری جگہ تحریر ہے:

"یہ سزا (حدِ رجم) ہر قسم کے زانیوں کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ صرف اُن زانیوں کے لئے ہے جو معاشرے کی عزت و ناموس کے لئے خطرہ بن جائیں۔ عام سزا زنا کی وہی ہے جو سورۂ نور کی زیرِ بحث آیت میں مذکور ہے۔ قطع نظر اس سے کہ مرتکبِ جرم شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ" ("تدبّرِ قرآن"، جلد ۴، صہ ۵۰۵)

قرآن مجید کی ان دو آیات:

۱۔ آیتِ محاربہ سورۂ مائدہ،

۲۔ آیت سورۂ نور۔

کی مذکورہ بالا تفصیل و تاویل بالکل انوکھا انکشاف ہے۔ عہدِ صحابہؓ سے لے کر آج تک یہ تفسیر کسی کو نہیں سوجھی۔ اس تاویل کی بنیاد زیادہ تر قیاس و گمان پر ہے۔ کتاب و سنّت سے کوئی نص صریح نہیں پیش کی گئی ہے۔ اس بارے میں جو قرائن و شواہد پیش کئے گئے ہیں ان کی

وضاحت ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱۔ دعویٰ کیا گیا ہے:

"ماعز کی سزائے رجم کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں۔ اُن میں نہایت عجیب قسم کا تناقض ہے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑا بھلا مانس تھا اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہایت بدخصلت گنڈا تھا۔" (حوالہ مذکور)

مزید تحریر ہے کہ:

"میری رہنمائی کے لئے یہی بات کافی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رجم کی سزا دلوائی، اس وجہ سے میں اُن روایات کو ترجیح دیتا ہوں جن سے اس کا وہ کردار سامنے آتا ہے، جس کی بناء پر یہ مستحق رجم ٹھہرا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کسی غزوہ کے لئے نکلتے یہ پیچھے سے دبک کے بیٹھ رہتا اور مردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر شریف بہوؤں بیٹیوں کا تعاقب کرتا۔ بعض روایات سے اس تعاقب کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے کہ جس طرح بکرا بکریوں کا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ یہ عورتوں کے پیچھے "یَنِبُّ نَبِیبَ التَّیسِ"۔۔۔۔۔ حوالہ مذکور:

اس پوری عبارت میں قیاس آرائیوں کی بھرمار ہے۔ اور حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو محض قیاس اور گمان کی بنیاد پر، طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا گیا ہے، مثلاً کہا گیا ہے کہ:

"آپؐ نے اس کو بلوا کر نہایت تیکھے انداز میں پوچھ گچھ کی" (جلد۴، ص۵۰۶)

(ا) واضح رہے کہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو خود بلوایا تھا بلکہ روایات سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو اُن کی قوم نے اس گناہ کے ارتکاب کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری دینے پر آمادہ کیا تھا، جیسا کہ حدیث میں ہے:

نعیم بن ہزال کہتے ہیں:

"كَانَ مَاعِزُ بْنُ مَالِكٍ يَتِيمًا فِي حِجْرِ أَبِي، فَأَصَابَ جَارِيَةً مِّنَ الْحَيِّ، فَقَالَ لَهُ أَبِي، اِئْتِ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فَأَخْبِرْهُ بِمَا صَنَعْتَ لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ لَكَ وَإِنَّمَا يُرِيدُ بِذٰلِكَ رَجَاءَ أَنْ يَّكُونَ لَهُ مَخْرَجًا۔ اَلْحَدِيثُ" (ابوداؤد۔ حدود۔ جامع الاصول ج ۳ ص۵۲۵)

"ماعز بن مالکؓ نے میرے والد کے گھر میں یتیمی کی حالت میں پرورش پائی (پھر ایسا ہوا کہ) ماعز کا ایک لونڈی سے ناجائز جنسی تعلق قائم ہو گیا تو اس وقت میرے باپ نے اس سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دو اور اپنی کرتوت ان کو بتلاؤ، ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے لیے مغفرت طلب کریں (راوی کا بیان ہے کہ میرے والد کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح ماعز کے لئے کوئی صورت نجات کی نکل آئے گی۔"

(ب) "نہایت تیکھے انداز میں پوچھ گچھ کی"

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے واقعے سے متعلق روایات بار بار پڑھنے سے کوئی تیکھا انداز معلوم نہیں ہوتا بلکہ نہایت مشفقانہ انداز سامنے آتا ہے۔ آپؐ کے ہر سوال سے "رحمۃ للعالمین" کی شان جھلکتی ہے مثلاً یہ سوال کہ:

"أَبِكَ جُنُونٌ ؟" "کیا تو جنون زدہ ہے ؟"

جواب میں کہا گیا: "نہیں"

پھر آپؐ نے سوال کیا: "کیا تم شادی شدہ ہو ؟"

انہوں نے جواب دیا: "جی ہاں"

صحیح مسلم میں ہے کہ:

اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ اسے رجم کر دیا جائے نیز حدیث کی عبارت صاف بتا رہی ہے کہ آپؐ نے محض اس بنا پر رجم کا حکم دیا تھا کہ ماعز محصن (شادی شدہ) تھے۔ یعنی انہوں نے بدکاری کا جرم شادی شدہ ہونے کے باوجود کیا تھا، ورنہ آپؐ یہ سوال فرماتے: "کیا تو عادی مجرم ہے؟ اور کیا تو "گنڈا" اور "دہشت گرد" ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا، تو ہم خود ظن و تخمین کی بنا پر انہیں "گنڈا" کیسے قرار دے سکتے ہیں؟

اس واقعہ کی تمام روایات صاف بتلا رہی ہیں کہ رجم کی حد "احصان" شادی شدہ ہونے کی بنا پر دی گئی تھی۔ یعنی "مناطِ حکم" "احصان" ہے۔ پھر یہ کیسے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ: "گنڈا، بدخصلت زانی، خواہ کنوارہ ہو یا شادی شدہ، ہر حال میں رجم کیا جائے گا؟"

باقی رہے "يَنِبُّ نَبِيبَ التَّيْسِ" کے الفاظ، تو ان سے کہاں معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد حضرت ماعز بن مالک الاسلمی رضی اللہ عنہ ہیں۔ جو بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ذات پر حدِ رجم جاری کرنے کی درخواست کرتے رہے۔ بلکہ آپؐ نے عام الفاظ میں فرمایا تھا کہ: "مجھے ایسے افراد پر قدرت حاصل ہوئی، جو عورتوں کا تعاقب کرتے ہیں، تو میں

ان کو ایسی سزا دوں گا جس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔"

یہ کلمات آپؐ نے حضرت ماعزؓ پر حدِ رجم جاری کرنے کے بعد فرمائے تھے۔ اگر واقعی اس سے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ ہی مراد تھے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ الفاظ رجم کی حد جاری کرنے سے قبل ان کے سامنے فرماتے تاکہ ان کو بھی معلوم ہوتا کہ یہ سزا کس جرم میں دی جا رہی ہے؟

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوت شدہ افراد کی غیبت کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ زندہ افراد کی ان کی غیر حاضری میں، غیبت کرنے سے بھی روکتے تھے۔ اور یہاں آپؐ خود ماعزؓ کے رجم ہونے کے بعد اس کی غیبت کر رہے ہیں۔ آخر یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

۲۔ ایک روایت میں ہے کہ:

"رجم کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اُن کے لئے استغفار کیا اور نہ اُن کو برا بھلا کہا۔"

(صحیح مسلم ج ۱۱، کتاب الحدود)

لیکن اگر یہ الفاظ "یَنِبُّ نَبِیْبَ التَّیْسِ ......" حضرت ماعز رضی اللہ عنہ پر چسپاں کر دیئے جائیں اور اس طرح ان کا "بدخصلت گندا" ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجم کرنے کے بعد برا بھلا کہا، ظاہر ہے کہ یہ تشریح حدیث کے الفاظ "وَلَا سَبَّہٗ" کے خلاف پڑتی ہے۔ اور "سَبَّہٗ" کے ہم معنی بن جاتی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ سے رجم کی حد جاری کرنے سے قبل یہ سوال کیوں نہ فرمایا:

"هَلْ كُنْتَ تَنِبُّ نَبِيْبَ التَّيْسِ وَرَاءَ نِسَاءِ الْمُجَاهِدِيْنَ حِيْنَ خَرَجُوْا لِلْغَزْوَةِ ......" بلکہ اس کے برعکس یہ سوال کیا گیا:

هَلْ اَحْصَنْتَ؟ یعنی سوال "احصان" کا ہے اور سزا "نبیب التیس ......" والے جرم کی دی جا رہی ہے یعنی دہشت پسندی اور گندے پن کی! یہ صورتِ حال تو اس طرح کی ہوئی کہ جیسے کسی سے دریافت کیا جائے:

"هَلْ شَرِبْتَ خَمْراً؟" اور اقرار کی صورت میں "قطع ید" کی سزا دی جائے۔

واضح رہے کہ جس طرح چور کی سزا "قطع ید" ایک مستقل سزا ہے۔ اسی طرح آیتِ محاربہ میں جو سزائیں بیان کی گئی ہیں، وہ ڈکیتی، غنڈہ گردی اور دہشت پسندی کے لئے ہیں خواہ زنا کا

ارتکاب کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

پھر ایک انتہائی افسوس ناک صورتحال یہ ہے کہ "تدبر قرآن" میں حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو "بدخصلت گنڈا" قرار دیا گیا ہے اور سہ ماہی رسالہ "تدبر" میں "کٹر منافق" کا لقب دیا گیا ہے۔

(ملاحظہ ہو تدبر نمبر ۳ صـ۳۰)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشہور منافقین مدینے میں دندناتے پھرتے تھے لیکن کسی کو بھی محاربہ کی سزا رجم وغیرہ نہ دی گئی۔ دی گئی تو بیچارے ماعز رضی اللہ عنہ کو، آخر یہ فرق کیوں؟

عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین مدینہ میں موجود تھا۔ اس کی ریشہ دوانیاں اور اسلام دشمن سرگرمیاں کسی سے مخفی نہ تھیں۔

(ملاحظہ ہو، تدبر قرآن جلد ۲ صـ۱۷۵)

لیکن اس پر اور اس کے بدخصلت گنڈے ساتھیوں پر آیتِ محاربہ کے مطابق سزا کیوں جاری نہیں کی گئی؟

آیتِ محاربہ میں "اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا" سے رجم مراد لیا گیا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو دوسرے مستقل مضمون میں ہو سکتی ہے۔ مذکورہ بالا تفسیر ایک قسم کا شذوذ ہے حضرت ماعزؓ کو رجم اس لئے کیا گیا تھا کہ شادی ہونے کے باوجود انہوں نے زنا کا ارتکاب کیا تھا نہ کہ اس بنا پر وہ گنڈے یا عادی مجرم تھے۔

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو "بدخصلت گنڈا" ثابت کرنے کے لئے دوسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نمازِ جنازہ ادا نہیں کی۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

"دوسری روایات میں اس بات کا ذکر بالصراحت ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مغفرت کے لیے دعا کی اور نہ اس کا جنازہ پڑھا۔ جو اس بات کی شہادت ہے کہ اس کو کٹر منافق قرار دیا گیا۔" (سہ ماہی رسالہ "تدبر" شمارہ نمبر ۳ صـ۳۰)

"لَمْ یُصَلِّ عَلَیْہِ" یہ الفاظ سنن ابی داؤد جلد ۴ صـ۵۷۷ کتاب الحدود میں ملتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری روایات بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہیں۔ ایک روایت میں ہے:

"فَقَالَ لَہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرًا وَّصَلّٰی عَلَیْہِ (صحیح بخاری مع فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۲۹ کتاب الحدود)

یعنی حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو رجم کرنے کے بعد آپ نے ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا اور اُن پر نمازِ جنازہ ادا کی۔"

دوسری روایت میں ہے:

"عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ: (فِیْ قِصَّۃِ مَاعِزٍ) یعنی حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ حضرت

فَقَالَ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ أَتُصَلِّیْ عَلَیْہِ قَالَ لَا قَالَ فَلَمَّا کَانَ مِنَ الْغَدِ قَالَ فَصَلُّوْا عَلٰی صَاحِبِکُمْ فَصَلّٰی عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسُ ۔" (مصنف عبدالرزاق ج ۷ ص۳۲۰ فتح الباری ج ۱۲ ص۱۳۱)

ماعزؓ کے واقعے میں راوی کا بیان ہے: "کسی نے سوال کیا کہ آپؐ ماعزؓ پر نمازِ جنازہ پڑھیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: "نہیں!" لیکن دوسرے دن آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "اپنے ساتھی پر نمازِ جنازہ ادا کرو" اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لوگوں نے ماعز رضی اللہ عنہ پر نمازِ جنازہ ادا کی۔"

ابوداؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعزؓ کی نمازِ جنازہ نہیں ادا کی"۔ لیکن صحیح بخاری کی روایت یوں ہے:

"آپؐ نے ان کا تذکرہ اچھے انداز میں کیا اور ان کی نمازِ جنازہ ادا کی۔"

امام بخاریؒ نے اس روایت کو ترجیح دی ہے۔ مصنف عبدالرزاق اور حدیث کی دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"آپؐ نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ پہلے دن نہیں ادا کی لیکن دوسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور لوگوں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔"

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے ذریعے آپؐ کو بتایا گیا کہ ماعز رضی اللہ عنہ کی بخشش ہوگئی ہے اور وہ دعائے مغفرت کے مستحق ہیں۔ اس لئے آپؐ نے دوسرے دن اس کمی کی تلافی فرمادی۔

لفظ "صَلّٰی عَلَیْہِ ....." کو مزید تقویت حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ملتی ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ جب آپؐ نے غامدیہ کو رجم کرنے کے بعد اُن کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا:

"تُصَلِّیْ عَلَیْہَا وَقَدْ زَنَتْ" فَقَالَ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَیْنَ سَبْعِیْنَ مِنْ أَھْلِ الْمَدِیْنَةِ لَوَسِعَتْھُمْ۔ وَھَلْ وَجَدْتَ تَوْبَةً أَفْضَلَ مِنْ أَنْ جَادَتْ بِنَفْسِہَا لِلّٰہِ عَزَّوَجَلَّ۔" (جامع الاصول ج ۳ ص ۵۳۳ بحوالہ صحیح مسلم)

یعنی "آپؐ اس عورت کی نمازِ جنازہ ادا کرتے ہیں، جس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے؟" جواب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اس خاتون نے ایسی توبہ کی ہے کہ اہلِ مدینہ میں سے اگر ستر آدمیوں میں تقسیم کی جائے تو ان کو بھی کافی ہو جائے اور ایسی توبہ سے افضل کیا توبہ ہوگی کہ اس خاتون نے اپنی جان کا نذرانہ اللہ تعالیٰ کے

ابوداؤد، جامع ترمذی) حضورپیش کر دیا۔"

افسوس ہے کہ اس خاتون کے بارے میں بھی رسالہ "تدبر" میں لکھا گیا ہے کہ:

"روایات کے مطالعے سے بیان کا یہ تناقض ہی سامنے نہیں آتا، یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ آزاد قسم کی عورت تھی۔ جس کا نہ کوئی شوہر تھا، نہ سرپرست جو اس کے کسی معاملے کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار ہوتا۔ وضع حمل کی مدت اس نے ایک انصاری کے ہاں گذاری۔" (ص۳۵، شمارہ نمبر ۳)

اصل بات یہ ہے کہ محدثین کے اصول کے مطابق دیکھا جائے تو حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کے قصۂ رجم کی تفصیلات میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے آپؐ نے بچے کی فطامت[1] کے بعد رجم کا حکم دیا اور دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے وضع حمل کے بعد یہ حکم دیا۔ یہاں اس پہلی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔ اس قاعدے کے مطابق کہ "زِيَادَةُ الثِّقَةِ مَقْبُوْلَةٌ۔ یعنی "ثقہ راوی کی طرف سے روایت میں اضافہ معتبر ہوگا۔"

اس کی بیشمار مثالیں احادیث میں ملتی ہیں۔

مزید افسوس یہ ہے کہ "تدبر قرآن" میں انداز ایسا اختیار کیا گیا ہے، جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ غامدیہ خاتون چکلا چلایا کرتی تھیں۔ اصل الفاظ یہ ہیں کہ:

"اس عہد کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بہت سی ڈیرے والیاں ہوتی تھیں، جو پیشہ کراتی تھیں اور ان کی سرپرستی زیادہ تر یہودی کرتے تھے، جو ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد ان لوگوں کا بازار سرد پڑ گیا۔ لیکن اس قسم کے جرائم پیشہ آسانی سے باز نہیں آتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قماش کے کچھ مرد اور بعض عورتیں زیر زمین یہ پیشہ کرتے رہے اور تنبیہ کے باوجود باز نہ آئے، بالآخر جب وہ قانون کی گرفت میں آئے تو سورۂ مائدہ کی اسی آیت کے تحت جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے، آپؐ نے اُن کو رجم کرایا۔"

(تدبر قرآن، جلد ۲ ص۵۰۶)

---

[1] یعنی دودھ چھڑانا

اس طرزِ فکر پر افسوس کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا، کہ عہدِ جاہلیت کی تاریخ تو قابلِ اعتماد ہے، لیکن صحیح مسلم اور ابوداؤد میں ثقہ راویوں کی بڑی تعداد کے ذریعے جو کردار حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کا معلوم ہوتا ہے، وہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ۔"

—— کیا وہ خاتون جو اپنے گناہ کا احساس کرتے ہوئے بار بار یہ کہتی ہے کہ:

يَا رَسُولَ اللهِ، طَهِّرْنِي!" "اے اللہ کے رسولؐ مجھے پاک کر دیجئے!"

جب معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون حمل سے ہے تو آپؐ وضع حمل تک رجم کی سزا کو ملتوی کر دیتے ہیں، لیکن یہ خاتون وضع حمل کے بعد، بغیر کسی دباؤ کے خود بخود حضور صلی اللہ علیہ سلم کی خدمت میں پہنچ کر اپنے اوپر حد جاری کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ اور جب دُودھ چھڑانے کی مدت تک مہلت دی جاتی ہے تو جیسے ہی بچّہ روٹی کھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ اُس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا دے کر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتی ہے کہ "اب یہ بچّہ میرے دودھ کا محتاج نہیں رہا ہے اس لئے مجھے پاک کر دیا جائے۔ اور سیاہ کاری کا جو داغ مجھ پر لگ گیا ہے اُسے حد جاری کر کے دھو دیا جائے۔"

—— یعنی اس خاتون کا مطلب یہ تھا کہ دنیا کی سزا آخرت کے عذاب کے مقابلے میں ہلکی ہے۔ اسے برداشت کیا جا سکتا ہے، لیکن آخرت کا عذاب برداشت نہیں ہو سکتا۔ کیا ایسی پاکباز خاتون کو، آزاد اور ڈیرے والیوں اور زیرِ زمین پیشہ کرانے والیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے؟ اس سے بڑھ کر ایک نیک خاتون صحابیہؓ کی توہین کیا ہو سکتی ہے! پھر کمال یہ ہے کہ اس عورت کو آزاد قرار دینے کی بنیاد سراسر قیاس آرائی، اور تخمین و گمان پر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔" — اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ "گمان کی بہت سی اقسام سے بچو، کیونکہ کچھ گمان گناہ ہیں۔"

(سورۂ حجرات)

⁂

اس خاتون کے آزاد اور لاوارث ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مدّتِ رضاعت گزارنے کے لئے اسے ایک انصاری شخص کے حوالے کر دیا گیا۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

"فَقَالَ: إِذًا لَا نَرْجُمُهَا وَنَدَعُ وَلَدَهَا صَغِيرًا لَيْسَ لَهُ مَنْ يُرْضِعُهُ؟ فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ، فَقَالَ إِلَيَّ رَضَاعُهُ"

يَا نَبِيَّ اللّٰهِ فَقَالَ: فَرَجَمَهَا۔"

لیکن افسوس کہ حضرت غامدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آزاد، یعنی آوارہ ثابت کرنے کا خیال اتنا غالب تھا کہ اسی صحیح مسلم اور ابوداؤد میں، جس کا حوالہ بار بار رسالہ تدبر میں دیا گیا ہے، یہ الفاظ نگاہ سے اوجھل ہو گئے:

"فَقَالَتْ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ أَصَبْتُ حَدًّا فَأَقِمْهُ عَلَيَّ فَدَعَا نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلِيَّهَا فَقَالَ أَحْسِنْ إِلَيْهَا فَإِذَا وَضَعَتْ فَأْتِنِي بِهَا فَفَعَلَ"

(صحیح مسلم مع شرح نووی ج ۲ ص ۶۸ کتاب الحدود)

یعنی "اس عورت نے کہا: "اے اللہ کے نبیؐ میں حد کی سزاوار ہو گئی ہوں تو آپؐ اس کو مجھ پر جاری کیجئے" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ولی کو بلایا، اور فرمایا: "اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور جب وضع حمل ہو جائے تو اس کو میرے پاس لے آؤ!" تو اس نے ایسا ہی کیا۔"

ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ اس خاتون کا کوئی نہ کوئی ولی موجود تھا جس کو آپؐ نے اس خاتون کی سرپرستی کے لئے بلایا، اور اسے حسنِ سلوک کی تاکید کی، اب جس روایت میں: "رَجُلًا مِّنَ الْأَنْصَارِ" ہے، اس سے بھی یہی ولی مراد ہوگا جس کا بیان مذکورہ بالا روایت میں ہے۔ اب دونوں روایتوں میں تعارض کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب خود سوچا جائے کہ کہاں قیاس آرائی پر مبنی جملہ "معلوم ہوتا ہے"، اور کہاں مذکورہ بالا حدیث کی واضح عبارت ہے ــــ کیا ایسی خاتون کو، جو خود اپنے اوپر زنا کی حد یعنی سزائے رجم، جاری کرانے پر مُصر ہو جاتی ہے۔ اور جس کی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اور دورانِ رجم خون کے چھینٹے پڑنے پر، جب حضرت خالدؓ نے اُسے بُرا بھلا کہا، تو آپؐ نے انہیں سختی سے منع فرمایا، آپؐ کے الفاظ یہ ہیں:

"مَهْلًا يَا خَالِدُ، فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً، لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهُ، ثُمَّ أَمَرَ بِهَا فَصَلَّى عَلَيْهَا، وَدُفِنَتْ"۔

(صحیح مسلم جلد ۲، ص ۶۳)

یعنی "اے خالدؓ، نرمی برتو! قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے اگر ناجائز محصول وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرتا، تو اس کی بھی بخشش ہو جاتی" پھر آپؐ نے اس کے بارے میں حکم فرمایا اور اس پر نمازِ جنازہ ادا کی، اور پھر وہ دفن کی گئی۔"

کیا اب چودہ سو سال کے بعد، اس کو آزاد پیشہ کرلنے والی قرار دینا، قذف کے زمرے

میں نہیں آتا؛ بالکل اسی قسم کی صورت حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نظر آتی ہے، کہ ان کو "بدخصلت گنڈا" ثابت کرنے کا خیال اتنا غالب رہا کہ "یَنِبُّ نَبِیبَ التَّیسِ" کے الفاظ تو پیشِ نظر رہے، اور بہ تکلف ان الفاظ کو حضرت ماعز رضی اللہ عنہ پر چسپاں کر دیا گیا؛ لیکن خود ان کے قبیلے کے لوگوں کا بیان لائقِ توجہ نہ رہا اور نہ اس پر اعتماد کیا جا سکا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلے والوں سے دریافت فرمایا تو انہوں نے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا:

مَا نَعْلَمُ إِلَّا وَفِيَّ الْعَقْلِ مِنْ صَالِحِينَا۔ "ماعز رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہمیں یہی معلوم ہے کہ وہ عقل سے بھرپور ہے اور ہمارے نیک لوگوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔"

(صحیح مسلم جلد ۱۱، ص۲۰۳)

رسالہ "تدبر" شمارہ ۳ ص۳۳ پر سنن ابی داؤد کے حوالے سے حدیث بیان کی گئی ہے کہ:

ترجمہ: "اس واقعہ (ماعزؓ کے رجم ہونے) کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے سنا: اس بدبخت کو دیکھو، اللہ نے اس کا پردہ ڈھانکے رکھا تھا، لیکن اس کے نفس نے اس کو نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ کتے کی طرح سنگسار کر دیا گیا۔"

لیکن اس حدیث کے آخری جملے چھوڑ دیئے گئے، یا حضرت ماعزؓ کو "بدخصلت گنڈا" ثابت کرنے کا جوش اتنا غالب رہا کہ حدیث کے آخری الفاظ نگاہوں سے مخفی رہ گئے۔

اس حدیث کے بقیہ الفاظ یہ ہیں:

"فَسَكَتَ عَنْهُمَا ثُمَّ سَارَ سَاعَةً حَتَّى مَرَّ بِجِيفَةِ حِمَارٍ شَائِلٍ بِرِجْلِهِ فَقَالَ أَيْنَ فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَقَالَا نَحْنُ ذَانِ يَا رَسُولَ اللهِ فَقَالَ انْزِلَا فَكُلَا مِنْ جِيفَةِ هٰذَا الْحِمَارِ فَقَالَا يَا نَبِيَّ اللهِ مَنْ يَأْكُلُ مِنْ هٰذَا قَالَ فَمَا نِلْتُمَا

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی بات سن کر سکوت اختیار فرمایا، پھر آپؐ چلے، یہاں تک کہ آپؐ کا گزر ایک ایسے مردہ گدھے کی لاش پر سے ہوا جس کی ٹانگ اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ تو آپؐ نے فرمایا "فلاں اور فلاں کہاں ہیں؟" ان دونوں نے کہا "ہم حاضر ہیں، یا رسول اللہ!" آپؐ نے فرمایا "دونوں اتر جاؤ اور اس گدھے کی لاش میں سے کھاؤ۔" ان دونوں نے عرض کی، "اے اللہ کے نبیؐ، اس گدھے کا گوشت کون کھا سکتا ہے۔" آپؐ نے

مِنْ عِرْضِ اَخِيْكُمَا اٰنِفًا اَشَدُّ مِنْ اَكْلٍ مِّنْهُ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ اِنَّهُ الْاٰنَ لَفِيْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ فِيْهَا۔ (سنن ابی داؤد مع عون جلد۴ص ۲۵۳-۲۵۴ کتاب الحدود)

جواباً فرمایا "ابھی تم نے اپنے بھائی کی آبرو پر جو حملہ کیا تھا وہ اس (مردار گدھے کے) گوشت کھانے سے بھی زیادہ (کراہت کا باعث) ہے ــــ قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، بے شک وہ (ماعزؓ) اس وقت جنّت کی نہروں میں ڈبکیاں لگا رہا ہے:

اسی طرح ابوداؤد کے درج ذیل الفاظ سے حضرت ماعزؓ کو "بدخصلت، گنڈا"، نیز "کٹر منافق" ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

"يَا قَوْمِ رُدُّوْنِيْ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنَّ قَوْمِيْ قَتَلُوْنِيْ وَغَرُّوْنِيْ مِنْ نَفْسِيْ وَاَخْبَرُوْنِيْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرُ قَاتِلِيْ۔"

کہ "(جب حضرت ماعزؓ پر پتھروں کی بوچھاڑ ہوئی تو انہوں نے چیخ کر کہا) اے میری قوم، مجھے رسول اللہؐ کے پاس واپس لے جاؤ، میری قوم نے مجھے قتل کروا دیا اور مجھے دھوکا دیا یہ بتاتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے قتل کروانے والے نہیں ہیں"

حالانکہ اس پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب پتھروں کی بارش ہوئی اور وہ زخموں کی شدّت سے بلبلا اُٹھے تو بے ساختہ ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ بہرحال اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ ماعزؓ کی قوم نے ان سے کہا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دو، شاید کوئی نجات کی شکل نکل آئے ــــ اصل الفاظ یہ ہیں، راوی کا بیان ہے:

"فَقَالَ لَهٗ اِيْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبِرْهُ بِمَا صَنَعْتَ لَعَلَّهٗ يَسْتَغْفِرُ لَكَ وَاِنَّمَا يُرِيْدُ بِذٰلِكَ رَجَاءَ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ مَخْرَجًا۔"

انہی الفاظ کو حضرت ماعزؓ نے "اِنَّ قَوْمِيْ غَرُّوْنِيْ" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کو وقتی طور پر ضعفِ ایمان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بدری صحابی تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان الفاظ کی بناء پر حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو "کٹر منافق"، یا منافق نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اگر یہ منافق تھے تو دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نماز جنازہ کیوں

ادا فرمائی ؟ اور یہ الفاظ کیوں ارشاد فرمائے ؟
"لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً .... الخ !"

حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کے "تلمیذِ خاص" نے مزید ستم یہ کیا ہے کہ الفاظ کا ترجمہ کرنے کی بجائے اپنے خیالات کی ترجمانی فرمائی ہے ۔ مثلاً :

"یَمْنَحُ اِحْدَاھُنَّ الْکُثْبَةَ ۔" (صحیح مسلم ج ۱۱ ص۱۹۶ مع شرح النووی)

کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے :

"اور (وہ) کسی عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا تھا"

حالانکہ اس جملہ کا مطلب صرف اتنا ہے کہ :

"وہ ان عورتوں میں سے کسی کو تھوڑا سا دودھ دے دیتا ۔"

—— اہلِ علم غور فرمائیں کہ صحیح ترجمہ کون سا ہے ؛ اوّلاً تو حدیث کی اس عبارت کو حضرت ماعزؓ پر چسپاں کرنا ہی غلط ہے ۔ اور پھر اس کا ترجمہ غلط در غلط ——

"فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکٰی ۔"

حضرت ماعزؓ کے حسنِ کردار اور گناہ سے ندامت کے بارے میں مزید چند شواہد درج ذیل ہیں :

۱۔ جب ماعزؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اپنی معصیت کا اظہار کیا اور اپنے اوپر حد جاری کرنے کی درخواست کی تو آپؐ نے ان کی قوم اور قبیلے کے افراد سے دریافت کیا (یعنی چال چلن کے بارے میں) تو انہوں نے کہا کہ :

"مَا نَعْلَمُ بِہٖ بَاْسًا اِلَّا اَنَّہٗ اَصَابَ شَیْئًا یَرٰی اَنَّہٗ لَا یُخْرِجُہٗ مِنْہُ اِلَّا اَنْ یُّقَامَ فِیْہِ الْحَدُّ ۔"

یعنی "ہم اس میں کوئی عیب نہیں پاتے ۔ ہاں صرف اتنی بات ہے کہ اس سے گناہ ہو گیا ہے ۔ اسی بناء پر اس کا خیال ہے کہ جب تک اس پر حد قائم نہیں ہو گی بات نہیں بنے گی" (جامع الاصول ج ۳ ص ۵۱۵ بحوالہ صحیح مسلم ۔ ابوداؤد)

دوسری روایت میں ہے :

"قَالُوْا مَا نَعْلَمُ اِلَّا وَفِیَّ الْعَقْلِ مِنْ صَالِحِیْنَا ۔"

(جامع الاصول جلد ۳ ص۵۱۶)

اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت ماعزؓ کی بھی یہی خواہش تھی کہ ان کی ذات پر سیاہ کاری کا جو داغ لگ چکا ہے، اس حد کے اجراء سے صاف کر دیا جائے کتنا پاکیزہ جذبہ ہے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کا؟ اور اس پاکیزہ جذبے کی شہادت کون دے رہا ہے؟ ـــــ خود ان کا قبیلہ!

۲۔ مؤطا امام مالکؒ میں ہے کہ قبیلہ اسلم کا ایک شخص حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ "ذلیل و حقیر آدمی نے بدکاری کا ارتکاب کیا ہے"۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "کیا یہ بات تو نے میرے سوا کسی اور سے بھی بیان کی ہے؟" اس نے جواب دیا "نہیں"۔ تب حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "اللہ تعالےٰ کے دربار میں توبہ کر، اور اللہ تعالےٰ نے جو تیری پردہ پوشی کی ہے، اس پر کاربند رہ (یعنی اپنی اس معصیت کا چرچا نہ کر) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے"۔

راوی کا بیان ہے:

"لیکن ان باتوں سے ماعزؓ کو قرار نہ آیا، وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے حضرت عمرؓ کے سامنے وہی بات دہرائی جو وہ حضرت ابوبکرؓ سے عرض کر چکا تھا۔ اور حضرت عمرؓ نے وہی جواب دیا جو حضرت ابوبکرؓ دے چکے تھے۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر بھی اسے قرار نہ آیا، یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اس نے درخواست کی کہ:

"حقیر ذلیل انسان سے گناہ ہو گیا ہے"۔

بدوی سعید کا بیان ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار اس سے اعراض فرمایا۔۔۔۔ لیکن جب زیادہ ہی اصرار ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کے گھر والوں کو پیغام پہنچایا کہ:

"ماعز بیمار تو نہیں ہے؟ اس پر جنون کا اثر تو نہیں ہے؟"

انہوں نے جواب دیا:

"بخدا وہ صحیح سالم تندرست ہے"۔

اس کے بعد آپؐ نے دریافت کیا کہ:

"یہ کنوارا ہے یا شادی کر چکا ہے؟" (یعنی ثیب ہے؟)

جواب ملا۔

"بَلْ ثَيِّبٌ" (شادی شدہ ہے)

"اس سوال و جواب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے رجم کا حکم دیدیا۔"
(موطا امام مالکؒ ج ۲ ص ۸۲۰ کتاب الحدود، طبع بیروت)

مؤطا ج ۲ ص ۸۲۱ اور ابوداؤد کی دوسری روایت یں ہے:

"ہزال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ماعزؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چار مرتبہ اپنی معصیت کا اقرار کیا۔ تب آپ نے اس پر حدِ رجم جاری کرنے کا حکم دیا ہے اور ہزال سے فرمایا اگر تم اس کی پردہ پوشی کرتے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوتا۔" اصل الفاظ یہ ہیں:

"وَقَالَ لِهَزَّالٍ لَوْ سَتَرْتَهُ بِثَوْبِكَ كَانَ خَيْرًا لَكَ۔"

(ابوداؤد ج ۴ ص ۲۲۳ کتاب الحدود (بَابُ السَّتْرِ عَلَى أَهْلِ الْحُدُودِ)

واضح رہے کہ یہ ہزال، ماعزؓ کے مربّی اور کفیل تھے۔ ماعزؓ کے والد مالک اسلمی رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ ہزالؓ، ماعزؓ کا خیال اور نگرانی رکھیں گے۔ ماعزؓ نے ان کے ہاں پرورش پائی تھی۔

"وَكَانَ مَالِكٌ أَبُو مَاعِزٍ قَدْ أَوْصَى هُزَالًا بِابْنِهِ مَاعِزٍ وَكَانَ فِي حِجْرِهِ يَكْفُلُهُ۔" (تعلیق سنن ابی داؤد جلد ۴ کتاب الحدود)

ان دونوں روایتوں سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ماعزؓ ارتکابِ معصیت کے بعد انتہائی بے چین تھے۔ انہیں کسی کروٹ قرار نہیں آرہا تھا۔ کبھی وہ اس کا اظہار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کرتے اور کبھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچتے۔ آخر کار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر بار بار اپنی بے قراری کا اظہار کیا، اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنے اوپر حد جاری کرنے کی درخواست کی ــــــ کیا جس شخص کا یہ کردار ہو، اُس کو "بدخصلت، گنڈا" اور "کٹر منافق" کہا جاسکتا ہے؟ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرات شیخینؓ نے یہی مشورہ دیا کہ پردہ پوشی بہتر ہے، اگر واقعی حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے گنڈے پن سے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو رہا تھا تو یہ بار بار گناہ کو چھپانے کی تلقین کیوں کی جاتی؟

احادیث میں رجم کے بارے میں حضرت ماعزؓ اور حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ مزید واقعات ملتے ہیں۔ مثلاً خالد بن اللجلاج اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ:

"ہم نو عمر بچے بازار میں کام کاج میں مشغول تھے کہ ایک عورت بچہ لیے ہوئے گذری، لوگ اٹھ کھڑے ہوئے میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ عورت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، لوگ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ آپؐ نے عورت سے دریافت فرمایا:"

"اس بچے کا باپ کون ہے؟"

عورت خاموش رہی (لیکن) ایک نوجوان نے، جو لوگوں کی بھیڑ میں شامل تھا، کہا:

"وہ (بچہ) میرا ہے مجھے آپؐ پاک کر دیجئے۔"

دوسری روایت میں ہے کہ:

آپؐ نے سوال کیا، "کیا تم نے شادی کی ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر آپؐ نے اس نوجوان کے رجم کرنے کا حکم دیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک بوڑھا شخص، سنگسار شدہ نوجوان کے بارے میں دریافت کرتا ہوا آیا۔ صحابہ کرامؓ کا بیان ہے کہ ہم اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور عرض کی:

"یہ بوڑھا اس خبیث کے بارے میں دریافت کر رہا ہے جو آج رجم کیا گیا ہے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"اسے خبیث مت کہو، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، بلاشبہ وہ اب جنّت میں ہے۔"

دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک عنبر سے زیادہ پاکیزہ خوشبو والا ہے۔"

اصل الفاظ یہ ہیں:

"لَهُوَ أَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ۔"

(مسند احمد، جامع الاصول ج ۳ ص ۵۳۵، کتاب الحدود۔ بحوالہ سنن ابی داؤد)

اس روایت میں بھی رجم کا سبب زنا بالاحصان ہے، نہ کہ دہشت پسندی اور غنڈہ گردی۔ ورنہ اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ نیز اگر یہ منافق محارب ہوتا تو آپؐ یہ نہ فرماتے کہ وہ جنت میں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اور حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں روایات میں اگر کہیں کسی لفظ سے مذمّت کا پہلو نکلتا ہے تو خواہ کتنا ہی تکلف ہو یا کتنا ہی وہاں ابہام ہو،

اس کو بہت زور شور سے پیش کیا جاتا ہے، لیکن جن روایات سے واضح طور پران کی تعریف اور حسن کردار ظاہر ہوتا ہے، اسے نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ آخر یہ کون سا انصاف ہے۔ اور علمی تحقیق کا یہ کون سا انداز ہے؟

خاکہ برائے تقابلی مطالعہ

وہ الفاظِ حدیث جن سے مذمت کا پہلو نکلتا ہے:	وہ عبارت حدیث جس سے حسن کردار کا رخ سامنے آتا ہے:
(۱) "یَنِبُّ نَبِیبَ التَّیْسِ ......" یہاں حضرت ماعزؓ کا صراحۃً تذکرہ نہیں ہے، بلکہ لفظ "اَحَدُکُمْ" آیا ہے۔ (صحیح مسلم)	(۱) قَالُوْا اِنَّهٗ وَفِیُّ الْعَقْلِ مِنْ صَالِحِیْنَا۔ یہ حضرت ماعزؓ کے قبیلے والوں کا بیان ہے، سابقہ صفحات میں تفصیل گزر چکی ہے۔ (صحیح مسلم)
(۲) مَا اسْتَغْفَرَ لَهٗ وَلَا سَبَّهٗ۔" ابوداؤد میں ہے" وَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْهِ" یعنی "علیٰ ماعِزٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماعز رضی اللہ عنہ پر نماز جنازہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا نہیں کی (ابوداؤد)	(۲) "ذَکَرَ خَیْرًا وَصَلّٰی عَلَیْهِ" یعنی "علیٰ ماعِزٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ۔ (صحیح بخاری)" وَصَلّٰی عَلَیْهَا" یعنی علَی الْغَامِدِیَّۃِ۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعزؓ اور غامدیہ پر نماز جنازہ ادا کی۔

تعارض روایات کو سابقہ صفحات میں رفع کر دیا گیا ہے کہ آپؐ نے حضرت ماعزؓ کی نماز جنازہ پہلے دن ادا نہیں کی۔ لیکن دوسرے دن آپؐ اور لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی ــــ یہ بات واضح رہے کہ صرف ماعزؓ کے بارے میں تعارض ہے کہ ان کی نماز جنازہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی یا نہیں؟ لیکن حضرت غامدیہؓ پر نماز جنازہ پڑھنے پر روایات میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ (صحیح مسلم، ابوداؤد)

(۳) "فَلَا رُجِمَ رَجْمَ الْکَلْبِ" "دو آدمیوں نے کہا کہ وہ (ماعزؓ) اس طرح سنگسار کیا گیا، جس طرح کتا سنگسار کیا جاتا ہے۔"	(۳) "اِنَّهٗ لَیَنْغَمِسُ الْاٰنَ فِیْ اَنْهَارِ الْجَنَّۃِ" یہ ارشاد نبویؐ ہے کہ" وہ (ماعزؓ) اب جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہا ہے۔"
(۴) "اِلٰی رَجُلٍ مِنَ الْاَنْصَارِ" وَفِیْ رِوَایَۃٍ "اِلٰی رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔	(۴) "دَعَا وَلِیَّهَا، فَقَالَ: اَحْسِنْ اِلَیْهَا" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت غامدیہ رضی اللہ عنہا کے ولی (سرپرست) کو بلایا اور فرمایا:

(۵) اِنَّ قَوْمِیْ غَرُّوْنِیْ وَقَتَلُوْنِیْ ...“

”بے شک میری قوم نے مجھے دھوکہ میں رکھا اور میرے قتل کا سامان کر ڈالا۔“

”اس سے اچھا برتاؤ کرو۔“

(۵) (ا) ”لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ اُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ

(ب) ”لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ سَبْعِيْنَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَوَسِعَتْهُمْ۔“

(ا) ”بے شک ماعز رضی اللہ عنہ نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک امت کے درمیان تقسیم کر دی جائے۔ تو اسے کافی ہو جائے۔“

(ب) ”بلاشبہ اُس (غامدیہ) نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اہلِ مدینہ کے ستر افراد پر تقسیم کر دی جائے تو انہیں کافی ہو جائے۔“

مزدوری تفصیل عرض کر دی گئی ہے۔ اب یہ ناظرین کا فرض ہے کہ وہ ان احادیث صحیحہ کے مفہوم کو متعین کریں۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی فَبَشِّرْ عِبَادِ ۙ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۔ اَلْاٰيَة“ (الزمر، ۱۷-۱۸)

استدراک

صحابہ کرام رض کے اجماعی فیصلوں کے دین میں حجت ہونے کی صراحت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنے ایک مضمون مفصل میں کی ہے، جو فروری ۱۹۵۶ء کے ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ لاہور میں ”سُنّتِ خلفائے راشدین“ کے عنوان سے چھپا تھا۔ آٹھ صفحے کے اس مضمون کا آخری حصہ درج ذیل ہے:

(الف) ”اب میں یہ بتاؤں گا کہ میں خلفائے راشدین کے اس طرح کے طے کردہ مسائل کو کیوں سنّت کا درجہ دیتا ہوں۔ میرے نزدیک اس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس کی پہلی وجہ تو وہ حدیث ہے جو اوپر گذر چکی ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خلفائے راشدین کی سنّت کو سنّت کا درجہ بخشا ہے اور اسی حیثیت سے مسلمانوں کو اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت اور وصیّت فرمائی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اجماع ہمارے ہاں ایک شرعی حجّت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اجماع کی سب سے اعلیٰ قسم اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ ہی ہو سکتی ہے جس کی مثالیں خلفائے راشدین کے عہد میں ملتی ہیں۔ اول تو یہ خیر القرون کے لوگوں کا اجماع ہے۔ جن کی حق طلبی و حق کوشی ہر شبہ سے بالا تر ہے۔ ثانیاً اسی مبارک دور میں عملاً یہ شکل اختیار کی جا سکی کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آیا تو اس وقت کے اہلِ علم اور صالحین کی رائیں معلوم کی گئیں اور پھر ایک متفق علیہ بات طے کر کے ایک خلیفہ راشد نے اس کو جاری و نافذ کیا اور سب نے اس پر بغیر کسی اختلاف و اعتراض کے عمل کیا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ابتدا سے خلفائے راشدین کے تعامل کو ملت میں ایک مستقل شرعی حجت کی حیثیت دی گئی ہے۔ سعید ابن مُسیّب کی فقہ میں حضرت عمر رضؓ اور حضرت عثمان رضؓ کے فیصلوں کو ایک اصولی چیز کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح ابراہیم نخعی کی فقہ میں حضرت علی رضؓ کے فیصلوں کو ایک مستقل جگہ حاصل ہے۔ یہی اعتماد ہر مسلمان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فیصلوں پر ہے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو فقہ مالکی ہو یا فقہ حنفی، ہر ایک کے اندر خلفائے راشدین کے تعامل کو سنت ہی کی حیثیت سے جگہ دی گئی ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ دین کی تکمیل اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہوئی ہے لیکن امّت کی اجتماعی زندگی میں اس کے مضمرات کا پورا پورا مظاہرہ حضرات خلفائے راشدین کے ہاتھوں ہوا۔ انہی کے مبارک دور میں اسلام کے تمام ادیان پر غلبے کا قرآنی وعدہ پورا ہوا اور اسلامی شریعت کے بہت سے احکام کا انطباق زندگی کے معاملات میں عملاً متعین ہوا۔ اس پہلو سے خلفائے راشدین کا دور گویا عہدِ رسالت ہی کا ایک ضمیمہ ہے اور ہمارے لیے وہ پورا نظام ایک مثالی نظام ہے، جو ان کے مبارک ہاتھوں سے قائم ہوا۔ پس اس دور میں جو نظائر قائم ہو چکے ہیں۔ وہ ہمارے لئے دینی حجّت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ہمارے لئے ان سے انحراف جائز نہیں ہے۔ اس کلیہ سے اگر کوئی چیز مستثنیٰ ہو سکتی ہے تو صرف وہ چیز ہو سکتی ہے جو مجرد کسی وقتی مصلحت کے تحت انہوں

نے اختیار فرمائی ہو۔"

(ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور۔ فروری ۵۶ء ص ۳۸، ۳۹)

بلکہ اصلاحی صاحب اس کے بھی قائل ہیں کہ جس مسئلے میں ائمہ اربعہ بھی متفق ہوں تو ان کا یہ اتفاق بھی اجماع اُمت کے مترادف اور دین میں حُجت ہے چنانچہ موصوف ایک مقام پر لکھتے ہیں:

(ب) "ایک انطباق تو وہ ہے جس پر خلفائے راشدین اپنے دور کے اہلِ علم و تقویٰ کے مشورے کے بعد متفق ہو گئے ہیں۔ یہ اسلام میں اجماع کی بہترین قسم ہے اور یہ بجائے خود ایک شرعی حجت ہے۔ اسی طرح ایک انطباق وہ ہے جس پر ائمہ اربعہ متفق ہو گئے ہیں۔ یہ اگرچہ درجے میں پہلی قسم کے اجماع کے برابر نہیں ہے۔ تاہم چونکہ یہ اُمّت من حیث الامّت ان ائمہ پر متفق ہو گئی ہے اور ہر دور کے اہلِ علم و تقویٰ ان کی دینی بصیرت، ان کے تبحر، ان کے مرتبہ اجتہاد اور ان کے تمسک بالکتاب والسنّۃ کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور ان کے دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش مشکل ہی سے کسی نے کی ہے۔ اس وجہ سے ان ائمہ کے کسی اجماع کو محض اس دلیل کی بنا پر رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ معصوم نہیں تھے۔ یہ معصوم تو بے شک نہیں تھے۔ لیکن ان کے معصوم نہ ہونے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ کسی اَمر پر ان کا اتفاق بھی دین میں حجّت نہ بن سکے۔"

(عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ" ص۵۸ طبع فیصل آباد)

اور یہ ظاہر ہے کہ رجم کی وہ زیرِ بحث حد، جس کا انکار مولانا اصلاحی صاحب فرما رہے ہیں، ائمہ اربعہؒ سمیت تمام ائمہ اُمت کا اس پر اتفاق ہے۔ پھر شادی شدہ زانی کے لئے رجم (بطورِ حد) سے انکار کیوں ہے؟

(ج) تفسیر سورۃ الجمعہ میں مولانا اصلاحی تحریر فرماتے ہیں:

"جمعہ کی نماز، اس کی اذان اور اس کے خطبہ سے متعلق یہاں مسلمانوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں اور ان کی ایک غلطی پر جس طرح تنبیہ کی گئی ہے۔ اس کا انداز شاہد ہے کہ جمعہ کے قیام سے متعلق ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام پائی ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں بھی جمعہ کا کوئی ذکر نہ اس سے پہلے آیا ہے، نہ اس کے بعد ہے، بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ اس کے قیام کا اہتمام ہجرت

کے بعد مدینہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور لوگوں کو آپ ہی نے اس کے احکام و آداب کی تعلیم دی۔ پھر جب لوگوں سے اس کے آداب ملحوظ رکھنے میں کوتاہی ہوئی تو اس پر قرآن نے اس طرح گرفت فرمائی گویا براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے احکام و آداب کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ رسول ؐ کے دیئے ہوئے احکام بعینہٖ تعالیٰ کے احکام ہیں ان کا ذکر قرآن میں ہو یا نہ ہو رسول کی طرف نسبت کی تحقیق تو ضروری ہے، لیکن ثابت ہے تو انکا انکار خود اللہ تعالےٰ کے احکام کا انکار ہے، (تدبر قرآن ج ۷ صفحہ ۳۳۹)

قابل غور بات یہ ہے کہ حدِ رجم کا ذکر قرآن میں نہ ہونے کی بنا پر انکار کیوں؟ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ!

ظن کا قرآنی مفہوم اور حدیث نبوی

عام طور پر انکارِ حدیث کے قائلین حدیث سے بدظن کرنے کے لئے مندرجہ ذیل استدلال پیش کرتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ظن کی پیروی سے روکا گیا ہے اور علم ویقین کے اتباع پر زور دیا گیا ہے۔

مثلاً (الف) مشرکین کے بارے میں کہا گیا ہے:۔

ا إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝ (النجم: ۲۸)

وہ (مشرکین) محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور گمان حق سے بے نیاز نہیں کرتا۔

ب۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۝ (بنی اسرائیل: ۳۶)

جس چیز کا تمہیں علم ویقین نہ ہو، اس کے پیچھے نہ لگو۔

محدثین وفقہاء کے نزدیک حدیث سے ظن کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، نہ کہ علم ویقین کا جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر حدیث کو ماخذِ شریعت کیسے مانا جا سکتا ہے۔

اس مغالطہ کے جواب میں پہلے ظن کی تشریح ضروری ہے۔

امام راغب لکھتے ہیں:

اَلظَّنُّ اسم لما يحصل من امارة متى قويت ادّت الى العلم ومتى ضعفت جدًّا لم يتجاوز حَدَّ التَّوَهُّم۔ (مفردات القرآن ص۳۱۹)

یعنی ظن کا اطلاق اس بات پر ہوتا ہے جو انسان کو علامات وآثار سے معلوم ہوتی ہے۔ اب اگر یہ علامات قوی ہیں تو ظن کا درجہ علم ویقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اگر یہ علامات انتہائی کمزور ہیں تو پھر اس کا درجہ وہم کے برابر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں لفظِ ظن۔ علم ویقین اور وہم وشک سب پر بولا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا:۔

(الف) اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلَاقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

(سورہ بقرہ: ۴۶)

جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

(ب) قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً (بقرہ: ۲۴۹)

جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں انہوں نے کہا کہ کتنے کم تعداد والے گروہ کثیر تعداد والے گروہ پر غالب آئے [1]

(ج) لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا (پ ۱۸ سورہ نور ۱۲)

جب تم نے حضرت عائشہؓ پر تہمت تراشی کی خبر سنی اس وقت تم نے مومن مردوں اور مومن خواتین کے بارے میں حُسنِ ظن (خوش گمانی) سے کیوں نہ کام لیا۔

اس آیت میں ظن کے معنی گمان غالب کے ہیں۔

(د) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (الحجرات ع ۲۶)۔

یعنی ایمان والو! گمان کی بہت سی اقسام سے بچو، اس لئے کہ گمان کی کچھ صورتیں گناہ ہیں۔

(و) وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ (سورہ نساء: ۱۵۷)

اور بلاشبہ جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ اس کی طرف سے یقیناً شک میں ہیں، ان کے پاس اس کے بارے میں علم کا سرمایہ نہیں ہے محض گمان کی پیروی ہے۔

ان دونوں آیات میں ظن کو شک کے معنی میں بولا گیا ہے۔

ان تمام آیات پر بیک وقت غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جس ظن کی مذمت کی گئی ہے اس سے ظن کا وُہ مفہوم مراد ہے جو وہم و شک کے ہم معنی ہے اور اور جہاں ظن کو مقامِ مدح میں ذکر کیا گیا ہے، وہاں ظن بمعنی علم و یقین یا گمان غالب ہے۔

حدیث کو جن علماء نے ظنی کہا ہے ان کے نزدیک ظن کے یہ آخری معنیٰ مراد ہیں۔

فالظن الذی تفیدہ الاخبار انما ھو القوی الراجح المقارب

---

[1] ان دونوں آیات میں ظن، علم و یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

لالیقین لا الی القطع [illegible] (مقدمہ فتح الملہم شرح مسلم ص۱۷)

اخبار آحاد جس ظن کا فائدہ دیتی ہیں اس سے مراد وہ ظن غالب ہے جو علم و یقین کی سرحد سے قریب ہوتا ہے" اسی طرح علمائے اصول نے لکھا ہے المتواتر یفید علم الیقین والمشهور یفید علم الطمانینة وخبر الواحد یفید علم غالب الرأی

یعنی حدیث متواتر سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے اور حدیث مشہور سے علم معتبر ہو تو موجب اطمینان ہوتا ہے اور خبر واحد سے گمان غالب کا سرمایہ فراہم ہوتا ہے۔ (حوالہ مذکور)

گمان غالب کا معاملہ ایسا ہے کہ اس سے روزمرہ کے مسائل میں ہمیشہ سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے بغیر شریعت کے بہت سے مسائل معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ مثلاً:-

(۱) اگر کسی موقع پر قبلہ کا رخ مشتبہ ہو جائے تو وہاں تحری کا حکم دیا گیا ہے یعنی خوب غور و فکر کے بعد قرآن و آثار سے مدد لے کر گمان غالب کے مطابق قبلہ کی سمت متعین کی جائے گی۔

(۲) قاضی دو گواہوں کی شہادت پر ایسے شخص کے قتل کا فیصلہ کر دیتا ہے جس پر قاتل ہونے کا الزام ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دو گواہوں کی شہادت زیادہ سے زیادہ گمان غالب ہی کا فائدہ دے سکتی ہے، قرآن حکیم نے خود دو قابلِ اعتماد گواہوں کی شہادت کو معتبر قرار دیا ہے۔ فرمایا:

وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ (سورۃ الطلاق: ۲)

یعنی اپنے میں سے دو قابلِ اعتماد افراد کو گواہ ٹھہرا لو۔

روایت بالمعنیٰ پر اعتراض

منکرین حدیث کی طرف سے ایک شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ چونکہ احادیث کا پورا ذخیرہ روایت بالمعنیٰ کی شکل میں ہم تک پہنچا ہے اس لئے اس میں شک و شبہ کی گنجائش نکل آئی ہے۔ قرآن مجید کی طرح احادیث کے الفاظ اور معانی دونوں ہم تک محفوظ شکل میں نہیں پہنچے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ راویوں سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ معانی و مطالب اپنے الفاظ میں منتقل کرنے میں غلطی ہو گئی ہو۔ اور آپ کے منشا کو کچھ سے کچھ سمجھ گئے ہوں۔" (او کما قیل)۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے یہاں چند ضروری امور پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

۱۔ روایت بالمعنیٰ کو فی نفسہٖ ناجائز قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ خود قرآن مجید نے متعدد مقامات پر یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ حضرت موسیٰ کے فرعون سے مقابلہ کی سرگذشت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیاء کرام کے اقوال مختلف الفاظ میں ذکر کئے گئے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

روایت بالمعنیٰ اور قرآن حکیم[1]

۱۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو جب بیٹے کی پیدائش کی بشارت ملی تو انہوں نے فرمایا:

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (پ سورہ آل عمران آیت ۴۰)

[1] روایت بالمعنیٰ کی یہ بحث زیادہ تر مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) کے ماہنامہ اشاعۃ السنۃ سے مستفاد ہے۔

یعنی حضرت زکریاؑ نے کہا اے میرے پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے پیدا ہوگا حالانکہ مجھے بڑھاپے نے آن گھیرا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟ اللہ تعالےٰ نے فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ حضرت زکریاؑ نے کہا، اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی مقرر فرمائیے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا، تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے بات نہ کرے گا تین دن مگر اشارے سے، اور اپنے رب کو صبح شام یاد کر۔

یہی مضمون سورہ مریم میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:-

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیًّا قَالَ کَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَعَلَیَّ هَیِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْئًا قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (پ۱۶ سورۂ مریم آیت)

مذکورہ بالا دونوں مقامات کی آیات پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بعض الفاظ بھی بدلے ہوئے ہیں جملوں کی ترتیب بھی مختلف ہے اور سورۂ مریم کی آیت میں قدرے اضافہ بھی ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے دونوں مقامات کا منشا ایک ہی ہے۔

دوسری مثال

فرعون، جادوگر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان گفتگو کو قرآن میں متعدد مقامات پر نقل کیا گیا ہے، یہ گفتگو الفاظ کی نوعیت اور ترتیب کے لحاظ سے الگ الگ ہے یہاں صرف مثال کے طور پر جادوگروں کی وہ تقریر اور دعا نقل کی جاتی ہے، جو اسلام لانے کے بعد فرعون کی دھمکی سن کر انہوں نے کی تھی۔

(الف) قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ، وَمَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا، رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ (پ۹ الاعراف ۱۲۹)

"انہوں نے کہا، بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں، تو ہم سے صرف اسی بات کا انتقام لیتا ہے کہ ہم اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لے آئے ہیں جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں۔ اے ہمارے رب! ہمیں صبر کی توفیق عنایت فرما اور اسلام کی حالت میں ہمیں موت دے۔"

(ب)- قَالُوْا لَاضَيْرَ- اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ، اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ (پ۱۹ - الشعراء آیت ۵۱)

انہوں نے کہا، کوئی اندیشے کی بات نہیں، بیشک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں، ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری خطائیں بخش دیگا اس بنا پر کہ ہم ہیں پہلے ایمان لانے والے"

(ج) قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ، اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا، وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ

(پ ۱۶ سورہ طٰہٰ آیت ۷۳)

انہوں نے کہا، ہم اپنے فاطر وخالق اور جو ہمارے پاس کھلی نشانیاں اور دلائل آئے ہیں، اُن کے مقابلہ میں ہم تجھے (تیری بادشاہت کو) ترجیح نہیں دے سکتے۔ جو تو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر ڈال، بس تیرا فیصلہ اس دنیاوی زندگی میں چل سکتا ہے، بیشک ہم اپنے رب پر ایمان لائے تاکہ وہ ہماری خطائیں اور جس جادو پر تو نے ہمیں مجبور کیا ہے معاف فرماتے"

ان تینوں مقامات پر الفاظ اور ترتیب کے لحاظ سے فرق ہے لیکن مفہوم اور منشا سب جگہ ایک ہی ادا ہو رہا ہے۔

تیسری مثال

اصل مُدعا کی وضاحت کے لئے مزید ایک مثال پر غور کر لیا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاں سے واپس ہوئے تو راستے میں انہوں نے اپنے گھر والوں سے جو گفتگو کی ہے، قرآن مجید نے اسے الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ متعدد مقامات پر اس طرح نقل کیا ہے۔

(الف) اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (سورہ طٰہٰ - آیت ۱۰)

جب موسیٰ علیہ السلام نے آگ دیکھی تو انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا، ٹھہرو! میں نے آگ دیکھی ہے، توقع ہے کہ میں اس میں سے ایک شعلہ تمہارے پاس لے آؤں گا یا

(کم از کم) آگ کا کوئی پتہ چل جائیگا۔

(ب) اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَهْلِهٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۔ (پ ۱۹ سورہ النمل آیت ۷)

(ج) قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۔ (پ القصص آیت ۲۹)

ان آیات میں خط کشیدہ کلمات اپنی ظاہری ہیئت کے لحاظ سے مختلف ہیں لیکن معنوی اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن مجید کے اس طرز تعبیر سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ قائل کا اگر اصل مُدعا اور منشا اپنی جگہ پر محفوظ رہے، تو الفاظ کا اختلاف ایسا نہیں ہے کہ جسے کسی شکل میں بھی برداشت نہ کیا جا سکے۔

اسی بنا پر اگر محدثین کی اکثریت نے روایت بالمعنیٰ کو جائز بھی قرار دیا ہے تو اس کے ساتھ نہایت کڑی شرطیں بھی لگائی ہیں ان شرائط کی تفصیل آئندہ صفحات میں کی جائیگی۔

اس موقع پر یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ بندوں کی صلاحیت و استعداد کو اللہ تعالےٰ کی قدرت کاملہ پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے یہاں تو ہر وقت غلطی اور بھول چوک کا امکان ہے۔

اس شبہ کے ازالہ کے لئے دو امور کی وضاحت ضروری ہے۔

(الف) محدثین نے اسی انسانی کمزوری کی بنا پر خطا اور غلطی کے امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے انتہائی احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں۔

(ب) نیز اسی وجہ سے تمام علماء امت کے نزدیک علم و یقین کا جو درجہ قرآن مجید کو حاصل ہے وہ احادیث کو حاصل نہیں ہے۔

۲۔ احادیث کے سارے ذخیرے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام روایات تین قسم کی ہیں:۔

(۱) قولی۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرامین۔

(۲) فعلی۔ یعنی آپ کی عملی زندگی کی تفصیل۔

(۳) تقریر۔ یعنی ایسے افعال جو آپ کے سامنے کئے گئے لیکن آپؐ نے انکی ممانعت نہ فرمائی۔

ظاہر ہے کہ روایت بالمعنیٰ کی ضرورت پہلی قسم کی روایات کے بیان کرنے میں ہی پیش آ سکتی ہے۔ پھر اس بارے میں دوسری بات یہ ہے کہ آپؐ کی قولی احادیث کا ایک اچھا خاصا حصہ ایسا ہے جس کو راویوں نے الفاظ و معانی دونوں کو محفوظ رکھتے ہوئے جوں کا توں نقل کر دیا ہے۔ مثلاً مسنون دعائیں، احادیث قدسیہ، اذان و اقامت کے کلمات اور عبادات سے متعلق اذکار و اوراد ان کے علاوہ احادیث کا جو ذخیرہ باقی رہتا ہے اس کے نقل کرنے میں بھی ثقہ راویوں نے الفاظ کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ناگزیر حالات ہی میں روائت بالمعنیٰ کا سہارا لیا گیا ہے۔

روائت بالمعنیٰ کی شرط

حافظ ابن حجرؒ شرح نخبۃ الفکر میں لکھتے ہیں:۔

ولا یجوز تعمد تغییر صورۃ المتن مطلقا ولا الاختصار منه بالنقص ولا ابدال اللفظ المرادف لهٔ الا لعالم بمدلولات الالفاظ۔

یعنی متن حدیث کو عمداً بدلنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے اور نہ الفاظ کم کر کے اختصار کرنا جائز ہے اور نہ ایک ہم معنی لفظ کی جگہ دوسرا ہم معنیٰ لفظ رکھا جا سکتا ہے۔ ان سب تبدیلیوں کی اجازت اس کو دی جا سکتی ہے جو الفاظ کے معانی و مطالب سے پوری طرح باخبر ہو۔

امام نووی مقدمہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں:۔

اذا اراد روایة الحدیث بالمعنیٰ فان لم یکن خبیرا بالالفاظ و مقاصدها عالما بما یختل معانیها لم یجز له الروایة بالمعنیٰ بلا خلافٍ بین اهل العلم بل یتعین اللفظ۔

(مقدمہ شرح صحیح مسلم صـ۱۹ اصح المطابع)

"جب کوئی راوی حدیث کو روائت بالمعنیٰ کے طور پہ نقل کرے اور الفاظ کے معنی اور ان کے مطالب و مقاصد سے بے خبر ہو، اور اُسے یہ بھی علم نہ ہو کہ کن تغیرات سے معانی میں خلل آتا ہے تو اس کے لئے روائت بالمعنیٰ جائز نہیں ہے۔ بلکہ الفاظ کی پابندی لازمی ہے۔"

اہل علم کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حافظ ابن الصلاح کا بیان ہے کہ محدثین، فقہا اور علماء اصول کی اکثریت روایت بالمعنیٰ کے جواز کی قائل ہے۔ بشرطیکہ راوی عربی زبان سے پوری طرح باخبر ہو اور معانی کو اصل الفاظ کے علاوہ دوسرے الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کی خوب مہارت رکھتا ہو۔

(مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۰۵)

۳۔ منکرین حدیث کی طرف سے روایت بالمعنیٰ پر جو اعتراض کیا جاتا ہے، یہی اعتراض ترجمہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس کی اہمیت اور ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر ترجمہ کی اجازت نہ دی جاتی تو شریعت کے احکام غیر عربی اقوام تک کیسے پہنچائے جا سکتے ہیں۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بادشاہوں کے نام جو دعوتی خطوط بھیجے تھے۔ ان کے مطالب کو ترجمہ ہی کے ذریعے مکتوب الیہم تک پہنچایا گیا تھا اور اس طرح ان پر دعوت و تبلیغ کی حجت تمام کی گئی تھی۔

کتابت حدیث کے بارے میں روایات و آثار

ذیل میں ان روایات و آثار کی صحیح تشریح پیش کی جاتی ہے، جن کو عام طور پر منکرین حدیث اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کی کتابت سے روک دیا تھا۔"

لیکن جب تک اس روایت کے پورے الفاظ سامنے نہ ہوں اصل حقیقت واضح نہیں ہوسکتی۔ امام مسلم نے یہ روایت اپنی تالیف لطیف میں اس طرح نقل کی ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَکْتُبُوْا عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْآنِ وَمَنْ کَتَبَ عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْآنِ فَلْیَمْحُہٗ وَحَدِّثُوْا عَنِّیْ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ (مسلم ج ۲ ص ۴۱۴)

"ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھ سے قرآن کے علاوہ نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ لکھا ہے اسے مٹا دے۔ مجھ سے حدیث بیان کرو تو کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے مجھ پر جانتے بوجھتے جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔"

عام طور پر منکرین حدیث اس روایت کا پہلا اور دوسرا فقرہ بڑے زور شور سے پیش کرتے ہیں لیکن تیسرے فقرے کو بالکل پی جاتے ہیں۔ اولاً یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس روایت میں کتابت حدیث کی ممانعت سے یہ کہاں لازم آیا کہ حدیث دینی حجت بھی نہیں ہے۔ جب کہ اس کے متصل ہی "حَدِّثُوْا عَنِّیْ وَلَا حَرَجَ" موجود ہے۔

ثانیاً آپ کا یہ حکم وقتی اور عارضی تھا نہ کہ دائمی اور مستقل۔ مصلحت یہ تھی کہ اگر ابتدائی دور میں قرآن و سنت دونوں کے قلم بند کرنے کا رواج عام ہوگیا تو قرآن و حدیث کے مابین امتیاز نہ ہوسکے گا اس وقت بعد کے زمانہ کی طرح کاغذ اور کتابت کی سہولت نہ تھی لوگ عام پر ہڈیوں پتھر کی سلوں اور صاف ستھرے چمڑوں پر لکھا کرتے تھے۔ کاتبوں کی تعداد بھی بہت ہی کم تھی۔ ا[illegible] نا پر قرآن و سنت دونوں کی کتابت و ترتیب کا اہتمام اس شکل میں تقریباً ناممکن [illegible] کے مابین پوری طرح امتیاز برقرار رکھا جاسکے، آپ کے اس

حکیمانہ ارشاد سے ایک طرف قرآن حکیم کی امتیازی شان اپنی جگہ برقرار رہی اور دوسری طرف سنت کی ایک الگ حیثیت بھی واضح ہو گئی ۔

باقی رہا یہ سوال کہ کتابت حدیث کی ممانعت کو عارضی ہدایت قرار دینا کن دلائل کی بنا پہ ہے تو اس کے جواب میں عہدِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ کے بے شمار ایسے واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے واضح طور پہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود احادیث لکھوائیں ، لوگوں کو ترغیب دی ، صحابہ کرامؓ تابعین اور سلف صالحین نے اس پہ عمل کیا ۔

ظاہر ہے کہ اگر ممانعت والی روایت کوئی مستقل ضابطہ ہوتا تو پھر خود ہی آپ اپنے طرزِ عمل سے اس کی مخالفت کیوں فرماتے ۔ اس سلسلے میں چند مستند شواہد پیش کئے جاتے ہیں ۔

اس بارے میں سب سے زیادہ اہم وہ روایت ہے جس میں آپ نے مرض الموت کی حالت میں صحابہ کرام کو قلم دوات لانے کا حکم دیا تھا ۔ آپ نے فرمایا تھا " اِئْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ اَکْتُبْ لَکُمْ

(صحیح بخاری مصری ج ۱ ص ۳۹)

اگر قرآن مجید کے علاوہ لکھنا لکھانا قطعاً ممنوع تھا تو اس ارشاد کے معنی کیا ہوں گے ؟

واضح رہے کہ یہ آپ کی زندگی کے آخری دور کا فرمان ہے اسی روایت میں حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی درج ہے کہ حسبنا کتاب اللہ " ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے " ۔

جس کو منکرین حدیث بڑے زور شور سے پیش کرتے ہیں ۔ یہاں قابل غور معاملہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد " ائتونی بکتاب اکتب لکم " پہ اس کو مقدم کیا جا سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ حدیث نبویؐ ، قولِ صحابہ پہ بہر حال مقدم ہو گی ۔ مزید وضاحت آئندہ عرض کی جائے گی ۔ ان شاء اللہ ۔

آثار صحابہ کرامؓ

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس ایک مجموعہ حدیث تھا جس کو انہوں نے جلا ڈالا تھا ۔

اس روایت کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی سند قابل اعتماد نہیں ہے ۔ اس روایت کے راویوں میں ایک صاحب علی بن صالح مدنی ہیں ۔ جن کے بارے میں محدثین نے نے کہا ہے کہ وہ مستور الحال ہیں ۔ یعنی ان کے احوال و کوائف معلوم نہیں ہو سکے ہیں ۔ اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا (ملاحظہ ہو تقریب التہذیب)

حافظ ذہبی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس پر سند کے لحاظ سے تنقید بھی کر دی ہے، لیکن افسوس ہے کہ حامیانِ انکارِ حدیث اس روایت کو تو اپنی کتابوں رسالوں میں نقل کر دیتے ہیں۔ لیکن سند پر مصنف کی جرح کو گول کر جاتے ہیں۔ آخر یہ کہاں کی دیانت اور کہاں کا انصاف ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی طرف مندرجہ ذیل روایت بھی منسوب کی جاتی ہے اور انکارِ حدیث کے سلسلے میں اس کو بڑے شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ آج تم احادیث کی روایت میں مختلف ہو۔ تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اور بھی زیادہ اختلاف میں مبتلا ہو جائینگے۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث نہ بیان کرو، اگر تم میں سے کوئی حدیث کے متعلق سوال کرے تو صرف ایک ہی جواب دو۔ کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے اس میں جو کچھ حلال ہے، اسے ہم حلال سمجھتے ہیں اور جو حرام ہے اُسے حرام سمجھتے ہیں۔"

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ صـ ۳)

اس روایت کے راوی عبداللہ بن ابی ملیکہ نے حضرت ابوبکرؓ کا زمانہ نہیں پایا۔ اسلئے جب تک کہ بیچ کی کڑی معلوم نہ ہو، یہ روایت قابلِ اعتماد قرار نہیں دی جا سکتی۔ پھر دوسرا اہم اشکال یہ ہے کہ اس روایت کے راوی عبداللہ ابن ابی ملیکہ کی وفات ۱۱۷ھ میں ہوئی ہے اور حافظ ذہبی مصنف تذکرۃ الحفاظ کی وفات آٹھویں صدی ہجری میں بتائی جاتی ہے۔ درمیان کے راوی غائب ہیں۔ ان کا ذکر حافظ ذہبی نے نہیں کیا، اس لئے ایسی روایت جس کے چھ صدیوں کے راویوں کا پتہ نہ ہو۔ کس طرح قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے۔

مذکورہ بالا روایات و شواہد کی طرح بعض دوسرے واقعات بھی صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ اور تابعین میں سے ایک اچھی خاصی تعداد کتابتِ حدیث کو پسند نہ کرتی تھی۔

اس قسم کی روایات کو منکرینِ حدیث جامع بیان العلم و اہلہ (مصنفہ ابن عبدالبر) کے حوالے سے اس طرح نقل کرتے ہیں گویا یہ حضرات (صحابہ اور تابعین) سب کے سب حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے حالانکہ مصنف کتاب نے اس قسم کے واقعات کو درج کرنے کے بعد کتابتِ حدیث سے احتراز کے وجوہ و اسباب بھی لکھ دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

من کرہ کتابۃ العلم فانما کرھہ لوجھین، احدھما ان لا یتخذ مع القرآن کتاب یضاھی بہ، ولئلا یتکل الکاتب علی ما یکتب فلا یحفظ فیقلّ الحفظ۔ (جامع بیان العلم ص۳۵)

یعنی جن لوگوں نے کتابتِ علم کو ناپسند کیا ہے ان کی ناپسندیدگی کے اسباب دو ہیں۔

(۱) اس خطرے سے بچنے کے لئے کہ کہیں قرآن کے ساتھ کوئی ایسی کتاب نہ بنالی جائے جو قرآن ہی کے ہم پلہ قرار پائے۔

(۲) کہیں ایسا نہ ہو کہ لکھنے والا اپنے لکھے ہوئے پر اعتماد کر کے حافظہ سے کام لینا چھوڑ دے اس طرح حفظ کرنے کرانے کا رواج کم ہو جائے گا۔

لیکن کتابتِ حدیث کے بارے میں یہ مسلک تمام صحابہ اور تابعین کا نہ تھا، بلکہ صحابہ اور تابعین کی ایک بہت بڑی تعداد کتابتِ حدیث کی نہ صرف یہ کہ قائل تھی بلکہ وہ خود بھی اس پر عملاً کاربند رہی۔

حافظ ابن عبدالبر نے جہاں کتابتِ حدیث کو ناپسند کرنے والے اہلِ علم کے اقوال نقل کئے ہیں وہاں ساتھ ہی بہت سے صحابہ اور تابعین سے ایسے اقوال و واقعات بھی نقل کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام نے کتابتِ حدیث کے معاملہ میں انتہائی اہتمام اور انہماک سے کام لیا ہے۔ چند حوالے ملاحظہ ہوں:۔

(۱) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ مَا یُرَغِّبُنِیْ فِی الْحَیٰوۃِ اِلَّا خَصْلَتَانِ، اَلصَّادِقَۃُ وَالْوَھْطُ، فَاَمَّا الصَّادِقَۃُ فَصَحِیْفَۃٌ کَتَبْتُھَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَمَّا الْوَھْطُ فَاَرْضٌ تَصَدَّقَ بِھَا عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ کَانَ یَقُوْمُ عَلَیْھَا (ص۲ج۱ جامع بیان العلم)

یعنی عبداللہ بن عمرو بن العاص نے فرمایا، مجھے اپنی زندگی میں صرف دو چیزیں بہت ہی مرغوب و محبوب ہیں (۱) الصادقہ (۲) الوہط" صادقہ: وہ صحیفہ" ہے جسے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھا ہے اور وھط ایک زمین ہے، جسے عمرو بن العاص نے اللہ کی راہ میں وقف کر دیا تھا۔ اور وہ اُس کی نگرانی کیا کرتے تھے

۲۔ سَعْدُ بْنُ اِبْرَاھِیْمَ قَالَ اَمَرَنَا عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ بِجَمْعِ السُّنَنِ فَکَتَبْنَاھَا دَفْتَرًا دَفْتَرًا فَبَعَثَ اِلٰی کُلِّ اَرْضٍ لَّہٗ عَلَیْھَا سُلْطَانٌ دَفْتَرًا۔

(ص۷۶ج۱ حوالہ مذکور)

یعنی سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ ہم کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سنن واحادیث مشتمل بر احکام و مسائل ، جمع کرنے کا حکم دیا۔ ہم نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ لکھے ہوئے مجموعے تمام مقبوضہ ممالک میں بھیج دیئے۔

(۳) ابن عبدالبر لکھتے ہیں :

وقد دخل علی ابراهیم النخعی شیٔ فی حفظہ لترکہ الکتاب وعن منصور کان ابراهیم یحذف الحدیث فقلت لہ ان سالم بن ابی الجعد یتم الحدیث قال ان سالماً کتب وانا لم اکتب۔

(ص ۷۰ حوالہ مذکور)

یعنی کتابت چھوڑ دینے کی وجہ سے ابراہیم نخعی کے حافظہ میں ضعف آ گیا تھا منصور سے روایت ہے کہ ابراہیم نخعی حدیث کے الفاظ حذف کر دیا کرتے تھے یعنی پورے نہیں بیان کرتے تھے ، میں نے ان سے کہا کہ آپ حذف سے کام لیتے ہیں اور سالم بن جعد حدیث کے پورے الفاظ بیان کرتے ہیں ، انہوں نے جواب دیا۔ بات یہ ہے کہ سالم لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔

یہ چند مثالیں نمونے کے طور پر بیان کر دی گئی ہیں ، ورنہ اس قسم کے واقعات ابن عبدالبر اور دوسرے اہل علم نے بے شمار بیان کئے ہیں۔ اب یہ کہاں کی دیانت ہے کہ ان روایات سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور صرف اپنے مطلب کی روایات کو اس انداز سے پیش کیا جائے گویا یہ سب بزرگ سرے سے ہی حدیث کے مخالف تھے۔

پھر لطف یہ ہے کہ ان روایات میں سے بہت سی سند کے اعتبار سے ناقابلِ اعتماد ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بعد کے واقعات وحالات نے یہ بات واضح کر دی کہ قائلین کتابتِ حدیث کا مسلک دینی مصالح کے لحاظ سے زیادہ محتاط اور راجح تھا۔ یہ انہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ آج سینوں اور سفینوں میں محفوظ کیا ہوا ذخیرہ ہم تک پہنچ رہا ہے ، اور انسانی آبادی کی ایک بڑی تعداد اس پر عمل پیرا ہو کر دنیا و آخرت کی سعادتیں سمیٹ رہی ہے۔

سابق صفحات میں بتایا گیا ہے کہ بعض صحابہ اور تابعین کتابتِ حدیث دو وجوہ کی بنا پر ناپسند کرتے تھے۔ ان میں سے ایک وجہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں قرآن اور غیر قرآن کے درمیان التباس و اشتباہ کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ اس بارے میں حافظ ابن الصلاح نے لکھا ہے کہ یہ اختلاف ابتدائی دور میں تھا۔ اس کے بعد یہ اختلاف ختم ہو گیا اور تمام سلف صالحین کا کتابتِ حدیث کے جواز پر کامل اتفاق ہو گیا۔

(مقدمہ ابن الصلاح صا۱۷)

دوسری وجہ یہ تھی کہ اہلِ عرب اپنی قوتِ حافظہ کی بنا پر اپنی معلومات کو قلم بند کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن یہ مسلک بھی تمام اہلِ علم کا نہ تھا۔ کتابت کو ناپسند رکھنے والوں کی دلیل یہ تھی کہ اس طرح لکھے ہوئے سرمایہ پر اعتماد کی وجہ سے حافظہ کا استعمال کم ہو جائے گا جس کا لازمی نتیجہ ضعفِ حافظہ کی شکل میں ظاہر ہو گا۔

مستند تاریخ میں عربوں کی قوتِ حافظہ کے جو واقعات ملتے ہیں ان کی بنا پر مذکورہ بالا استدلال کسی نہ کسی حد تک وزن ضرور رکھتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے حفظ کے ساتھ ساتھ کتابتِ حدیث کا بھی اہتمام کیا، اُمت پر ان کے احسانِ عظیم کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حافظانِ حدیث اور کاتبینِ حدیث (جو قوتِ حافظہ میں بھی ممتاز ہیں) دونوں کے تعاون سے اخبارِ آحاد کی جمع و تدوین میں بہت ہی کم غلطی کا امکان رہ گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ایک مجلس میں ستّر اشعار سُنے اور پھر ان کو اسی وقت من وعن سُنا دیا۔ نہ کہیں اٹکے اور نہ کوئی لفظ چھوٹنے پایا۔ (جامع بیان العلم صہ۳۵)

مشہور محدث امام زہری (ف ۱۲۴ھ) کا حافظہ انتہائی قابلِ رشک تھا۔ وہ خود بیان کرتے ہیں۔ "واللہ ما سمعت اذنی شیئاً فنسیت (جامع بیان العلم، باب کراہیۃ کتاب العلم صہ۳۵) " بخدا کوئی بات ایسی نہیں ہے جو میرے کانوں نے سنی ہو اور پھر میں اُسے بھول گیا ہوں" اس بنا پر امام زہری فرماتے ہیں کہ اس اندیشہ کی بنا پر کہ کہیں کان میں کوئی غلط بات یا فحش کلمہ پڑ جائے اور پھر اس کا حافظہ سے محو کرنا مشکل ہو،" میں جب بازار سے گذرتا ہوں تو اپنے کان بند کر لیتا ہوں" (حوالہ مذکور)

اسی طرح محدثین کرام کی قوتِ حافظہ بھی مشہور ہے۔ امام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ

(ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ) کا واقعہ مشہور ہے۔

وہ جب بغداد تشریف لائے تو ان کے حافظہ کا امتحان لینے کی غرض سے مقامی محدثین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، امتحان کا طریقہ یہ رکھا گیا کہ پہلے سے سو احادیث کی اس طرح ترتیب دیگئیں کہ ایک حدیث کی سند دوسری روایت سے جوڑ دی گئی اور اس کا متن کسی اور روایت کی سند سے منسلک کر دیا گیا۔ اس طرح سند و متن کے لحاظ سے یہ سو روایات باہمی خلط ملط کر دی گئیں۔ روایات کی اصل سند اور متن کی ترتیب کا پہچاننا بظاہر انتہائی دشوار ہو گیا۔

جب امام بخاریؒ کے سامنے طے شدہ پروگرام کے مطابق دس علماء حدیث نے دس دس روایات پڑھ کر سنادیں اور ان سو روایات کی قرأت ہوچکی تو امام بخاریؒ نے پہلے محدّث کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ آپ نے یہ حدیث پڑھی تھی اس کی سند وہ نہیں ہے جو آپ نے بیان کی ہے بلکہ اسکی سند حدیث نمبر فلاں کے ساتھ جوڑ دی گئی ہے، اس طرح امام بخاریؒ نے ان روایات کی ہر سند اور متن کے بارے میں اصلی مقام اور ترتیب کی نشان دہی کر دی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ فتح الباری، الاکمال فی اسماء الرجال ص۶۲۶)

اس واقعہ سے جہاں امام بخاری کی بے پناہ قوتِ حافظہ کی تفصیلات سامنے آتی ہیں وہاں اس شبہ کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے کہ پہلی صدی کے اواخر اور دوسری صدی میں بہت سے جھوٹے اور ناقابلِ اعتماد راویوں نے حدیث کی عبارت اپنی طرف سے گھڑ کر اس کے ساتھ کسی صحیح روایت کی سند چپکا دی ہو تو اس کی معرفت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں محدثین کرام کی کاوشیں انتہائی احتیاط اور دور اندیشی پر مبنی ہیں، انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہزارہا راویوں کے حالات کو قلمبند کیا ہے بلکہ ساتھ ہی یہ بھی محفوظ رکھا ہے کہ کس کس محدّث نے کون کون سی روایات کو بیان کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ہر محدّث یا راوی کی روایت کردہ احادیث کا سرمایہ اپنی جگہ متعین ہے تو جعلی متن کا جوڑ کسی صحیح سند کے ساتھ نگاہوں سے کیسے اوجھل رہ سکتا ہے۔ اس بارے میں مزید تفصیل آگے بیان ہو گی۔ انشاء اللہ

قرآن و حدیث کی جمع و ترتیب

۱۔ منکرینِ حدیث کی طرف سے یہ شبہ بڑے زور شور سے پیش کیا جاتا ہے کہ اللہ کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو اپنی زندگی میں مرتب کرا دیا تھا اور اس کی کتابی شکل متعین فرما دی تھی، اگر حدیث کی بھی دین میں کوئی اہمیت ہوتی تو آپ اپنی نگرانی میں اس کی ترتیب و تدوین کا اہتمام بھی خود فرماتے" او کما قیل،

اس بارے میں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ کیا کسی چیز کے ماخذِ شریعت ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے سے کتابی شکل میں منضبط ہو؟ تقریباً اسی قسم کا اعتراض مشرکین مکہ نے قرآن مجید کے بارے میں کیا تھا۔ ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ تھا۔

أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ۔

"یا تو آسمان پر چڑھ جاتے اور ہم اس چڑھنے پر ایمان نہ لائیں گے تاوقتیکہ تو ایسی کتاب نہ لائے جسے ہم خود بھی پڑھ سکیں (پ ۱۵ سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۳)

یعنی ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جب تک کہ قرآن مجید لکھی لکھائی کتاب کی شکل میں ہمارے سامنے نہ ہوگا ہم ایمان نہ لائیں گے۔ لیکن قرآن نے ان کے اس مطالبہ کو ایک بہانہ قرار دے کر ان کا جواب اس طرح دیا ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ (پ ۷ سورہ انعام ۷)

"یعنی اگر ہم آپ پر کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب بھی اتارتے اور یہ لوگ اُسے ہاتھ سے چھو کر دیکھ بھی لیتے تب بھی منکرین یہی کہتے کہ یہ تو صرف کھلا ہوا جادو ہے۔"

اسی قسم کی بہانہ سازی کی شکل منکرین حدیث نے بھی اختیار کی۔ سوال یہ ہے کہ منکرینِ حدیث، احادیث کے سرمایہ کو اس لئے شریعت کا ماخذ نہیں مانتے کہ ان کے نزدیک صرف قرآن ہی ماخذ شریعت ہے۔ یا اس انکار کی بنیاد یہ ہے کہ حدیث کی تدوین عہدِ رسالت میں نہیں ہوئی تھی اور روایت در روایت کی بنا پر اس کا یقینی پہلو مجروح ہو گیا ہے۔ اگر پہلی وجہ ہے تو اس صورت میں اگر حدیث کا پورا سرمایہ کتابی شکل میں منتقل بھی ہو جاتا تب بھی اس کی حیثیت تاریخ دین سے زیادہ نہ ہوتی۔

اور اگر دوسری وجہ ہے تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ ماخذِ شریعت صرف قرآن ہے کیونکہ اس صورت میں کم از کم قرآن کے ساتھ تعاملِ امت کو بہرحال حجت ماننا پڑے

گا - اس کے بغیر قرآنی احکام کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکتا، اسی بنا پر مشہور منکرِ حدیث حافظ اسلم صاحب بھی تعامل امت کو حجت ماننے سے گریز نہ کر سکے -

قائلین حدیث کے ایک استدلال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"پانچویں دلیل ان کی یہ ہے کہ قرآن میں نماز کے اوقات، تعداد رکعات نصاب زکوٰۃ اور روزہ اور حج کی تفصیلات کہاں ہیں ؟ لہٰذا اگر حدیثیں دین نہ مانی جائیں تو یہ باتیں ہم کو کیونکر معلوم ہوں گی ؟ بے شک قرآن کریم نے ان تفصیلات کو اپنے ذمہ نہیں لیا - مگر اس نے اپنے احکام کی عملی تشکیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دی اور فرمایا :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ - تمہارے لئے رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اچھا نمونہ ہے - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے احکام پر عمل کر کے دکھلا دیا اور ان کی تفصیلات اُمت کو سکھا دیں، وہ عملی نمونے سلسلہ بسلسلہ متواتر چلے آرہے ہیں اور بالکل یقینی ہیں"۔ (رسالہ علم حدیث ص۲۶ حافظ اسلم صاحب جیراج پوری نیز مقام حدیث ج ۱)

مذکورہ بالا اقتباس اپنے بعض مندرجات کے لحاظ سے انتہائی دل چسپ اور دعویٰ حسبنا کتاب اللہ کے بالکل مخالف ہے - اس پر تفصیلی گفتگو کسی دوسرے موقعہ پر کی جائے گی - ان شاء اللہ -

یہاں صرف یہ دکھلانا مقصود ہے کہ وہ اُسوۂ حسنہ جسے آپ یقینی قرار دے رہے ہیں کیا اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کتابی شکل میں مدون کر دیا تھا ؟ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کو دینی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مرتب شدہ شکل میں بھی موجود ہو -

خود قرآن مجید کے بارے میں یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہے کہ قرآن حکیم ۲۳ سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا اترتا رہا - اور عہد رسالت کے آخری لمحات میں لوگوں نے اسے مرتب شکل میں اپنے کانوں سے سنا - اور دوسروں تک پہنچایا، لیکن کیا اس وقت وہ مکمل کتابی شکل میں موجود تھا کتابی شکل میں جمع و ترتیب کا کام حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں انجام پایا، جمع قرآن کے اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کی تبلیغ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت ہی میں جائز تھی، اس سے قبل نہیں -

کیونکہ اس سے قبل وہ کتابی شکل میں موجود نہ تھا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن کی ضروری تفصیل بیان کر دی جائے، اس طرح مندرجہ بالا شبہ کا جواب سمجھنے میں سہولت ہو گی۔

کیفیّت جمع قرآن

"قرآن کریم اگرچہ عہدِ نبوّت ہی میں مکمل لکھوا یا گیا تھا، لیکن وہ نوشتے متفرق اور منتشر تھے۔ حضرت عمرؓ کو سب سے پہلے خیال پیدا ہوا کہ ان کو ایک شیرازہ میں جمع کرادیں اور یہ خیال اس وقت پیدا ہوا جب جنگ یمامہ میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ہی مسیلمہ کذاب کی قوم بنی حنیفہ سے ہوئی تھی سات سو حفاظِ قرآن شہید ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر حاملانِ قرآن کا اسی طرح خاتمہ ہوتا گیا تو کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے، اس لئے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے اس خیال کو پیش کیا انہوں نے پہلے تو عذر کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو ایک شیرازے میں جمع نہیں کرایا، اُمت کو لکھا دیا، یاد کرایا اور ان کے اوپر چھوڑ دیا، اب میں وہ کام کیوں کروں جس کو آپؐ نے نہیں کیا۔ مگر حضرت عمرؓ کے اصرار سے وہ اس ضرورت کو سمجھ گئے اور اس کام کے لئے تیار ہو گئے۔"

(تاریخ القرآن مرتبہ حافظ اسلم صاحب جیراجپوری ص۵۲)

خلاصہ یہ ہوا کہ قرآن مجید عہدِ رسالت میں کتابی شکل میں مرتب نہ تھا یہ کام عہدِ صحابہ میں انجام پایا اسی طرح احادیث کا معاملہ ہے کہ وہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں باقاعدہ کتابی شکل میں مُدوّن نہ ہو سکیں۔ لوگوں کے پاس ان کے ذاتی نوٹس اور یادداشتیں تھیں، تابعین اور تبع تابعین کے دَور میں یادداشتیں کتابی شکل میں مرتب کر دی گئیں۔

قرآن حکیم افضل الکتب ہے اس لئے اس کی کتابی صورت میں ترتیب و تدوین کی سعادت صحابہ کرام کو حاصل ہوئی۔ جو پوری اُمت میں اعلیٰ و افضل ہیں، حدیث کا مقام چونکہ قرآن کے بعد ہے اس لئے اس کی باقاعدہ تدوین اور کتابی شکل میں ڈھالنے کا شرف ان تابعین اور تبع تابعین کو حاصل ہوا جو صحابہ کے بعد اُمت میں بہترین شمار ہوتے ہیں۔

جیسا کہ مشہور روایت میں ہے۔ "خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ" "میری امت میں بہترین لوگ میرے زمانہ کے لوگ ہیں

پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے اور پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے "۔

(بخاری مسلم) مشکوۃ باب مناقب الصحابہ ص۵۵۳)

دینی مصلحت وحکمت کے لحاظ سے بھی مناسب یہی تھا کہ قرآن کریم کی اہمیت و عظمت کے پیش نظر پہلے اسے کتابی شکل میں ترتیب دیا جاتا اور اس کے بعد احادیث کی نوبت آتی۔ اس طریق کار نے قرآن وحدیث کے فرق کو بالکل نمایاں کردیا اور امت قرآن وحدیث کے درمیان اشتباہ والتباس کے فتنہ سے بچ گئی۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ معلومات کا ذخیرہ خواہ وہ دینی یا قانونی حیثیت رکھتا ہو اس کے قابل اعتماد ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر دور میں تحریری شکل میں بھی موجود ہو۔

آج یورپ کے متعدد ممالک برطانیہ وغیرہ ایسے ہیں جن کا دستور تک تحریری نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ملک کا نظام چل رہا ہے اور وہاں کسی کے دل میں یہ شبہ نہیں پیدا ہوتا کہ ہمارا دستور مملکت چونکہ Unwritten (تحریری طور پر غیر مرتب شدہ) ہے اس لئے ہم اسے کیسے قبول کر سکتے ہیں۔

اس موقعہ پر ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جمع قرآن کی سعادت حاصل کی۔ تو کیا حضرت عمرؓ احادیث کا کوئی مجموعہ کتابی شکل میں مرتب نہ کرا سکتے تھے اس سوال کے جواب میں اتنا عرض کردینا کافی ہوگا کہ دیکھنا یہ ہے کہ کیا دورِ فاروقی کے حالات اس کام کیلئے سازگار بھی تھے؟ اس زمانہ میں صحابہ کرام مختلف علاقہ جات اور ملکوں میں منتشر ہوگئے تھے اور اسلامی فتوحات کی مصروفیتوں کی وجہ سے یہ ناممکن تھا کہ صحابہ کرام کی تمام روایات کو یکجا کرکے کتابی شکل میں مجموعہ شائع کرنے کی ذمہ داری حضرت عمرؓ اپنے اوپر لیتے۔ حضرت عمرؓ کا تدوینِ حدیث کا ارادہ کر لینے کے بعد اس کے فسخ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

گذشتہ صفحات میں اس شبہ کا ازالہ کیا گیا تھا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں احادیث کو مرتب فرماکر کتابی صورت میں امت کے حوالے کیوں نہ کر دیا! اب آئندہ صفحات میں منکرینِ حدیث کے دوسرے شبہات ومغالطات کی حقیقت واضح کی جائے گی۔

تدوینِ سُنّت

تحریفِ دین کی ایک صورت انکارِ سنت کی شکل میں آج کل منظرِ عام پہ آ رہی ہے۔ اس گروہ کے سرخیل سُنّت کی عظمت و اہمیت کم کرنے کے لئے مختلف نوع کے شبہات لوگوں کے دلوں میں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ:۔

(الف) سُنّت کا کیا اعتبار یہ تو دوسری تیسری صدی ہجری میں تحریری شکل میں مرتب ہوئی تھی۔

(ب) سُنّت اگر واقعی اسلامی شریعت کا ماخذ اور سرچشمہ ہوتی تو کیوں نہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں اسے کتابی شکل میں مدون اور مرتب فرما دیا۔

(ج) بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری شدت کے ساتھ حدیث کو قلم بند کرنے سے روک دیا تھا۔

ذیل کے مضمون میں محولہ بالا حدیث کے صحیح مفہوم کو متعین کرتے ہوئے اس سلسلے کی غلط فہمیوں یا مغالطوں کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی تدوینِ سُنّت کی مختصر تاریخ بھی پیش کر دی گئی ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَکْتُبُوْا عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْاٰنِ وَ مَنْ کَتَبَ عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْاٰنِ فَلْیَمْحُهٗ۔

(باب التثبت فی الحدیث صحیح مسلم ص۴۱۴ ج۲)

حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھ سے سوائے قرآن کے اور کچھ نہ لکھو اور جس نے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو تو اسے مٹا دے۔

عام طور پر منکرینِ سُنّت اس حدیث کے صرف مذکورہ بالا الفاظ ہی بیان کرتے ہیں

پوری حدیث نقل نہیں کرتے۔ آخر یہ کونسی دیانت اور قرآنی اتباع ہے کہ ایک ہی روایت میں سے اپنے مطلب کے الفاظ لوگوں کے سامنے انتہائی زور شور سے پیش کئے جائیں اور باقی اجزاء کو نظر انداز کر دیا جائے۔

اسی روایت میں مزید یہ الفاظ بھی ملتے ہیں:۔

وَحَدِّثُوْا عَنِّیْ وَلَا حَرَجَ: وَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔

اور مجھ سے حدیث بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے۔

حدیث کے ان دونوں آخری جملوں سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ غیر قرآن کے لکھنے کی ممانعت اس بنا پر نہ تھی کہ دین میں حدیث کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ اگر یہی منشاء ہوتا تو آپ حدیثوں کے بیان کرنے کا حکم کیوں دیتے، اور جھوٹی من گھڑت حدیثوں کے نقل روایت پر وعید کیوں سناتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحیح روایات کے سنانے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے احادیث یاد کرنے والے اور دوسروں تک پہنچانے والے کیلئے دُعا فرمائی ہے۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَضَّرَ اللّٰہُ اِمْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَحَفِظَھَا وَوَعَاھَا وَاَدَّاھَا کَمَا سَمِعَھَا۔

(مشکوٰۃ ص۳۵ بحوالہ ابوداؤد ترمذی)

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ اُس بندے کو تر و تازہ اور خوش و خرم رکھے جس نے میری بات سنی اور اُسے خوب محفوظ رکھا اور دوسروں تک اُسے پہنچایا۔

یہ تاکید و ترغیب اسی لئے دی جا رہی ہے کہ سنت، اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے، اس کے بغیر قرآن کا فہم ہی ناممکن ہے۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے:۔

لَوْلَا السُّنَّۃُ مَا فَھِمَ اَحَدٌ مِّنَّا

اگر سنت نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی بھی

القرآن (قواعد التحدیث ص۲۱) قرآن کا فہم حاصل نہ کر سکتی[1]

سُنت کی تفصیلات کو قلم بند کرنے کا حکم نہ صرف یہ کہ حدیث سے ملتا ہے بلکہ خود قرآن بھی اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

قرآن اور کتابتِ حدیث

قرآن میں ارشاد ہے:

وَلَا تَسْئَمُوْا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا۔

یعنی قرض تھوڑا ہو یا زیادہ اس کے لکھنے میں سستی نہ کرو، اس کو مدت کے تعین کے ساتھ لکھو، یہ لکھنا خدا کے ہاں انصاف کی بات ہے، اور شہادت کو ٹھیک رکھنے والا ہے، اور یہ طرزِ عمل اس امر کے زیادہ قریب ہے۔ کہ تم شک و شبہ سے بالاتر رہو گے۔

امام ابو حنیفہؒ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

لما امر اللہ بکتابۃ الدین خوف الریب کان العلم الذی حفظہ اصعب من حفظ الدین احری ان یباح کتابتہ خوف الریب والشک فیہ۔ (شرح معانی الآثار للطحاوی ج ۲ ص۳۸۷)	جب اللہ تعالےٰ نے شک و شبہ سے بچنے کے لئے قرض کے لکھنے کا حکم دیا ہے تو علم (علمِ حدیث) کا یاد رکھنا قرض کے یاد رکھنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اسی بنا پر علم حدیث میں شک و شبہ سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کے لکھنے کی اجازت دینا زیادہ مناسب ہے۔

دوسرا استدلال

کتابت حدیث کے لئے علامہ ابوالملیح نے دوسری آیت سے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

---

[1] یہ قول خاص طور پر یہاں اس لئے نقل کیا گیا ہے کہ منکرین سنت امام ابوحنیفہ کو اپنے گروہ میں شمار کرتے ہیں (مقام حدیث شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام)

يعيبون علينا الكتاب وقد قال الله تعالیٰ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۳)

"لوگ ہم محدثین کو حدیث لکھنے کا طعنہ دیتے ہیں حالانکہ پہلی قوموں کا حال خود اللہ تعالیٰ کے پاس لکھا ہوا موجود ہے جس کی شان یہ ہے کہ نہ وہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔ تو انسان جو سراپا نسیان ہے آخر وہ کیسے کتابت (لکھنے سے) بے نیاز رہ سکتا ہے۔"

واضح رہے کہ محدثین میں کتابتِ حدیث کے بارے میں دو رائیں پائی جاتی تھیں،

۱ - صحابہ کا ایک گروہ اس کا قائل اور حامی تھا۔

۲ - بعض صحابہ اس بنا پر اس کے مخالف تھے کہ اس طرح اہل علم حافظہ سے کام لینے کے بجائے سارا اعتماد اپنے نوشتوں پر کریں گے۔ (مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۶۱)

لیکن بعد کے دور میں کتابت حدیث کے جواز پر اجماع ہو گیا (مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۶۱)

اس تصریح سے واضح ہو گیا کہ بعض اہل علم کے نزدیک سرمایہ سنت قلم بند کرنے سے اختلاف اس بنا پر نہ تھا کہ ان کے نزدیک حدیث شرعی حجت نہ تھی بلکہ اس کی اصل وجہ وہی ہے جس کی وضاحت سطور بالا میں کی گئی ہے۔

کتابتِ حدیث کی ممانعت کیوں؟

زیر تشریح حدیث میں غیر قرآن لکھنے کی ممانعت دائمی اور قیامت تک کے لئے نہیں تھی بلکہ یہ ایک وقتی اور ابتدائی دور میں حکم دیا گیا تھا تاکہ کہیں روایات اور قرآنی آیات کے اختلاط سے قرآن کی امتیازی شان ختم نہ ہو جائے۔

علماء حدیث نے اس روایت کا یہی مفہوم متعین کیا ہے۔

۱ - حافظ ابن حجر لکھتے ہیں النهي مقدم والاذن ناسخ له (فتح الباری ص ۱۰۶ پ ۱)

۲ - ابن الجوزی کا بیان ہے: نهی في اول الامر ثم اجاز الكتابة (رسالہ الناسخ والمنسوخ ص ۱۳۳)

۳ - ابن قتیبہؒ لکھتے ہیں: نھی فی اول الامر عن ان یکتب ثم رای ان یکتب ویقید - (تاویل مختلف الحدیث ص۳۶۵) ان سب عبارات کا ماحصل یہ ہے کہ آپ نے پہلے لکھنے کی ممانعت کی تھی بعد میں اس کی اجازت دیدی -

کتابتِ حدیث کی اجازت

کتابتِ حدیث کی اجازت پر مشتمل احادیث قولی بھی ہیں اور فعلی بھی - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مرض الموت کی حالت میں صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا تھا -

اِیْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ اَکْتُبُ لَکُمْ — میرے پاس لکھنے کا سامان لاؤ میں تمہیں کچھ لکھوادوں -
(صحیح بخاری مصری ص۳۹ ج۱)

ظاہر ہے کہ یہاں "کچھ لکھوادوں" سے مراد قرآن تو ہو نہیں سکتا، کیوں کہ قرآن کا نزول مکمل ہو چکا تھا اور آیت "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" نازل ہو چکی تھی - اس لئے قرآن کے سوا کچھ اور باتیں آپ لکھوانا چاہتے تھے -

اس موقع پر حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی منقول ہے "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ" "ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے"، منکرینِ سُنّت نے حضرت عمرؓ کے اس قول کو تو خوب اچھالا لیکن ارشادِ نبوی اِیْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ اَکْتُبُ لَکُمْ کو بالکل پی گئے، حالانکہ اس سے کتابت حدیث کا جواز واضح طور پر سامنے آجاتا ہے - (حضرت عمرؓ کے اس قول کا صحیح مطلب بعد میں عرض کیا جائے گا انشاء اللہ) ۔

کتابت حدیث کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی احادیث کی وضاحت سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منکرینِ سُنّت کے اس شبہ کو صاف کر دیا جائے کہ اگر حدیث شرعی حجّت ہوتی تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں اُسے کتابی شکل میں مدّون کروا دیتے -

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن کی کونسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چیز دین میں حجّت ہو اس کا کتابی شکل میں ہونا بھی ضروری ہے - یہ تو اسی قسم کا مطالبہ یا مغالطہ ہے جو قرآن کے مقابلہ میں قریشِ مکّہ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا - وہ کہا کرتے تھے:-

اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ (پ ۱۵ سورۂ بنی اسرائیل)	یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے پر یقین نہیں کریں گے تاوقتیکہ تو ہم پر ایسی کتاب اتار کر نہ لائے جسے خود ہم پڑھ سکیں۔

اسی طرح اہل کتاب نے مطالبہ کیا تھا:۔

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ	اہل کتاب سوال کرتے ہیں کہ آپ آسمان سے کتاب اتار کر لائیں۔

یعنی جب تک قرآن، کتابی شکل میں لکھا لکھایا ان کے سامنے نہ آجاتے وہ ایمان لانے کے لئے تیار نہ تھے۔ قرآن نے ان کے اس مطالبے کے جواب میں کہا۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ؕ (سورہ انعام پ ۷)	اور اگر ہم آپ پر کاغذ پر لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کر دیتے جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے مس بھی کر لیتے۔ تب بھی یہ لوگ کہتے کہ نہیں ہے یہ مگر کھلا ہوا جادو۔

قرآن نے ان کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے بجائے، قرآنی عظمت کی نشانی یہ قرار دی کہ وہ اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہے، بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۔(سورہ عنکبوت پ ۲۱) ٹھیک اسی طرح سنت کے ذخائر بھی شروع شروع سینوں میں محفوظ رہے اور پھر آہستہ آہستہ سفینوں میں منتقل ہوتے چلے گئے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سنت نام ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر[1] کا، اور آپ کے قول، فعل اور تقریر کا سلسلہ آپ کی زندگی کے آخری سانس تک جاری رہا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ سنت کا سارا ذخیرہ آپ کی زندگی ہی میں

---

[1] تقریر کے معنی ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی کام کیا گیا ہو اور اس پر آپ نے انکار نہ فرمایا ہو۔

کتابی شکل میں مدّون ہوجاتا۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ سُنّت رسولؐ کے حافظ عہد نبویؐ ہی میں مختلف علاقوں میں منتشر ہوگئے تھے۔ ان کو یکجا کئے بغیر کسی وسیع اور جامع مجموعۂ حدیث کی تدوین کیسے ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اُن حالات میں اس قسم کا اہتمام قطعاً ناممکن تھا۔ پھر یہاں یہ بات بھی مخفی نہ رہے کہ سنّت کے وسیع سرمایہ کو قلم بند کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ بہت سے کاتبوں کو یکجا کیا جائے اور ان کو دوسرے کاموں سے فارغ کرکے صرف اسی کام پر لگا دیا جائے۔ یہ شکل بھی اس وقت ناممکن تھی، مسلمانوں میں کاتبین کی تعداد انتہائی قلیل تھی۔ اسی بنا پر آپؐ نے بدر کے قیدیوں کی رہائی کے لئے کتابت کی تعلیم کو زرِ فدیہ کے ہم پلہ قرار دے دیا تھا۔ (مسند احمد ج ۱ ص ۲۴۶) ویسے عقلی طور پر بھی یہ اعتراض غلط ہے کہ چونکہ عہد نبویؐ میں حدیثیں کتابی شکل میں مدّون نہیں ہوئی تھیں اس لئے ان کو حجّت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

آج کے "ترقی یافتہ" دَور میں بھی متعدد ملکوں کا کاروبارِ مملکت غیر مدوّن دساتیر پر چل رہا ہے۔ اس کی واضح مثال انگلستان کا روایاتی، غیر تحریری دستور ہے۔ مذکورہ بالا تمام مشکلات اور مجبوریوں کے باوجود سنت کا ایک بہت بڑا ذخیرہ عہد صحابہؓ میں قلم بند کر لیا گیا تھا۔ اس بارے میں مستند اور قابلِ اعتماد شواہد و نظائر ملتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا انتہائی غلط ہے، کہ سنت کی کتابت و تدوین کا آغاز دوسری یا تیسری صدی ہجری میں ہوا۔

سُنّت کا تحریری سرمایہ

گزشتہ صفحات میں حدیث لَا تَكْتُبُوْا عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْآنِ کی وضاحت کی گئی تھی، ذیل کے صفحات میں حدیث کے جمع و ترتیب کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ احادیثِ نبوی ؐ کے گرانقدر ذخائر تیرہ سو سال کے عرصہ میں کن کن مراحل کو طے کرتے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں اور وہ کون کون سے پاکباز نفوس تھے جنہوں نے حکمت و ہدایت کے ان بیش بہا خزانوں کو آئندہ نسلوں تک محفوظ شکل میں منتقل کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور اگر موقع آیا تو اس راہ میں جان کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہ کیا

احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک تین قابلِ اعتماد ذرائع سے پہنچی ہیں۔

۱ - تعاملِ اُمّت

۲ - تحریری یادداشتیں اور صحیفے ۔

۳ - حافظہ کی مدد سے روایت یعنی سلسلۂ درس و تدریس ۔

اس لحاظ سے جمع و ترتیب اور تصنیف و تالیف کے پورے زمانے کو چار اَدوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

پہلا دَور

عہدِ نبوی ؐ سے پہلی صدی ہجری کے خاتمہ تک ۔

اس دَور کے جامعینِ حدیث اور قلم بند کی ہوئی یادداشتوں اور مجموعوں کی تفصیل یہ ہے :-

مشہور حافظینِ حدیث

۱ - حضرت ابو ہریرہؓ (عبدالرحمٰن)، وفات ۵۹ھ ہجری بعمر ۷۸ سال تعداد روایات ۵۳۷۴، ان کے شاگردوں کی تعداد ۸۰۰ تک پہنچتی ہے۔

۲ - حضرت عبداللہ بن عباسؓ، وفات ۶۸ھ بعمر ۷۱ سال تعداد روایات (۲۶۶۰)

۳ - حضرت عائشہ صدیقہؓ، وفات ۵۸ھ بعمر ۶۷ سال تعداد روایات (۲۲۱۰)

۴ - حضرت عبداللہ بن عمرؓ وفات ۷۳ھ بعمر ۸۴ سال تعداد روایات (۱۶۳۰)

۵ - حضرت جابر بن عبداللہؓ وفات ۷۸ھ بعمر ۹۴ سال تعداد روایات (۱۵۶۰)

۶ - حضرت انس بن مالکؓ وفات ۹۳ھ بعمر ۱۰۳ سال تعداد روایات (۱۲۸۶)

۷ - حضرت ابو سعید خدریؓ وفات ۷۴ھ بعمر ۸۴ سال تعداد روایات (۱۱۷۰)

یہ وہ جلیل القدر صحابہؓ ہیں جن کو ہزار سے زیادہ احادیث حفظ تھیں - ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص وفات ۶۳ھ - حضرت علیؓ وفات ۴۰ھ - حضرت عمرؓ وفات ۲۳ھ کا شمار اُن صحابہ میں ہوتا ہے جن کی روایات کی تعداد پانچسو اور ہزار کے درمیان ہے -

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ وفات ۱۳ھ - حضرت عثمانؓ وفات ۳۶ھ حضرت امّ سلمہؓ وفات ۵۹ھ - حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ وفات ۵۲ھ حضرت ابو ذر غفاریؓ وفات ۳۲ھ - حضرت ابو ایوب انصاریؓ وفات ۵۱ھ حضرت ابی بن کعبؓ وفات ۱۹ھ اور حضرت معاذ بن جبلؓ وفات ۱۸ھ سے سو سے زیادہ اور پانچسو سے کم روایات منقول ہیں -

ان کے ماسوا اس دور کے اُن کبار تابعین کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا جن کی سرفروشانہ اور پُر خلوص کوششوں کی بدولت سنت کے خزانوں سے اُمّتِ محمدیہ قیامت تک مالامال ہوتی رہے گی -

چند بزرگوں کا تعارف درج ذیل ہے :-

۱ - سعید بن مسیبؒ - عہد فاروقی کے دوسرے سال مدینہ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۱۰۵ھ میں وفات پائی -

حضرت عثمانؓ - حضرت عائشہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ سے انہوں نے

علم حدیث حاصل کیا۔

۲۔ عروہ بن زبیرؓ آپ کا شمار مدینہ کے ممتاز اہلِ علم میں ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے خواہر زادے ہیں۔ زیادہ تر انہوں نے اپنی خالہ محترمہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ نیز حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے بھی شرفِ تلمّذ حاصل ہے۔ صالح بن کیسان اور امام زہریؒ جیسے اہل علم ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ آپ کی وفات ۹۴ھ میں ہوئی۔

۳۔ سالم بن عبداللہ بن عمرؓ مدینہ کے سات فقہاء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے والد محترم اور دوسرے صحابہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ نافع، زہری اور دوسرے مشہور تابعین آپ کے شاگرد ہیں۔ ۱۰۶ھ میں رحلت فرمائی۔

۴۔ نافع مولیٰ عبداللہ بن عمرؓ، یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے خاص شاگرد اور امام مالکؒ کے اُستاد ہیں۔ محدثین کے نزدیک یہ سند (مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمرؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، سلسلۃ الذہب (طلائی زنجیر) شمار ہوتی ہے۔ ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔

دَورِ اوّل کا تحریری سرمایہ

۱۔ صحیفہ صادقہ۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (وفات ۶۳ھ بعمر ۷۷ سال) کا مرتب کیا ہوا ہے۔
آپ کو تصنیف و تالیف کا خاص ذوق تھا۔ یہ جو کچھ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کرتے اُسے قلم بند کر لیا کرتے تھے، اس بارے میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دی ہوئی تھی[۱] یہ مجموعہ تقریباً ایک ہزار احادیث پر مشتمل تھا عرصہ تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا۔ اب یہ مسند امام احمدؒ میں بہ تمام و کمال مل سکتا ہے۔

۲۔ **صحیفہ صحیحہ**۔ مرتبہ ہمام بن مُنبہ، وفات ۱۰۱ھ۔ یہ حضرت ابوہریرہؓ کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے استاذِ محترم کی روایات کو یک جا قلم بند کر لیا تھا۔ اس کے قلمی نسخے برلن اور دمشق کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ نیز امام احمد بن

---

[۱] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۶، ۳۷

حنبل رح نے اپنی مشہور مسند میں ابوہریرہ رضہ کے زیر عنوان یہ پورا صحیفہ بجنسہ سمو دیا ہے [1]
(ملاحظہ ہو مسند احمد ج ۲ ص ۳۱۲ تا ۳۱۸)

یہ مجموعہ کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی کوششوں سے طبع ہو کر حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں ۱۳۸ روایات ہیں۔ واضح رہے کہ صحیفہ صحیحہ کے قلمی نسخے اور امام احمد بن حنبل کی روایت کردہ احادیث دونوں کے الفاظ اگرچہ یکساں ہیں لیکن سلسلۂ اسناد مختلف ہے۔ راویوں کے اختلاف کے باوجود متن حدیث میں اختلاف نہ ہونا اس امر کی واضح شہادت ہے کہ محدثین نے کتنی محنت و جانفشانی سے علم حدیث کی حفاظت کی ہے۔

۳۔ حضرت ابوہریرہ رضہ کے دوسرے شاگرد بشیر بن نہیک نے بھی ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جس کی انہوں نے رخصت ہوتے وقت حضرت ابوہریرہ رضہ کو سنا کر تصدیق کرائی تھی [2]

۴۔ مسند ابوہریرہ رضہ۔ اس کے نسخے عہد صحابہ ہی میں لکھے گئے تھے۔ اس کی ایک نقل حضرت عمر بن عبدالعزیز کے والد عبدالعزیز بن مروان گورنر مصر وفات ۸۶ھ کے پاس بھی تھی۔

انہوں نے کثیر بن مرہ کو لکھا تھا کہ تمہارے پاس صحابہ کرام رضہ کی جو حدیثیں ہوں ان کو لکھ کر بھیج دو۔ لیکن حضرت ابوہریرہ رضہ کی روایات بھیجنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ ہمارے پاس موجود ہیں [3]

مسند ابوہریرہ رضہ کا ایک نسخہ امام ابن تیمیہ رح کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانے میں موجود ہے [4]

۵۔ صحیفہ [5] حضرت علی رضہ، امام بخاری رح کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ کافی ضخیم تھا۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، دیباچہ صحیفہ ہمام مرتبہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب۔

[2] جامع العلم۔ ج ۱ ص ۷۲۔ تہذیب التہذیب ج ۱۔ ص ۴۷۰

[3] دیباچہ صحیفہ ہمام ص ۵۰ بحوالہ طبقات ابن سعد ج ۷۔ ص ۱۵۷

[4] مقدمہ تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی۔ ص ۱۶۵۔

[5] صحیح بخاری۔ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ ج ۱ ص ۱۵۴

اس میں زکواۃ، حرمت مدینہ، خطبہ حجۃ الوداع اور اسلامی دستور کے نکات درج تھے۔

۶۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تحریری خطبہ۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوشاہ یمنی کی درخواست پر اپنا مفصل خطبہ قلم بند کرنے کا حکم دیا تھا [۱]۔ یہ خطبہ حقوقِ انسانی کی اہم تفصیلات پر مشتمل ہے۔

۷۔ صحیفہ حضرت جابرؓ۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی روایات کو اُن کے تلامذہ وہب بن منبہ وفات ۱۱۰ھ اور سلیمانؒ بن قیس یشکری ف ۲۵۰ھ نے تحریری طور پر مرتب کر لیا تھا۔ یہ مجموعہ مناسک حج و خطبہ حجۃ الوداع پر مشتمل تھا۔

۸۔ روایات حضرت عائشہ صدیقہؓ۔ حضرت عائشہؓ کی احادیث ان کے شاگرد عروہ بن زبیرؓ نے قلم بند کر لی تھیں [۲]۔

۹۔ احادیث ابن عباسؓ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایات کے متعدد مجموعے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر تابعی بھی ان کی روایات تحریری طور پر مرتب کرتے تھے۔

۱۰۔ انس بن مالکؓ کے صحیفے۔ سعید بن ہلال کہتے ہیں کہ حضرت انس اپنی قلمی یادداشتیں نکال کر ہمیں دکھاتے اور فرماتے یہ روایات میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں اور قلم بند کرانے کے بعد آپ کو سنا کر تصدیق بھی کرا لی ہے [۳]۔

۱۱۔ عمرو بن حزم۔ جن کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تحریری ہدایت نامہ دیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس ہدایت نامہ کو محفوظ رکھا بلکہ اس کے ساتھ اکیس دوسرے فرامین نبویؐ بھی شامل کر کے ایک اچھی خاصی کتاب مرتب کر لی [۴]۔

۱۲۔ رسالہ سمرہ بن جندب۔ یہ ان کے صاحبزادے کو وراثت میں ملا۔ یہ روایات

---

[۱] صحیح بخاری، مطبوعہ احمدی ج ۱ ص ۲۲ مختصر جامع العلم ص ۳۶ صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۳۹

[۲] تہذیب التہذیب ج ۴۔ ص ۲۱۵

[۳] تہذیب التہذیب ج ۷۔ ص ۱۸۳

[۴] دیباچہ صحیفہ ہمام، ص ۳۴۔ بحوالہ خطیب البغدادی۔ نیز مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۷۴

[۵] الوثائق السیاسیہ۔ ص ۱۰۵۔ از ڈاکٹر حمید اللہ بحوالہ طبری ص ۱۰۴ ج ...

کے ایک بہت بڑے ذخیرے پر مشتمل تھا [1]

۱۳ - صحیفہ سعد بن عبادہ - حضرت سعدؓ بن عبادہ صحابی، دورِ جاہلیت سے ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے ۔

۱۴ - مکتوبات حضرت نافعؒ - سلیمان بن موسیٰ کی روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر املا کرا رہے تھے اور نافع لکھتے جاتے تھے - (دارمی ص ۶۹ نیز دیباچہ صحیفہ ہمام ص ۵۰ بحوالہ طبقات ابن سعد)۔

۱۵ - محسن سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعودؓ نے میرے سامنے کتاب نکالی اور حلف اٹھاتے ہوئے کہا کہ یہ میرے والد عبداللہ بن مسعودؓ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے [2] - اگر تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری رہے تو ان کے علاوہ بہت سی مزید مثالیں اور واقعات مل سکتے ہیں ۔

اسی دَور میں صحابہ کرامؓ اور کبار تابعین نے زیادہ تر اپنی ذاتی یادداشتوں کو قلم بند کرنے پر توجہ دی، لیکن دوسرے دور میں جمع و تدوین کا کام مزید وسعت اختیار کر گیا ۔ جامعین حدیث نے اپنی ذاتی معلومات کے ساتھ ساتھ اپنے شہر یا علاقہ کے اہلِ علم سے مل کر ان کی روایات بھی منضبط کر لیں - اس دور کو دورِ کتابتِ حدیث کہا جا سکتا ہے۔

دوسرا دَور

یہ دوسرا دور تقریباً دوسری صدی ہجری کے نصف پر منتہی ہوتا ہے - اس دور میں تابعین کی ایک بڑی جماعت تیار ہو گئی جس نے دورِ اوّل کے تحریری سرمایہ کو وسیع تر تالیفات میں سمیٹ لیا -

جامعین حدیث

۱ - محمد بن شہاب زہری - وفات ۱۲۴ھ - یہ اپنے زمانے کے ممتاز محدثین میں شمار ہوتے ہیں - آپ نے علمِ حدیث مندرجہ ذیل جلیل القدر شخصیتوں سے حاصل

---

[1] تہذیب التہذیب - ابن حجرؒ ج ۴ - ص ۲۳۶

[2] مختصر جامع العلم - ص ۳۷ -

کیا ہے ۔

صحابہ میں سے (۱) عبداللہ بن عمرؓ (۲)، انسؓ بن مالک (۳)، سہلؓ بن سعد اور تابعین میں سے سعید بن مسیّب، محمود بن ربیع وغیرہ ۔

آپ کے تلامذہ میں امام اوزاعی، امام مالک اور سفیان بن عیینہ جیسے ائمہ حدیث کا شمار ہوتا ہے ان کو حضرت عمر بن عبد العزیز نے ۱۰۱ھ میں احادیث جمع کرنے کا حکم دیا تھا ان کے علاوہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے مدینہ کے گورنر ابو بکر محمد بن عمر بن حزم کو ہدایت بھیجی تھی کہ عمرہ بنت عبد الرحمٰن اور قاسم بن محمد کے پاس جو احادیث کا ذخیرہ ہے اسے قلم بند کر لیں۔ یہ عمرہ، حضرت عائشہؓ کی خاص شاگردوں میں سے ہیں اور قاسم بن محمد ان کے برادر زادے ہیں ۔ حضرت عائشہؓ نے اپنی نگرانی میں ان کی تربیت و تعلیم کا اہتمام کیا تھا۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے مملکتِ اسلامی کے تمام ذمہ داروں کو ذخائرِ حدیث کے جمع و تدوین کرنے کا تاکیدی فرمان جاری کر دیا تھا ۔ جس کے نتیجہ میں احادیث کے دفتر کے دفتر دار الخلافہ دمشق پہنچ گئے ۔ خلیفۂ وقت نے ان کی نقلیں مملکت کے گوشے گوشے میں پھیلا دیں [۲]

امام زہری کے مجموعہ حدیث مرتب کرنے کے بعد اس دور کے دوسرے اہلِ علم نے بھی تدوین و تالیف کا کام شروع کر دیا ۔

عبد الملک بن جریج (۱۵۰ھ) نے مکہ میں امام اوزاعی (ف ۱۵۷ھ)، نے شام میں معمر بن راشد (ف ۱۵۳ھ) نے یمن میں، امام سفیان ثوری (ف ۱۶۱ھ) نے کوفہ میں امام حماد بن سلمہ (ف ۱۶۷ھ) نے بصرہ میں اور امام عبد اللہ بن المبارک ۱۸۱ھ نے خراساں میں احادیث کے جمع و تدوین کے کام میں سبقت کا شرف حاصل کیا ۔

۸ ۔ امام مالک بن انس ولادت ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ ۔ امام زہری کے بعد مدینہ میں حدیثِ نبویؐ کی تدوین کا شرف آپ ہی کو حاصل ہوا ہے، آپ نے نافع، زہری اور دوسرے ممتاز اہل علم سے استفادہ کیا، آپ کے اساتذہ کی تعداد نو سو تک پہنچتی ہے۔ آپ کے چشمۂ فیض سے براہ راست حجاز، شام، عراق، فلسطین، مصر، افریقہ اور اندلس

---

[۱] تہذیب التہذیب ابن حجر ۔ ج ۷ ۔ ص ۱۷۲

[۲] تذکرہ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۶ مختصر جامع العلم ص ۳۸

کے ہزاروں تشنگانِ سُنت سیراب ہوئے۔ آپ کے تلامذہ میں لیث بن سعد (ف ۱۷۵ھ)، ابن مبارک (ف ۱۸۱ھ) امام شافعی (ف ۲۰۴ھ) امام محمد بن حسن الشیبانیؒ (ف ۱۸۹ھ) جیسے مشاہیر شامل ہیں۔

اس دور میں حدیث کے بہت سے مجموعے مرتب ہوئے جنہیں امام مالکؒ کی مؤطا کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس کا زمانہ تالیف ۱۳۰ھ اور ۱۴۱ھ کے درمیان ہے۔ کل روایات کی تعداد ایک ہزار سات سو بیس ہے، جن میں سے مرفوع ۶۰۰ مرسل ۲۲۲، موقوف ۶۱۷، اور اقوالِ تابعین ۲۷۵ ہیں۔ اس دور کو دورِ تدوینِ حدیث کہا جا سکتا ہے۔ اس دور کی چند دوسری تالیفات کے نام یہ ہیں:۔

جامع سفیان ثوری (ف ۱۶۱ھ)، جامع ابن المبارک (ف ۱۸۱ھ)، جامع امام اوزاعی (ف ۱۵۷ھ)، جامع ابن جریج (ف ۱۵۰ھ) کتاب الخراج۔ قاضی ابو یوسف (ف ۱۸۲ھ) کتاب الآثار امام محمد (ف ۱۸۹ھ)۔ اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث آثارِ صحابہ اور فتاویٰ تابعین کو ایک ہی مجموعہ میں مرتب کر لیا جاتا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی وضاحت ہو جاتی تھی کہ یہ صحابی یا تابعی کا قول ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث۔

تیسرا دَور

یہ دور تقریباً دوسری صدی ہجری کے نصف آخر سے چوتھی صدی ہجری کے خاتمہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور کی خصوصیات یہ ہیں:۔

۱۔ احادیث نبویؐ کو آثارِ صحابہ اور اقوالِ تابعین سے الگ کر کے مرتب کیا گیا۔

۲۔ قابلِ اعتماد روایات کے علیحدہ مجموعے تیار کئے گئے اور اس طرح چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد دوسرے دور کی تصانیف تیسرے دور کی ضخیم کتابوں میں سما گئیں۔ اس دور کو دَورِ تبویب و تنقیح کہا جا سکتا ہے۔

اس دَور میں نہ صرف یہ کہ روایات جمع کی گئیں بلکہ علم حدیث کی حفاظت کے لئے محدثین کرام نے ۹۰ سے زیادہ علوم کی بنیاد ڈالی۔ جن پر اب تک ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ شکر اللہ سعیھم وجزاھم عنا احسن الجزاء۔

مختصر طور پر چند علوم کا تعارف یہاں کرایا جاتا ہے۔

۱ - علم اسماء الرجال - اس علم میں راویوں کے حالات، پیدائش، وفات، اساتذہ تلامذہ کی تفصیل، طلب علم کے لئے سفر اور ثقہ، غیر ثقہ ہونے کے بارے میں ماہرین علم حدیث کے فیصلے درج ہیں - یہ علم بہت ہی وسیع، مفید اور دلچسپ ہے -
بعض متعصب مستشرقین بھی یہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے کہ اس فن کی بدولت پانچ لاکھ راویوں کے حالات محفوظ ہو گئے - یہ وہ خصوصیت ہے جس میں مسلمان قوم کی نظیر ملنا مشکل ہے[۱]

اس علم میں سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں - چند کے نام یہ ہیں :
۱ - (ا) تہذیب الکمال : مؤلفہ امام یوسف مزی (وفات ۷۴۲ھ) اس علم میں یہ سب سے زیادہ اہم اور مستند کتاب ہے - یہ کتاب زیر طبع ہے اب تک ۷ یا ۸ اجزاء شائع ہو چکے ہیں اس کا مخطوطہ (قلمی نسخہ مسودہ) بھی مکہ مکرمہ میں فروخت ہوتا رہا ہے - نیز یہ بھی واضح رہے کہ تہذیب الکمال کی اصل "الکمال" ہے - مصنفہ عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسی ف ۶۰۰ھ یہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکی ہے -
(ب) تہذیب التہذیب، مؤلفہ حافظ ابن حجرؒ شارح بخاری - یہ بارہ جلدوں میں ہے - حیدر آباد دکن سے شائع ہو چکی ہے -
(ج) تقریب التہذیب دو جلدوں میں ہے - مؤلفہ حافظ ابن حجرؒ
(د) تذکرۃ الحفاظ - مرتبہ علامہ ذہبیؒ (وفات ۷۴۸ھ) میزان الاعتدال ذہبی ۴ جلدوں میں -

۲ - علم مصطلح الحدیث (اصول حدیث) اس علم کی روشنی میں حدیث کی صحت و ضعف کے قواعد و ضوابط معلوم ہوتے ہیں -
اس علم کی مشہور کتاب علوم الحدیث معروف بہ مقدمہ ابن الصلاح ہے - مؤلفہ ابو عمر عثمان ابن الصلاح (وفات ۶۴۳ھ) اس فن میں حسب ذیل تالیفات قابل ذکر ہیں
۱ علوم الحدیث از حاکمؒ ف ۴۰۵ھ ۲ الکفایہ فی علوم الروایہ از خطیب بغدادیؒ ف ۴۶۳ھ
۳ تدریب الراوی للسیوطیؒ ۹۱۱ھ، ۴ فتح المغیث للسخاویؒ ۹۰۲ھ

---

[۱] مقدمہ الاصابہ انگریزی شائع شدہ ۱۸۶۴ء از کلکتہ مرتبہ مستشرق اسپرنگر -

۵۔ توضیح الافکار مؤلفہ محمد بن اسماعیل الصنعانی ف ۱۱۸۲ھ

ماضی قریب میں اصول حدیث پر چند کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

(الف) توجیہ النظر، مؤلفہ علامہ طاہر بن صالح الجزائری (ف ۱۳۳۸ھ)

(ب) قواعد التحدیث۔ مرتبہ علامہ سید جمال الدین قاسمی (وفات ۱۳۳۲ھ)،

اوّل الذکر وسعتِ معلومات اور آخر الذکر حسن ترتیب میں ممتاز ہیں۔

ج۔ علوم الحدیث مؤلفہ ڈاکٹر صبحی الصالح

د۔ اصول الحدیث مؤلفہ ڈاکٹر محمد عجاج الخطیب

۳۔ **علم غریب الحدیث:** اس علم میں احادیث کے مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق کی گئی ہے۔ اس علم میں علامہ زمخشری (وفات ۵۳۸ھ) کی الفائق اور ابن الاثیر (ف ۶۰۶ھ) کی نہایہ مشہور ہیں۔ نیز مجمع البحار مؤلفہ محمد طاہر بن علی الھندی بھی مفید ہے۔

۴۔ **علم تخریج الاحادیث:** اس علم کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے کہ مشہور کتب تفسیر، فقہ، تصوف اور عقائد میں جو روایات درج ہیں ان کا اصل ماخذ اور سرچشمہ کیا ہے۔ مثلاً ہدایہ از برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی (ف ۵۹۲ھ) اور احیاء العلوم (امام غزالیؒ وفات ۵۰۵ھ) میں بہت سی روایات بلا سند اور بلا حوالہ مذکور ہیں۔ اب اگر کسی کو یہ معلوم کرنا ہو کہ یہ روایات کس پایہ کی ہیں اور کون کونسی حدیث کی اہم کتابوں میں ان کا ذکر ہے تو اوّل الذکر کے لئے حافظ زیلعی وفات ۷۶۲ھ کی نصب الرایہ اور حافظ ابن حجر عسقلانی وفات ۸۵۲ھ کی الدرایہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے اور آخر الذکر کے لئے حافظ زین الدین عراقی (ف ۸۰۶ھ) کی تالیف المغنی عن حمل الاسفار موزوں رہے گی۔

۵۔ **علم الاحادیث الموضوعۃ۔** اس فن میں اہل علم نے مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ موضوع (من گھڑت) روایات کو الگ چھانٹ دیا ہے۔ اس بارے میں قاضی شوکانی (ف ۱۲۵۵ھ) کی الفوائد المجموعہ اور حافظ جلال الدین سیوطی (ف ۹۱۱ھ) کی اللآلی المصنوعہ و تحذیر الخواص من اکاذیب القصاص، مزید مفید تالیفات یہ ہیں۔ (۴) کتاب الموضوعات ابن الجوزی ف ۵۹۷ھ، ۵۔ تنزیہ الشریعہ المرفوعہ عن الاخبار الشنیعہ الموضوعہ، مؤلفہ ابن عراق الکنانی ف ۹۶۳ھ، ۶۔ المصنوع فی الحدیث الموضوع مؤلفہ

ملا علی القاری ف ۱۰۱۴ھ ، ۷ - الاحادیث الضعیفۃ مؤلفہ الشیخ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ تعالیٰ -

(۸) تذکرۃ الموضوعات از محمد طاہر بن علی الہندی ف ۹۸۶ھ ، زیادہ نمایاں ہیں -

۶ - علم الناسخ والمنسوخ - اس فن میں امام محمد بن موسیٰ حازمی (ف ۵۸۴ھ بعمر ۳۵ سال) کی تصنیف کتاب الاعتبار زیادہ مستند اور مشہور ہے -

۷ - علم التوفیق بین الاحادیث - اس علم میں ان روایات کی صحیح توجیہ بیان کی گئی ہے جن میں بظاہر تعارض اور ٹکراؤ معلوم ہوتا ہے - سب سے پہلے امام شافعی (ف ۲۰۴ھ) نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے - ان کا رسالہ مختلف الحدیث کے نام سے مشہور ہے - امام طحاوی (ف ۳۲۱ھ) کی مشکل الآثار بھی اس فن کی مفید کتاب ہے - نیز مختلف الحدیث (ابن قتیبہ ف ۲۷۶ھ)

۸ - علم المختلف والمؤتلف - اس علم میں خاص طور پر ان راویوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے اپنے نام، کنیت، لقب، آباء و اجداد کے نام یا اساتذہ کے نام ملتے جلتے ہیں اور اس اشتباہ کی بنا پر ایک ناواقف انسان مغالطہ میں مبتلا ہو سکتا ہے - اس فن میں حافظ ابن حجر کی تبصیر المنتبہ زیادہ جامع کتاب ہے -

۹ - علم اطراف الحدیث - اس علم کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں روایت کس کتاب میں ہے اور اس کے راوی کون کون سے ہیں مثلاً آپ کو "انما الاعمال بالنیات" حدیث کا ایک جملہ یاد ہے - آپ چاہتے ہیں کہ اس کے تمام ماخذ روایت کے پورے الفاظ اور راوی معلوم ہو جائیں تو آپ کو اس علم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے - اس عنوان پر حافظ مزی (ف ۷۴۲ھ) کی کتاب تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف زیادہ مفصل ہے - اس میں صحاح ستہ کی روایات کی پوری فہرست آگئی ہے - اس کتاب کی ترتیب میں حافظ یوسف مزی کے ۲۶ سال صرف ہوئے ہیں - انتہائی محنت شاقہ کے بعد یہ کتاب مکمل ہوئی ہے - اس اہم کتاب کو ۱۳ جلدوں میں مولانا عبدالصمد صاحب الکلبنی نے بمبئی سے شائع کیا ہے -

آج کے مستشرقین نے ایسی ہی کتابوں سے خوشہ چینی کر کے ذرا نئے ڈھب سے احادیث کی فہرست مرتب کی ہے - مثلاً مفتاح کنوز السنۃ انگریزی میں شائع ہوئی تھی جس کا عربی میں ترجمہ ۱۹۳۴ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے اور اب ایک وسیع فہرست المعجم المفہرس

کے نام سے ترتیب پاچکی ہے۔ جو سات ضخیم جلدوں میں مکمل ہو چکی ہے اس میں کتب ستہ کے علاوہ موطا امام مالکؒ سنن دارمیؒ اور مسند امام احمد کی احادیث کی نشان رہی بھی کی گئی ہے۔ نیز ذخائر المواریث، مؤلفہ نابلسی اس کی دو جلدیں ہیں اس کی پہلی جلد پر تحقیقی کام عزیزی راغب حسن سلمہٗ کے ہاتھوں مکمل ہو چکا ہے۔

۱۰۔ **فقہ الحدیث** ۔ اس علم میں احکام پر مشتمل احادیث کے اسرار اور حکمتیں بے نقاب کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر حافظ ابن قیم (ف ۷۵۱ھ) کی کتاب اعلام الموقعین اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی حجۃ اللہ البالغہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ انکے علاوہ اہلِ علم نے زندگی کے مختلف مسائل پر الگ الگ تصانیف بھی مرتب کی ہیں۔ مثلاً مالی معاملات میں ابوعبیدہ قاسم بن سلام (ف ۲۲۴ھ) کی تالیف کتاب الاموال مشہور ہے اور زمین کے مسائل عشر و خراج وغیرہ پر قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج بہترین تصنیف ہے۔ نیز سنت کے ماخذ شریعت ہونے اور منکرین حدیث کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تصنیفات کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے۔

کتاب الام جلد ۷۔ الرسالہ امام شافعیؒ۔ الموافقات جلد چہارم مؤلفہ ابواسحاق شاطبیؒ (ف ۷۹۰ھ)، صواعق مرسلہ ج ۲۔ ابن قیمؒ۔ الاحکام لابن حزمؒ الاندلسی۔ (ف ۴۵۶)، مقدمہ ترجمان السنہ اردو از مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، اثبات الخبر۔ مؤلفہ والد محترم مولانا حافظ عبدالستار حسن عمرپوریؒ: (وفات ۱۹۱۶ء بمطابق ۱۳۳۴ھ بعمر ۴۳ سال، سنت کی آئینی حیثیت، مرتبہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔

نیز "انکارِ حدیث کا منظر اور پس منظر" کے نام سے جناب افتخار احمد بلخیؒ کی تصنیف بھی دلچسپ اور معلومات افزا ہے اس کے تین حصے شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل علامہ مصطفیٰ سباعیؒ نے احادیث کے حجت ہونے پر رسالہ المسلمون (دمشق) میں نہایت ہی مفید سلسلہ مضامین شائع کیا تھا، جس کا اردو ترجمہ محترم ملک غلام علی صاحب نے کیا ہے "سنت رسول ﷺ" کے نام سے یہ کتابچہ شائع ہو چکا ہے۔

تاریخ علمِ حدیث اور متعلقہ مباحث پر مندرجہ ذیل تصانیف اپنے اندر جامعیت اور افادیت کا پہلو رکھتی ہیں۔ مقدمہ فتح الباری، حافظ ابن حجرؒ جامع بیان العلم وفضلہ از حافظ ابن

عبدالبر اندلسی (ف ۴۶۳ھ) معرفۃ علوم الحدیث امام حاکم (ف ۴۰۵ھ) مقدمہ تحفۃ الاحوذی، مؤلفہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث مبارک پوری (ف ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۵ء ماضی قریب کی تصانیف میں یہ کتاب اپنی جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے ایک شاہکار ہے۔ اسی طرح مقدمہ فتح الملہم مرتبہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور اردو میں تدوین حدیث مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم، وسیع معلومات کا گنجینہ ہیں۔

تیسرے دور کے جامعین حدیث

اس دور کے ممتاز اور مشہور جامعین حدیث اور مستند تالیفات کا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے۔

۱۔ امام احمد بن حنبلؒ (ولادت ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ) آپ کی اہم تالیف، مسند احمد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تیس ہزار روایات پر مشتمل ہے اس کی ۲۴ جلدیں ہیں۔ قابل ذکر احادیث سب اس میں آگئی ہیں۔ اس میں عنوان کے لحاظ سے ترتیب کی بجائے ہر صحابی کی تمام روایات یکجا مرتب کر دی گئی ہیں۔ اس کتاب کی بتویب یعنی عنوان وار ترتیب حسن البنا شہیدؒ کے والد محترم احمد عبدالرحمٰن ساعاتی (ف ۱۳۷۸ھ) نے شروع کی تھی۔ یہ کتاب مکمل شکل میں ۲۴ جلدوں میں دستیاب ہو سکتی ہے اس کا نام ہے الفتح الربانی۔

۲۔ امام محمد بن اسماعیلؒ البخاریؒ ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ آپ کی تاریخ ولادت "صدق" اور تاریخ وفات "نور" نکلتی ہے۔ امام بخاریؒ کی تصانیف میں سے سب سے زیادہ اہم اور مستند کتاب صحیح بخاری ہے جس کا پورا نام یہ ہے "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وایامہ"

اس کتاب کی تالیف میں ۱۶ سال صرف ہوئے۔ آپ سے براہ راست صحیح بخاری پڑھنے والے تلامذہ کی تعداد نوے ہزار تک پہنچتی ہے۔ بعض دفعہ ایک ہی مجلس میں حاضرین کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ اس قسم کے اجتماعات میں املا کرانے والوں کا شمار ۳۰۰ سے متجاوز ہو جاتا تھا۔ کل تعداد روایات مع تعلیقات ۹۰۸۲۔ مرفوع مسند روایات ۷۲۷۵۔ غیر مکرر روایات ۴۰۰۰ امام بخاری نے دوسرے محدثین کی بہ نسبت راویوں کے پرکھنے کا معیار زیادہ بلند رکھا ہے۔

۳ - امام مسلم بن حجاج قشیری (ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۶۱ھ) امام بخاری، امام احمد بن حنبل ان کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ اور امام ترمذی، ابوحاتم رازی، ابوبکر بن خزیمہ کا شمار ان کے تلامذہ میں ہوتا ہے۔

ان کی کتاب صحیح مسلم حُسنِ ترتیب کے لحاظ سے زیادہ ممتاز مانی جاتی ہے۔

۴ - امام ابوداؤد اشعث بن سلیمان سجستانی ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۵ھ ان کی اہم تالیف سنن ابوداؤد کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں زیادہ تر احکام پر مشتمل روایات کو پوری جامعیت کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ فقہی اور قانونی مسائل کا یہ بہترین ماخذ ہے۔ یہ چار ہزار آٹھ سو احادیث پر مشتمل ہے۔

۵ - امام ابوعیسٰی ترمذی ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۹ھ اس کتاب میں فقہی مسالک کی تفصیل وضاحت سے کی گئی ہے۔

۶ - امام احمد بن شعیب نسائی۔ وفات ۳۰۳ھ ان کی تصنیف کا نام السنن المجتبیٰ ہے۔ امام نسائی نے دوسری تالیف "السنن الکبریٰ" کے نام سے مرتب کی تھی، جس کے چند اجزاء محترم مولانا عبدالصمد الکتبی نے بمبئی سے شائع کئے ہیں۔

۷ - امام محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینی (ف ۲۷۳ھ) ان کی کتاب سنن ابن ماجہ کے نام سے مشہور ہے۔ مسند احمد کے علاوہ ان چھ کتابوں کو محدثین کی اصطلاح میں صحاح ستّہ کہا جاتا ہے۔ بعض اہل علم نے بجائے ابن ماجہ کے موطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شمار کیا ہے۔

ان کے علاوہ اس دور میں اور بھی بہت سی مفید اور جامع تالیفات شائع ہوئی ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ بخاری، ترمذی جامع کہلاتی ہیں۔ یعنی عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات وغیرہ تمام عنوانات پر ان میں احادیث موجود ہیں اور ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ سنن کہلاتی ہیں۔ یعنی ان میں زیادہ تر عملی زندگی سے متعلق روایات درج ہیں۔

طبقات کتب حدیث

محدثین نے روایات کی صحت و قوت کے لحاظ سے تمام کتب حدیث کو چار طبقات پر تقسیم کیا ہے۔

۱ - موطا امام مالک[۱]، صحیح بخاری[۲]، صحیح مسلم[۳]۔ یہ تینوں کتابیں صحتِ سند اور راویوں کی

ثقاہت کے اعتبار سے اعلیٰ مقام رکھتی ہیں۔

۲ - ابوداؤد، ترمذی، نسائی۔ ان کتابوں کے بعض راوی ثقاہت کے اعتبار سے طبقہ اوّل سے فروتر ہیں لیکن ان کو بہرحال قابل اعتماد مانا جاتا ہے مسند احمد کا شمار شاہ ولی اللہؒ (ف ۱۱۷۶ھ) کی تحقیق کے مطابق طبقہ (۲) اور (۳) کے درمیان ہے۔ ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ ج ۱

۳ - دارمی (ف ۲۲۵ھ) ابن ماجہ ف ۲۷۳ھ، بیہقی ف ۴۵۸ھ دارقطنی (ف ۳۸۵ھ) کتب طبرانی (ف ۳۶۰ھ)، تصانیف طحاوی (ف ۲۱۱ھ) مسند شافعیؒ ف ۲۰۴ھ، مستدرک حاکم (ف ۴۰۵ھ) ان کتابوں میں صحیح، ضعیف ہر قسم کی روایات موجود ہیں لیکن قابل اعتماد روایات کا عنصر غالب ہے۔

۴ - تصانیف ابن جریر طبری (ف ۳۱۰ھ) کتب خطیب بغدادی (ف ۴۶۳ھ)، ابونعیم (ف ۴۰۳ھ)، ابن عساکر (ف ۵۷۱ھ) دیلمی صاحب فردوس (ف ۵۰۹ھ)، کامل ابن عدی (ف ۳۶۵ھ) تالیفات ابن مردویہ (ف ۴۱۰ھ) واقدی (ف ۲۰۷ھ) اور اسی نوع کے دوسرے مصنفین کی کتابیں اسی طبقہ میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ تالیفات رطب، ویابس کا مجموعہ ہیں۔ موضوع (من گھڑت) روایات تک بھی ان میں بکثرت موجود ہیں۔ زیادہ تر عام واعظین، مؤرخین اصحابِ تصوّف اور متاخرین فقہاء کا سہارا یہی کتابیں ہیں لیکن اگر چھان بین سے کام لیا جائے تو ان تالیفات میں سے بھی بیش بہا جواہر ریزے نکالے جا سکتے ہیں۔

چوتھا دَور تقریباً پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس عرصہ میں تیسرے دَور کا اندازِ تدوین اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ اس دور کی تصانیف میں سند اور مکررات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس طویل مدت میں جو کام ہوا ہے اسکی تفصیل یہ ہے:۔

۱ - حدیث کی اہم کتابوں کی شرحیں، حواشی اور دوسری زبانوں میں تراجم لکھے گئے۔

۲ - جن علوم حدیث کا ذکر اوپر آیا ہے ان پر بہت سی تصانیف اسی دور میں وجود میں آئی ہیں اور ان کی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے ہیں۔ اس دور کو تلخیص و تشریح کا دور کہا جا سکتا ہے۔

۳ - اہل علم نے اپنے ذوق یا ضرورت کے مطابق تیسرے دور کی تالیفات سے احادیث منتخب کر کے مفید کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

الف - مشکوٰۃ المصابیح مؤلفہ ولی الدین خطیب وفات بعد ۷۳۷ھ، اس میں عقائد عبادات، معاملات، اخلاق، آداب، اور حشر و نشر سے متعلق روایات جمع کر دی گئی ہیں۔

(ب) ریاض الصالحین : مرتبہ امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی شارح مسلم (وفات ۶۷۶ھ) یہ زیادہ تر اخلاق و آداب پر مشتمل احادیث کا انتخاب ہے۔ ہر باب کے شروع میں عنوان کے مطابق قرآنی آیات بھی ذکر کی گئی ہیں۔ یہ اس کتاب کی اہم خصوصیت ہے۔ صحیح بخاری کا بھی انداز تالیف و ترتیب یہی ہے۔

۴۔ منتقی الاخبار، مؤلفہ مجد الدین ابو البرکات عبدالسلام بن تیمیہ (ف ۶۵۲ھ) جو مشہور شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن تیمیہ (ف ۷۲۸ھ) کے جد امجد ہیں۔ اسکی شرح آٹھ جلدوں میں قاضی شوکانی نے نیل الاوطار کے نام سے مرتب کی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ مولانا داؤد راغب مرحوم کے قلم سے مکتبہ سلفیہ لاہور نے شائع کیا ہے۔

۵۔ بلوغ المرام۔ مرتبہ حافظ ابن حجر شارح صحیح بخاری (وفات ۸۵۲ھ) اس میں زیادہ تر عبادات اور معاملات سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اس کی شرح سبل السلام عربی میں محمد بن اسماعیل صنعانی (وفات ۱۱۸۲ھ) کے قلم سے شائع ہوئی ہے اور دوسری مسک الختام کے نام سے فارسی میں نواب صدیق الحسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ) نے ترتیب دی ہے۔ ان میں سے اکثر کے تراجم عرصہ ہوا اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ نیز نواب صاحب مرحوم نے ایک شرح عربی میں بھی تحریر فرمائی ہے، جس کا نام ہے فتح العلام یہ دراصل تلخیص ہے سبل السلام کی، سبل السلام ماخوذ اور مستفاد ہے البدر التمام سے جو مکتبہ محمودیہ مدینہ طیبہ میں موجود ہے۔ یعنی قلمی نسخہ۔

غیر منقسم ہندوستان میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی بن سیف الدین ترک (وفات ۱۰۵۲ھ) نے علم حدیث کی شمع روشن کی۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ، وفات ۱۱۷۶ھ) اور ان کی اولاد، احفاد اور ارشد تلامذہ کی جانفشانیوں اور جگر کا دیوں سے اس ملک کی سرزمین نور سنت سے جگمگا اٹھی واشرقت الارض بنور ربہا۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے اس ملک میں تراجم، شروح اور منتخب احادیث کے مجموعوں کی ترتیب و اشاعت کا مقدس سلسلہ اب تک جاری ہے۔ انتخاب حدیث کے نام سے راقم الحروف کے قلم سے چار صد احادیث کا ایک مجموعہ مع ترجمہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کے کئی اڈیشن پاک و ہند میں اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ وللہ الحمد۔

اس پوری تفصیل کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ عہد نبوی سے لے کر اب تک کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا ہے جس میں حدیث کے لکھنے اور روایت کرنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہو۔ یہ وہ سلسلہ علم ہے جس کا دن بھی روشن ہے اور جس کی رات کا دامن بھی درخشانیوں اور تابناکیوں سے بھرپور ہے۔ لیلها کنهارها۔

حدیث نبویؐ

اور

سَبِیلُ المؤمنین (اجماعِ اُمّت)

آجکل بعض حلقوں سے یہ آواز اٹھائی جا رہی ہے کہ حدیث صرف ایک تاریخ ہے ۔ اسے شریعت کا درجہ حاصل نہیں ہے ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر قرآن حکیم، مستند روایات اور اسلامی تاریخ کا دیانت و بصیرت کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم کے بعد اسلامی قانون کا دوسرا قابلِ اعتماد سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں ۔

اس بارے میں قرآن کریم کی بہت سی آیات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس موقع پر صرف ایک آیت کی تشریح پر اکتفا کرتا ہوں ۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا

(سورہ نساء آیت ۱۱۵)

"جو ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر تل جاتا ہے۔ اور "سبیل المومنین" کے بجائے دوسری راہ اختیار کرتا ہے تو ہم اس کو اسی طرف چلائیں گے۔ جدھر وہ خود پلٹ گیا ہے اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے ، اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے"

اس آیت میں دو باتوں کی مذمت کی گئی ہے:۔

۱ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور آپ کے احکام سے سرتابی ۔

۲ ۔ سبیل المومنین سے انحراف کرتے ہوئے دوسرے راستہ کی پیروی ۔

ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین جو احادیث کی شکل میں

ہمارے سامنے ہیں۔ان کی حیثیت صرف ایک تاریخ دین کی ہے تو پھر ان کی مخالفت پر یہ وعید کیوں سنائی جا رہی ہے۔

مذکورہ بالا استدلال کو کمزور ٹھیرانے کے لئے دو قسم کے مغالطے دیئے جاتے ہیں:

۱۔ یہاں الرسول کی مخالفت سے مراد اللہ تعالےٰ کی مخالفت مراد ہے۔یعنی قرآنی احکام سے روگردانی۔لیکن یہ مغالطہ بے بنیاد ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالےٰ کی اطاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو الگ الگ بیان فرمایا گیا ہے:۔

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (نساء آیت ۵۹) اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔

معلوم ہوا کہ دونوں کے مصداق علیحدہ علیحدہ ہیں۔اللہ کی اطاعت سے مراد ہے قرآن کی اطاعت اور اطاعتِ رسول سے مراد ہے سنتِ رسولؐ کی پیروی۔

اسی طرح اللہ کی نافرمانی اور رسول کی مخالفت دونوں کے مصداق بھی جدا جدا ہوں گے۔

۲۔ یہاں الرسول کی مخالفت پر جو دھمکی دی جا رہی ہے وہ اس بنا پر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں صاحب امر تھے۔ یہ مغالطہ اور شبہ بھی قطعاً بے بنیاد ہے۔خود قرآن میں متعدد مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور صاحب امر کی اطاعت کا ذکر الگ الگ ملتا ہے۔

ا۔ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ (نساء آیت ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو۔اور جو تم میں سے صاحب امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔

اب اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم یا آپؐ کی مخالفت پر وعید محض اس بنا پر سنائی جا رہی ہے کہ آپ صاحب امر ہیں تو اس حیثیت سے آپ اولی الامر میں شامل ہی تھے۔الگ واطیعوا الرسول کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ب۔ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (نساء آیت ۸۳)۔

(منافقین کا حال یہ ہے، کہ جہاں کہیں امن یا خوف کی کوئی خبر سن پاتے ہیں تو اسے پھیلا دیتے ہیں۔حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنے اولی امر کے پاس پہنچائیں تو ایسی صورت میں ایسے

لوگ اس سے باخبر ہوں جو اصل معاملہ سے صحیح نتیجہ نکال سکیں۔
اس آیت میں بھی واضح طور پر واوٗ عطف کے ساتھ اَلرَّسُوْل اور اُولِی الْاَمْر کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔
اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ خود قرآن حکیم کی تصریحات کے مطابق آپ کی اطاعت اس بنا پر فرض نہیں ہے یا آپ کی مخالفت سے اجتناب اس لئے ضروری نہیں ہے کہ آپؐ صاحبِ امر تھے بلکہ اس بنیاد پر کہ آپؐ صاحبِ رسالت تھے۔
اس تشریح سے یہ حقیقت پوری طرح بے نقاب ہوگئی کہ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْل کا مفہوم متعین طور پر ایک ہی ہے۔ یعنی جو سنتِ رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے ان کو جہنم کی وعید سنائی جا رہی ہے، اس آیت میں دوسرا جرم جس پر عذاب کی دھمکی دی گئی ہے "سبیل المومنین" سے انحراف ہے۔
اب یہاں سوچنا پڑے گا کہ حدیث کے بارے میں پہلی صدی ہجری سے لے کر اب تک اہل ایمان کا رویہ کیا رہا ہے؟
قابل اعتماد روایات اور مستند اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ معتزلہ اور خوارج میں سے چند افراد کے سوا پوری امت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قرآن حکیم کے بعد اسلامی قانون کا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں۔
اس سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے مستند اقوال اور ان کی زندگی کے عملی نمونے پیش کر دیئے جائیں اس طرح حدیث کے بارے میں سبیل المومنین کا پورا نقشہ ایک تسلسل کے ساتھ قارئین کرام کے سامنے آجائے گا۔

خلیفہ اوّل اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حافظ ابن قیمؒ نے سنت اور حدیث کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل اس طرح نقل کیا ہے کہ:۔
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا پہلے وہ کتاب اللہ میں اس کا حل تلاش کرتے اگر وہاں نہ پاتے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف رجوع فرماتے، اگر اس موقع پر بھی ناکام رہتے تو پھر لوگوں سے دریافت کرتے کہ کیا اس معاملہ میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کا کسی کو علم ہے؟ بار ہا ایسا ہوا ہے کہ اس طرح سوال کرنے پر لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی اطلاع آپ کو دی ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:۔

كَانَ أَبُوْبَكْرٍ إِذَا وَرَدَ عَلَيْهِ حُكْمٌ نَظَرَ فِي كِتَابِ اللهِ تَعَالَىٰ فَإِنْ وَجَدَ فِيْهِ مَا يَقْضِي بِهِ قَضَىٰ بِهِ وَإِنْ لَّمْ يَجِدْ فِي كِتَابِ اللهِ نَظَرَ فِي سُنَّةِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنْ وَجَدَ فِيْهَا مَا يَقْضِي بِهِ قَضَىٰ بِهِ فَإِنْ أَعْيَاهُ ذٰلِكَ سَأَلَ النَّاسَ هَلْ عَلِمْتُمْ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضَىٰ فِيْهِ بِقَضَاءٍ فَرُبَّمَا قَامَ إِلَيْهِ الْقَوْمُ فَيَقُوْلُوْنَ قَضَىٰ فِيْهِ بِكَذَا وَكَذَا (اعلام الموقعین ۔۔۔ ج ۱ صـ ۶۲ طبع مصر)

تاریخ الخلفاء میں مزید الفاظ ملتے ہیں، کہ آپؓ اس قسم کے مواقع پر لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سن کر خوشی سے یہ فرماتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ فِيْنَا مَنْ يَّحْفَظُ عَنْ نَبِيِّنَا، اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم میں سے ایسے لوگوں کو باقی رکھا ہے جن کے سینوں میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت محفوظ ہے۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی صـ ۳۹ طبع بیروت)

حدیث کے بارے میں یہی روش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کی گئی ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ترکۂ نبویؐ میں سے اپنے حصہ کا مطالبہ کیا اور ازواج مطہرات نے حضرت عثمانؓ کے ذریعے اپنا حقِ وراثت طلب کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب کو ایک ہی حدیث سنا کر مطمئن کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ یعنی ـــ انبیاء کرام کا ترکہ میراث کے طور پر تقسیم نہیں ہوتا۔" (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ صـ ۵۵۰)

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جنہیں مطالبہ پر اصرار تھا، بعد میں وہ بھی راضی ہوگئیں۔

(بیہقی ج ۶ صـ ۳۰۱)

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ میں یہ نزاع پیدا ہوا کہ آپؐ کو کہاں دفن کیا جائے، اس بارے میں صحابہ کرام کا رجحان مختلف مقامات کی طرف تھا اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حدیثِ نبویؐ سنا کر اس نزاع کا خاتمہ کر دیا۔

مَا قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيًّا اِلَّا فِى الْمَوْضِعِ الَّذِى يُحِبُّ اَنْ يُدْفَنَ فِيْهِ۔
(ترمذی کتاب الجنائز ج ۲ ص ۱۳۹ تحفۃ الاحوذی، موطا امام مالک مع تنویر الحوالک
ج ۱ ص ۲۳۰ باب ماجاء فی دفن المیت)

۴ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان پر فوج کشی کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ آپ ان لوگوں سے جہاد و قتال کیسے کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تو یہ ہے:-

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَمَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عَصَمَ مِنِّىْ مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ اِلَّا بِحَقِّهٖ وَحِسَابُهٗ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ

(یعنی مجھے حکم دیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیں جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا اس نے اپنی جان و مال محفوظ کر لئے، مگر ہاں جس کے ذمے اسلام کا حق رہ جائے (تو اس پر تلوار اٹھائی جا سکتی ہے)۔)

اس کے جواب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"بخدا جس نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان امتیاز کیا میں اس سے لازماً جہاد کروں گا مال میں بھی اسلام کا حق واجب ہوتا ہے" (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۷ بحوالہ بخاری و مسلم کتاب الزکوٰۃ)

اس روایت کی روشنی میں حدیث کے متعلق حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کا موقف واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ مخالفین زکوٰۃ سے جہاد کے بارے میں حضرت عمرؓ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ نہیں فرماتے کہ یہ کیا حدیث پیش کر رہے ہو۔ قرآن لاؤ۔ بلکہ حدیث کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا ایسا مطلب بیان کرتے ہیں کہ خود حضرت عمرؓ بھی اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

۵ - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد تاریخ اسلام کا وہ نازک مرحلہ پیش آیا کہ جس کی بنا پر قریب تھا کہ انصار و مہاجرین کے درمیان خلافت کے بارے میں اختلاف کی نوعیت شدید صورت اختیار کر جاتی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ ہی نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم[1] اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ پیش کر کے انصار کے جوش کو ٹھنڈا کر دیا

---

[1] حدیث نبوی اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ (امراء و خلفاء قریش میں سے ہوں گے) بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے

اور معاملہ رفع دفع ہو گیا (تاریخ الامم الاسلامیہ خضری ج ۱ ص ۲۶۸)

مذکورہ بالا مستند تاریخی شہادتوں کی بنا پر منکرین حدیث کا یہ اعتراض بھی بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے کہ حدیثیں امت میں انتشار و اختلاف کا سبب بنی ہیں - ان واقعات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان نازک مواقع پر جبکہ انتشار کا خطرہ سر پر تھا، حدیث رسول ؐ نے رہنمائی کی اور بچھڑے ہوئے روٹھے ہوئے دلوں کو پھر سے اس نے ملا دیا -

۶ - حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جب دادی کے حق کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ اپنے پوتے کی میراث میں سے کتنا حصہ پائے گی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں صحابہ کرام سے دریافت کیا، محمد بن مسلمہ اور مغیرہ بن شعبہ نے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ دلوایا ہے - حضرت ابوبکر رض نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا -

(موطا امام مالک ص ۲۳۷ باب میراث الجدۃ)

حضرت عمر رض اور حدیث نبوی ؐ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حدیث کے معاملہ میں بعینہٖ وہی طرز عمل اختیار کیا جو مذکورہ بالا واقعات میں حضرت ابوبکر رض کے بارے میں بیان کیا گیا ہے - مختصر طور پر چند نظائر یہاں پیش کئے جاتے ہیں :

(۱) قَالَ عُمَرُ سَيَأْتِي قَوْمٌ يُجَادِلُونَكُمْ بِشُبُهَاتِ الْقُرْآنِ فَخُذُوهُمْ بِالسُّنَنِ فَإِنَّ أَصْحَابَ السُّنَنِ أَعْلَمُ بِكِتَابِ اللهِ (مقدمۃ المیزان للشعرانی مطبوعہ قاہرہ ص ۶۲)

آئندہ ایسے لوگ وجود میں آئیں گے جو قرآنی آیات کے بارے میں شبہات پیدا کر کے تم سے بحث و مجادلہ کریں گے، ایسے لوگوں پر تم سنتوں (احادیث) کے ذریعے گرفت کرو، اس لئے کہ سنن والے اللہ کی کتاب کا زیادہ علم رکھتے ہیں -

یعنی قرآن مجید کا صحیح فہم، سنت و حدیث کے علم پر موقوف ہے، ورنہ انسان شبہات

کہ یہاں قرشیت کو معیار خلافت و امارت قرار دیا گیا ہے - حالانکہ قرآنی تصریحات اور دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سیادت و امارت کا اصل معیار علم دین اور تقویٰ ہے - اس شبہ کے ازالہ کا یہ موقع نہیں ہے انشاء اللہ کسی دوسری فرصت میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو سکے گی (حسن)

وشکوک کی وادی میں بھٹکتا پھرے گا۔

(۲) ایک بار حضرت عمرؓ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں اپنے عمال (گورنر) تمہارے پاس اس لئے نہیں بھیجتا ہوں کہ وہ تمہیں مار کر چمڑی ادھیڑ دیں اور تمہارے مال مویشی تم سے زبردستی چھین لیں بلکہ میں تو ان کو اس لئے بھیجتا ہوں کہ تمہیں، تمہارا دین اور تمہارے نبیؐ کی سنت سکھلائیں۔

اصل الفاظ یہ ہیں: اِنِّیْ لَمْ اَبْعَثْ عُمَّالِیْ اِلَیْکُمْ لِیَضْرِبُوْا اَبْشَارَکُمْ وَلَا لِیَاخُذُوْا اَمْوَالَکُمْ وَلٰکِنْ اِنَّمَا بَعَثْتُهُمْ لِیُبَلِّغُوْکُمْ دِیْنَکُمْ وَسُنَّۃَ نَبِیِّکُمْ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷۱ مطبوعہ اشرف المطابع دہلی)

۳۔ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ شام کے ارادے سے نکلے جب آپ مقام سرغ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ مزید سفر جاری رکھنے کے بارے میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ کافی بحث وگفتگو کے باوجود کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس موقع پر حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے یہ حدیث پیش کی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جہاں وبا پھوٹ پڑی ہو اس جگہ جانا نہیں چاہیئے۔"

اس حدیث کو سن کر صحابہ کا اختلاف دور ہو گیا اور حضرت عمرؓ لشکر کے ساتھ مدینہ واپس تشریف لے آئے (صحیح مسلم باب الطاعون والطیرہ ج ۲ صفحہ مطبوعہ مصر)

۴۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔

اَیُّهَا النَّاسُ قَدْ سُنَّتْ لَکُمُ السُّنَنُ وَفُرِضَتْ لَکُمُ الْفَرَائِضُ وَتُرِکْتُمْ عَلَی الْوَاضِحَۃِ اِلَّا اَنْ تَضِلُّوْا بِالنَّاسِ یَمِیْنًا وَّ شِمَالًا (الاعتصام شاطبی ج ۱ ص ۱۰۴)

لوگو! تمہارے لئے سنت مقرر کی گئی ہے۔ فرائض واحکام متعین کر دیئے گئے ہیں۔ تمہارے لئے روشن راستہ بنا دیا گیا ہے۔ الا یہ کہ تم لوگوں کی وجہ سے دائیں بائیں بھٹک جاؤ۔

ثُمَّ قَالَ اِیَّاکُمْ اَنْ تَهْلِکُوْا عَنْ آیَۃِ الرَّجْمِ۔ اَنْ یَقُوْلَ قَائِلٌ: لَا نَجِدُ حَدَّیْنِ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ۔ فَقَدْ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا۔ الی آخر الحدیث حوالہ مذکور ص ۸۸ - ۸۹، موطا امام مالکؒ ج ۲ کتاب الحدود ص ۸۲۴ مع تحقیق محمد فؤاد عبدالباقی۔

پھر آپ نے فرمایا :

" سنو ! رجم کا حکم جھٹلا کر خدا کے عذاب کا نشانہ نہ بنو کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ ہم اللہ کی کتاب میں دو حدوں کا ذکر نہیں پاتے ۔ رسول اللہ نے رجم کیا (یعنی زانی کو سنگسار کیا) اور ہم بھی رجم کرتے ہیں "

(۴) ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے من مانی تاویل اور بے بنیاد قیاس و رائے کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ایاکم واصحاب الرّأی فانھم اعداء السنن اعیتھم الاحادیث ان یحفظوھا فقالوا بالرّأی فضلّوا و اضلّوا (الاعتصام شاطبی ج ۱ ص ۱۰۴)

" لوگو! رائے اور من گھڑت قیاس آرائی کرنے والوں سے بچو۔ اس لئے کہ یہ لوگ سنت کے دشمن ہیں۔ احادیث کے حفظ کرنے سے یہ لوگ عاجز رہ گئے ہیں۔ اسی بنا پر انھوں نے قیاس آرائی کا سہارا لیا نتیجہ یہ نکلا کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کر ڈالا "

۵ ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ مقتول شوہر کی دیت سے اسکی بیوی حصہ پائے گی یا نہیں ؟ حضرت عمر رض اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ اس موقع پر ضحاک بن سفیان حضرت عمر رض سے کہتے ہیں کہ میرے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نوشتہ موجود ہے کہ آپ ص نے اشیم ضبابی کی بیوی کو اپنے شوہر کی دیت میں سے حصہ لینے کا حقدار ٹھہرایا تھا یہ سن کر حضرت عمر رض نے اپنے فیصلے سے رجوع فرمایا ۔ (ابوداؤد کتاب الفرائض ج ۳ ص ۹۰)

۶ ۔ ایران کے فتح ہونے کے بعد حضرت عمر رض کے سامنے یہ سوال آیا کہ اہل فارس سے جزیہ لیا جاسکتا ہے یا نہیں ؟ قرآن میں اس بارے میں کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے ۔ آپ نے صحابہ کرام رض سے دریافت کیا ۔ اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن رض بن عوف نے فرمایا کہ :۔ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے " ہجر " کے مجوسیوں سے جزیہ لیا ہے " حضرت عمر رض نے اس وضاحت کے بعد اہل فارس سے بھی جزیہ لینا شروع کر دیا ۔

(ابوداؤد مع عون المعبود ج ۳ کتاب الخراج ص ۱۳۴)

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے مذکورہ بالا نظائر و شواہد کے علاوہ صحیح سند کے ساتھ بہت سے اقوال و واقعات منقول ہیں جن سے صاف طور پر سنت کے بارے میں ان کا موقف واضح ہو جاتا ہے۔

ان دونوں حضرات کے موقف کو قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ عام طور پر منکرین حدیث بعض آثار کو غلط رنگ دے کر ان دونوں بزرگوں پر انکار حدیث کی تہمت تراشتے ہیں۔

حضرت عثمانؓ اور حدیث نبویؐ

(۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ جس عورت کا شوہر مر جائے تو وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے لیکن ابوسعید خدری کی بہن فریعہ بنت مالک نے اپنا واقعہ پیش کیا کہ میرا شوہر قتل کیا گیا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپؐ نے شوہر کے مکان پر عدت گذارنے کا حکم دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی روایت کے مطابق فیصلہ کیا۔ (موطا امام مالک مجتبائی ص۲۱۷ باب مقام المتوفی عنہا زوجہا)

۲ - حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر جن الفاظ کے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بیعت کی تھی وہ یہ تھے:۔

أُبَايِعُكَ عَلَىٰ كِتَابِ اللهِ وَسُنَّةِ رَسُوْلِهِ وَسِيْرَةِ أَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا (مسند احمد ج ۱ ص ۷۵)

میں تمہارے ہاتھ پر، اللہ کی کتاب، اس کے رسولؐ کی سنت اور حضرت ابوبکرؓ اور عمر رضی اللہ عنہ کے طریقے پر بیعت کرتا ہوں۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں سرمو بھی اس معاہدۂ بیعت سے تجاوز نہ کیا۔

۳ - حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حج کے موسم میں تمتع کے قائل نہ تھے لیکن جب حضرت علیؓ نے حدیث بیان کی تو انہوں نے اپنے قول سے رجوع کر لیا۔

(النسائی مع شرح سیوطی ج۵ ص۱۵۲ طبع بیروت)

حضرت علیؓ اور حدیث نبویؐ

۱ - حضرت علیؓ کے پاس چند مرتد افراد لائے گئے، آپؓ نے انکو آگ میں جلانے کا حکم دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے حدیث پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔
مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ ۔ یعنی ـ مرتدین کا خاتمہ تلوار سے کیا جا سکتا ہے نہ کہ آگ میں جلا کر۔
حضرت علیؓ نے یہ سن کر فرمایا: صَدَقَ ابْنُ عَبَّاسٍ یعنی ابن عباس سچ کہتے ہیں (ترمذی مجتبائی صفحہ ۱۷۶، ابواب الحدود)

۲ - حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ فرمایا اگر دین کا مدار رائے اور قیاس آرائی پر ہوتا تو موزوں کے نیچے مسح کیا جاتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں کے اوپر مسح کیا ہے۔
(مع عون المعبود ج ۱ ص ۶۳ طبع ہند)

۳ - حضرت علیؓ نے کتاب وسنت کے اتباع کے معاملہ میں ٹھیک وہی روش اختیار کی جس پر حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ زندگی بھر قائم رہے حضرت علیؓ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:۔
"خداوندا! جس طرح تو نے خلفائے راشدین کی رہنمائی فرمائی ہے مجھے بھی اپنی ہدایت سے مالا مال کر دے۔"
کسی نے سوال کیا: "خلفائے راشدین سے کون لوگ مراد ہیں؟" اس موقع پر آپؓ کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور آپ نے فرمایا:۔
هُمَا حَبِيْبَايَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ اِمَامَا الْهُدٰى وَشَيْخَا الْاِسْلَامِ . . .
یعنی خلفائے راشدین سے میری مراد ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں جو میرے محبوب ہیں، ہدایت کے امام ہیں اور اسلام کی باعظمت شخصیتیں ہیں۔ (تاریخ الخلفاء: للسیوطی ص ۱۶۷ طبع بیروت)
خلفائے راشدین کے علاوہ دوسرے کبار صحابہؓ کے اقوال و آثار بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن سردست مذکورہ نظائر ہی پر اکتفا کی جاتی ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حدیث نبویؐ

حضرت عمر بن عبدالعزیز (وفات ۱۰۱ھ) نے ایک مرتبہ فرمایا :-

سَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوُلَاةُ الْاَمْرِ مِنْ بَعْدِهٖ سُنَنًا اَلْاَخْذُ بِهَا تَصْدِيْقٌ لِكِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتِكْمَالٌ لِطَاعَةِ اللّٰهِ وَقُوَّةٌ عَلٰى دِيْنِ اللّٰهِ لَيْسَ لِاَحَدٍ تَغْيِيْرُهَا وَلَا تَبْدِيْلُهَا وَلَا النَّظَرُ فِيْ شَيْءٍ خَالَفَهَا مَنْ عَمِلَ بِهَا مُهْتَدٍ وَمَنِ انْتَصَرَ بِهَا مَنْصُوْرٌ وَمَنْ خَالَفَهَا اتَّبَعَ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(الاعتصام شاطبی ج ۱ صفحہ ۱۰۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ولاۃ امر یعنی خلفائے راشدین نے آپ کے بعد بہت سی سنتیں قائم کی ہیں۔ جن کو اختیار کرنا کتاب اللہ کی تصدیق کے ہم معنی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالے کی اطاعت میں کمال حاصل ہوتا ہے اور اس کے دین کے لئے قوت و طاقت میں فراوانی ہوتی ہے۔ ان سُنتوں میں تغیر و تبدّل جائز نہیں ہے اور نہ ان کی مخالفت گوارا کی جا سکتی ہے جس نے ان پر عمل کیا اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان کا سہارا لیا اس نے غلبہ پایا اور جس نے ان کی مخالفت کی اس نے مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسرے راستہ کی پیروی کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول امام مالک کو بہت ہی پسند تھا بار بار اسے دہرایا کرتے تھے

یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے حدیث کی باقاعدہ جمع و تدوین کیلئے محدثین کرام کو آمادہ کیا اور اس کے لئے حکومت کے وسائل و ذرائع وقف کر دیئے۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ مقدمہ انتخاب الحدیث)

امام ابو حنیفہؒ اور حدیث نبویؐ

منکرین حدیث نے امام ابو حنیفہؒ کو بھی اپنے زمرے میں شمار کیا ہے اس سے بڑھکر جسارت اور افترا کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ ذیل میں سنّت و حدیث کے بارے میں امام صاحبؒ کے مستند اقوال پیش کئے جا رہے ہیں۔ جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام صاحبؒ کے دل میں سُنّت و حدیث کی کتنی قدر و منزلت تھی۔

۱۔ لَوْ لَا السُّنَّۃُ مَا فَھِمَ اَحَدٌ مِّنَّا الْقُرْآنَ (قواعد التحدیث ص۲۱ بحوالہ مقدمۃ المیزان للشعرانی ص۶۲)

اگر سنت کا وجود نہ ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی قرآن کا فہم حاصل نہ کر سکتا۔

۲۔ اِیَّاکُمْ وَالْقَوْلَ فِی دِیْنِ اللّٰہِ بِالرَّأْیِ وَعَلَیْکُمْ بِاِتِّبَاعِ السُّنَّۃِ فَمَنْ خَرَجَ عَنْھَا ضَلَّ۔ (قواعد التحدیث صفحہ ۲۳)

اللہ کے دین کے معاملہ میں رائے اور قیاس سے بچو اور سنت کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ جو سنّت کے دائرے سے نکلا وہ گمراہ ہوا۔

۳۔ لَمْ تَزَلِ النَّاسُ فِی صَلَاحٍ مَادَامَ مِنْھُمْ مَنْ یَطْلُبُ الْحَدِیْثَ فَاِذَا طَلَبُوا الْعِلْمَ بِلَا حَدِیْثٍ فَسَدُوْا (حوالہ مذکور)

لوگ برابر خیر و صلاحیت سے ہم کنار رہیں گے جب تک کہ ان میں حدیث کے طالب موجود رہیں گے اور جب وہ حدیث کو چھوڑ کر علم طلب کریں گے تو فساد اور بگاڑ کا نشانہ بن جائیں گے۔

۴۔ اِذَا صَحَّ الْحَدِیْثُ فَھُوَ مَذْھَبِیْ (ابن عابدین فی الحاشیہ ج ۱ صفحہ ۶۳۔ ایقاظ الھمم۔ الشیخ الفلانی ص۶۲)

۵۔ اِذَا قُلْتُ قَوْلاً یُخَالِفُ کِتَابَ اللّٰہِ وَحَدِیْثَ الرَّسُوْلِ فَاتْرُکُوْا قَوْلِیْ

جب میں کوئی ایسی بات بیان کروں جو کتاب اللہ اور حدیث رسول ﷺ کے خلاف ہو تو میری بات کو چھوڑ دو (کتاب مذکور صفحہ ۵۰)

امام مالکؒ اور حدیث نبوی ﷺ

۱۔ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اُخْطِئُ وَاُصِیْبُ فَانْظُرُوْا فِی رَأْیِیْ فَکُلُّ مَا وَافَقَ الْکِتَابَ وَالسُّنَّۃَ فَخُذُوْہُ وَکُلُّ مَا لَمْ یُوَافِقِ الْکِتَابَ وَالسُّنَّۃَ فَاتْرُکُوْہُ (جامع بیان العلم ابن عبد البر ج ۲ ص۳۲)

میں ایک انسان ہی ہوں غلط اور صحیح دونوں قسم کے فتوے دے سکتا ہوں۔ میری رائے میں غور کرو اگر کتاب و سنت کے مطابق ہو تو اسے قبول کر لو ورنہ رد کر دو۔

۲۔ لَیْسَ اَحَدٌ اِلَّا وَیُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِہٖ وَیُتْرَکُ اِلَّا النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم (اصول الاحکام ابن حزم ج ۶ صفحہ ۱۳۵)

"ہر شخص کی بات کو اختیار بھی کیا جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ سوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ آپؐ کے قول کو بہر حال اپنانا ہی پڑے گا۔

امام شافعیؒ اور حدیث نبویؐ

حدیث کے بارے میں امام شافعیؒ کے بہت اقوال نقل کئے جا سکتے ہیں بنظر اختصار یہاں صرف ان کا ایک قول بیان کیا جاتا ہے۔

أَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی اَنَّ مَنِ اسْتَبَانَ لَہٗ سُنَّۃٌ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمْ یَحِلَّ لَہٗ اَنْ یَدَعَھَا بِقَوْلِ اَحَدٍ۔ (اعلام الموقعین ج ۲ صفحہ ۳۶۱)

"تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سامنے آ جائے تو پھر اس بات کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس کو کسی اُمتی کے قول کی بنا پر ترک کر دیا جائے۔"

امام احمد بن حنبلؒ اور حدیث نبویؐ

امام احمد بن حنبل کا احادیث کی جمع و ترتیب اور درس و تدریس سے جو شغف رہا ہے اس کا انکار کس کو ہو سکتا ہے وہ فرماتے ہیں:-

مَنْ رَدَّ حَدِیْثَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَھُوَ عَلٰی شَفَا ھَلَکَۃٍ

(کتاب المناقب ابن الجوزی صفحہ ۱۸۲)

یعنی جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو رد کیا وہ ہلاکت و تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا۔

فقہا اور محدثین کی ان آرا کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض اکابر صوفیا کا نقطۂ نظر بھی سنت اور حدیث کے بارے میں بیان کر دیا جائے۔

صوفیا کرام اور حدیث نبویؐ

۱۔ ابراہیم بن ادھمؒ دُعا کی عدم قبولیت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی بیان کرتے ہیں:-

اِدَّعَیْتُمْ حُبَّ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَتَرَکْتُمْ سُنَّتَہٗ

(الاعتصام شاطبی جلد ۱ صفحہ ۱۰۰)

تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کیا ہے اور آپؐ کی سنّت کو ترک کر دیا ہے

۲ - ذوالنون مصریؒ دُنیا میں فساد و بگاڑ کے اسباب بیان کرتے ہوئے ایک سبب یہ بھی بتلاتے ہیں :

اِتَّبَعُوا اَهْوَاءَهُمْ وَنَبَذُوا سُنَّةَ نَبِيِّهِمْ - (حوالہ مذکور)

یعنی لوگوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی اور نبیؐ کی سنت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

۳ - بشر الحافی فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، آپؐ نے مجھ سے فرمایا کچھ معلوم ہے، تمہیں اپنے زمانے کے لوگوں پر کیوں برتری حاصل ہوئی ہے؟ پھر آپؐ نے فرمایا: لِاتِّبَاعِكَ سُنَّتِي وَحُرْمَتِكَ لِلصَّالِحِيْنَ ۔ چونکہ تم میری سنت کی پیروی کرتے ہو اور اللہ کے نیک بندوں کا احترام تمہارے دل میں ہے -

(الاعتصام شاطبی جلد ا صفحہ ۱۰۹)

۴ - ابو محمد عبدالوہاب ثقفی فرماتے ہیں :

لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنَ الْاَعْمَالِ اِلَّا مَا كَانَ صَوَابًا وَمِنْ صَوَابِهَا اِلَّا مَا كَانَ خَالِصًا وَمِنْ خَالِصِهَا اِلَّا مَا وَافَقَ السُّنَّةَ (کتاب مذکور جلد اول ص ۱۱۹)

اللہ تعالیٰ ان اعمال ہی کو قبول فرماتا ہے جو درست ہوتے ہیں اور درست وہی ہوتے ہیں جو خالص ہوں اور خالص وہی ہوتے ہیں جو سنت کے مطابق ہوں -

۵ - سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصول سات ہیں - (ان میں سے دو یہ ہیں)

۱ - اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامنا -

۲ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنا (کتاب مذکور جلد ا ص ۶۴)

۶ - شاہ کرمانی فرماتے ہیں :-

مَنْ غَضَّ بَصَرَهُ عَنِ الْمَحَارِمِ وَاَمْسَكَ نَفْسَهُ عَنِ الشُّبُهَاتِ وَعَمَّرَ بَاطِنَهُ بِالْمُرَاقَبَةِ وَظَاهِرَهُ بِاتِّبَاعِ السُّنَّةِ وَعَوَّدَ نَفْسَهُ اَكْلَ الْحَلَالِ لَمْ تُخْطِئْهُ فِرَاسَتُهُ (کتاب مذکور جلد ا صفحہ ۱۱۰)

یعنی جس نے اپنی نگاہ محارم سے بچائی، اور شبہات سے اپنے نفس کی حفاظت کی، اور اپنے باطن کو مراقبہ سے آباد کیا اور اپنے ظاہر کو اتباع سنت سے آراستہ کیا اور اپنے نفس کو حلال روزی کا عادی بنایا تو اس کی فراست کبھی خطا نہ کرے گی -

۷ - ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ بارہا میرے دل میں کوئی نکتہ کھٹکتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ میں اسے دو عادل گواہوں یعنی کتاب و سنت کے بغیر قبول نہ کروں گا (کتاب مذکور جلد ا صفحہ ۱۱۴)

۸ - ابو القاسم جنید فرماتے ہیں۔ مخلوق پر تمام راہیں بند ہیں صرف اسی کے لئے راستہ کھلا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرتا ہے۔ (کتاب مذکور ص۲۵)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ہر مکتبِ فکر نے ہر دور میں حدیث کو اسلامی قانون کا ماخذ تسلیم کیا ہے۔ بس یہی وہ سبیل المومنین ہے جو حدیث و سنت کے بارے میں واضح ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

مشاہیرِ اُمّت اور سُنتِ نبویؐ

امام غزالیؒ

امام ابو حامد محمد بن محمد بن الغزالیؒ وفات ۵۰۵ھ اہل علم کے درمیان معروف و مشہور شخصیت ہیں۔ وہ بیک وقت اصولی، فقیہ بھی تھے اور ساتھ ہی تصوّف کے ذوق سے بھی خوب اچھی طرح آشنا تھے، اس بارے میں ان کی کتاب "احیاء العلوم" شاہدِ عدل ہے۔

وہ اپنی شاہکار تصنیف "المستصفیٰ من علم الاصول" میں بعنوان الاصل الثانی من اصول الادلۃ سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رقم طراز ہیں۔

وَقَوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حُجَّۃٌ لِدَلَالَۃِ الْمُعْجِزَۃِ عَلٰی صِدْقِہٖ وَلِاَمْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی اِیَّانَا بِاتِّبَاعِہٖ وَلِاَنَّہٗ لَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی، وَلٰکِنْ بَعْضُ الْوَحْیِ یُتْلٰی فَیُسَمّٰی کِتَابًا، وَبَعْضُہٗ لَا یُتْلٰی وَھُوَ السُّنَّۃُ، وَقَوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حُجَّۃٌ عَلٰی مَنْ سَمِعَہٗ شِفَاھًا فَاَمَّا نَحْنُ فَلَا یَبْلُغُنَا قَوْلُہٗ اِلَّا عَلٰی لِسَانِ الْمُخْبِرِیْنَ اِمَّا عَلٰی سَبِیْلِ التَّوَاتُرِ وَاِمَّا بِطَرِیْقِ الْآحَادِ الخ (کتاب مذکور ج ا ص۱۲۹)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول حجت اور دلیل ہے، اس بنا پر کہ معجزات نے آپ کی راست بازی کی شہادت دی ہے، اور اس بنا پر کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کی اتباع کا حکم دیا ہے اور

اس بنا پر بھی کہ آپ اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ وہی کچھ آپ کی زبان مبارک سے نکلتا ہے جو آپ کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔ لیکن وحی کے دو حصے ہیں (۱) ایک کا نام "الکتاب" ہے جو تلاوت کی جاتی ہے (۲) اور دوسرے کا نام سُنّت ہے، جس کی تلاوت مقصود نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ان تمام لوگوں پر لازمی حُجت ہے جنہوں نے براہ راست آپ سے سُنا ہے، لیکن ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہمیں آپ کے ارشادات دو طریقے سے پہنچے ہیں (۱) تواتر کے ذریعے (۲) آحاد کے واسطے سے، اخبار آحاد کے بارے میں امام موصوف لکھتے ہیں۔

وَاَمَّا الْعَمَلُ بِخَبَرِ الْوَاحِدِ فَمَعْلُوْمُ الْوُجُوْبِ بِدَلِيْلٍ قَاطِعٍ اَوْجَبَ الْعَمَلَ عِنْدَ ظَنِّ الصِّدْقِ، وَالظَّنُّ حَاصِلٌ قَطْعًا وَوُجُوْبُ الْعَمَلِ عِنْدَهُ مَعْلُوْمٌ قَطْعًا كالحكم بِشَهَادَةِ اثْنَيْنِ۔ (حوالہ مذکور ص۱۴۶)

خبر واحد پر عمل کا وجوب قطعی دلیل سے معلوم ہو چکا ہے، یعنی دلیل قطعی (قرآنی آیات) نے خبر واحد پر عمل کرنے کو واجب قرار دیا ہے، جبکہ راویوں کی راست بازی گمانِ غالب کے ذریعہ حاصل ہو، یہ بھی واضح رہے کہ یہ گمان غالب قطعی طور پر حاصل ہے جب یہ صورتِ حال ہے تو خبر واحد پر عمل کا وجوب بھی قطعی طور پر ثابت ہو گیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے قاضی دُو گواہوں کی شہادت پر فیصلہ کر دیتا ہے۔

مطلب یہ کہ جب اس صورت میں گمان غالب کی بنیاد پر فیصلہ ہو سکتا ہے۔ تو خبر واحد کی بنیاد پر حدیثِ نبوی کیوں نہ قبول کیجائے۔ مثلاً ایک مسلمان کا خون قطعی طور پر حرمت والا ہے۔ اس کا بہانا مباح نہیں ہے، لیکن دو گواہوں کی شہادت پر یہ قطعی حرمت ختم ہو جاتی ہے، اور گمانِ غالب کی بنیاد پر قاضی قتل کا فیصلہ دے دیتا ہے

امام ابن تیمیہؒ اور سُنّت نبوی ؐ

تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اشتراک اور ابہام کی صورت میں سُنّت، کتاب اللہ کی شارح ہے اور قرآن کے جو امور لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہیں، ان کی تبیین و توضیح اور اس کے مجمل کی تفصیل و تشریح حدیث میں ہے۔

سُنّت کی تین قسمیں

امام ابن تیمیہؒ (وفات ۷۲۸ھ) کے نزدیک بھی ہر سُنّت مستقل حجّت ہے، خواہ قرآن کی شارح یا مفسّر ہو یا نہ ہو، وہ سنت کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں۔ اور تینوں کو حجّت مانتے ہیں۔

۱۔ وہ سنّت متواترہ جو ظاہر قرآن کے خلاف نہ ہو بلکہ اس کی مفسّر ہو۔ مثلاً نمازوں کی تعداد، رکعات کی تعداد، یا زکوٰۃ کا نصاب یا حج کے ارکان وغیرہ۔ اس طرح کے دوسرے احکام سنت ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں، اور علماء اسلام کا ان کے بارے میں اجماع ہے، یہ قرآن کا تتمہ اور تکملہ ہیں۔ پس جو ان کی حجیت کا انکار کرتا ہے، وہ علم دین کا انکار کرتا ہے، رکن اسلام کو منہدم کرتا ہے۔ اور اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اُتار پھینکتا ہے۔

۲۔ ایسی سنت متواترہ جو قرآن کی تفسیر نہیں کرتی، نہ ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن ایسے حکم کو بتاتی ہے جو قرآن میں صراحتہً مذکور نہیں ہے۔ جیسے زانی کے لئے (جبکہ شادی شدہ ہو) سنگ سار کی سزا، یا نصاب سرقہ کی تعیین، تمام سلفِ اُمّت اس قسم کی سنت پر بھی عمل ضروری سمجھتے ہیں، سوائے خوارج کے۔"

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر سے مروی سُنتیں، تلقّی بالقبول کی حیثیت سے یا یہ کہ ثقات نے ان کو روایت کیا ہے۔ ان کے بارے میں بھی اہل علم فقہ وحدیث وتصوف کا اتفاق ہے کہ ایسی حدیثیں قابلِ قبول ہیں، اور ان کی اتباع واجب ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حیات ابن تیمیہؒ مؤلفہ شیخ ابو زہرہؒ بحوالہ الرسائل والمسائل تصنیف امام ابن تیمیہؒ ج ۷ ص ۲۰ مع تعلیقات الشیخ عطاء اللہ حنیفؒ ص ۶۷۴، اس بارے میں راجح مسلک یہی ہے کہ اس قسم کی احادیث سے قرآن مجید کے عموم کی تخصیص ہو سکتی ہے، خواہ بظاہر یہ روایت ظاہر قرآن کے خلاف ہی پڑتی ہو تب بھی حدیث پر عمل کیا جائے گا۔ اس بات کی مزید وضاحت امام شافعیؒ نے اس طرح کی ہے:

اِنَّ قَوْلَ مَنْ قَالَ، تُعْرَضُ السُّنَّۃُ عَلَی الْقُرْاٰنِ، فَاِنْ وَافَقَتْ ظَاهِرَہٗ وَاِلَّا اسْتَعْمَلْنَا ظَاهِرَ الْقُرْاٰنِ وَتَرَکْنَا الْحَدِیْثَ جَهْلٌ الخ (تعلیقات

الشیخ عطاء اللہ حنیفؒ بر حیات امام ابن تیمیہؒ ، اُردو ص ۶۷۵
بحوالہ اختلاف الحدیث بر حاشیہ کتاب الام ج ۷ ص ۴۵)
یعنی یہ شرط لگانا کہ سنت کو قرآن مجید پر پیش کیا جائے اور سنت کا قرآن مجید سے موازنہ کیا جائے پھر جو حدیث ظاہر قرآن کے خلاف ہو اُسے رد کر دیا جائے اور جو موافق ہو اُسے قبول کر لیا جائے یہ اندازِ فکر عدم واقفیت پر مبنی ہے۔

مجدّد اُلف ثانی اور حدیث نبویؐ

امام ربانی حضرت شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندی مجدّد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سنّت کی زبردست حمایت کرتے ہوئے شعائرِ شرک، اور غیر اسلامی ہندی رسم و رواج کا شدت سے مقابلہ کیا، بدعتِ حسنہ کی مطلقاً تردید کی، وحدۃ الوجود پر سخت نکیر کی، سنت پر عمل، اور بدعت سے کھلی ہوئی جنگ کی دعوت دی، اور ایک موقعہ پر وہ تاریخی الفاظ تحریر فرمائے جو اس قابل ہیں کہ ان کو بار بار نقل کیا جائے:

مخدوما، فقیر را تابِ استماعِ امثالِ ایں سخناں نیست، بے اختیار رگِ فاروقیم در حرکت می آید و فرصت تاویل و توجیہ آں نمی دہد، قائل آں سخناں شیخ کبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر شامی، کلام محمد عربی علیہ وعلی آلہ الصلاۃ والسلام در کار است نہ کلام محی الدین ابن عربی وصدر الدین قونوی وعبد الرزاق کاشیٔ مارا بنص کا

مخدوما! فقیر کو ایسی باتوں کے سننے کی تاب نہیں، بے اختیار میری رگِ فاروقی حرکت میں آجاتی ہے، اور تاویل و توجیہ کا موقعہ نہیں دیتی، ایسی باتوں کے قائل شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی، ہمیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی ضرورت ہے نہ کہ محی الدین بن عربی، صدر الدین قونوی، عبدالرزاق کاشی کے کلام کی

کار لیست نہ "بفص" "فتوحات مدینہ" از "فتوحات مکیہ" مستغنی ساختہ است[1]۔

ہمیں نصوص کی ضرورت ہے، نہ کہ فصوص[2] کی، فتوحات مدینہ نے ہمیں فتوحات مکیہ[3] سے بے نیاز کردیا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حدیث نبویؐ

شاہ ولی دہلویؒ وفات ۱۱۷۹ھ تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف، ان چاروں علوم میں مہارت رکھتے ہیں اور ان سب کے بارے میں ان کی مشہور و معروف تصانیف موجود ہیں۔

حدیث کی عظمت و اہمیت کے بارے میں اپنی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

۱ - منها أن جماعة من الفقهاء زعموا أنه يجوز رد حديث يخالف القياس، من كل وجه فتطرق الخلل إلى كثير من الاحاديث الصحيحة كحديث المصراة وحديث القلتين فلم يجد اهل الحديث سبيلا فى الزامهم الحجة إلا أن يبيّنوا انها توافق المصالح المعتبرة فى الشرع الخ حجة الله البالغه ۱۰/۱ طبع لاهور۔

ان اغراض و مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ فقہاء کے ایک گروہ نے خیال کیا ہے کہ جو حدیث قیاس کے خلاف ہو اس کو رد کردینا جائز ہے اس نظریہ کے ماتحت بہت سی احادیث شک و شبہ کا شکار ہوگئیں۔

مثلاً حدیث مُصرّاۃ اور حدیث قلتین، اس صورت حال میں محدثین کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان فقہاء پر یہ حجت قائم کریں کہ اس قسم کی احادیث اُن مصالح کے موافق ہیں جو شریعت میں معتبر ہیں۔"

۲ - صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی اہمیت و عظمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

[1] مکتوبات امام ربانی۔ مکتوب نمبر ۱۰۰ ج ۱ ص ۱۲۲ مطبوعہ نولکشور کانپور ۱۹۰۶ء [2] ابن عربی کی مشہور کتاب "فصوص الحکم" کی طرف اشارہ ہے، [3] ابن عربی کی دوسری مشہور کتاب "الفتوحات المکیہ" کی طرف اشارہ ہے،

أما الصحيحان فقد اتفق المحدثون على أن جميع ما فيهما من المتصل المرفوع صحيح بالقطع، وانهما متواتران الى مصنفيهما وأنه كل من يهوّن امرهما فهو مبتدع، متبع غير سبيل المؤمنين الخ

(حوالہ مذکور ج ا صـ ۱۳۴)

صحیحین (صحیح بخاری، صحیح مسلم) کا معاملہ یہ ہے کہ محدثین کرام نے اتفاق رائے سے یہ طے کیا ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جو احادیث متصل مرفوع پائی جاتی ہیں وہ قطعی طور پر صحیح ہیں، اور یہ دونوں متواتر طریقے کے ساتھ اپنے مصنفین (امام بخاری و مسلم) سے مربوط ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ جو شخص بھی ان دونوں کا درجہ گھٹانے کی کوشش کرے گا، اور ان کے ساتھ توہین و تحقیر سے پیش آئے گا تو وہ بدعتی ہے اور ایمان والوں کی راہ چھوڑ کر دوسرے راستے کی پیروی کرنے والا ہے۔

تمام علوم میں سب سے افضل اور اعلیٰ جس کو دین کی بنیاد سمجھنا چاہیئے، علم حدیث ہے جس میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ اقوال وافعال کو محفوظ رکھا گیا ہے اور اس میں وہ واقعات بھی لکھے ہیں، جو آپؐ کے سامنے ہوئے، اور آپؐ نے اپنے سکوت سے اس کے مباح ہونے پر مہر تصدیق ثبت فرما دی آپ کے یہ افعال واقوال اور آپ کا یہ سکوت ہمارے لئے مشعل راہ ہیں، جن کی روشنی میں اگر ہم اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ طے کرنا چاہیں، تو منزل مقصود تک پہنچنے میں قطعاً کوئی شک باقی نہیں رہتا، اس راستہ پر چلنے والے کے لئے صراط مستقیم سے بھٹک جانے کا کوئی خطرہ نہیں، جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر عمل کیا وہ راہ یاب ہوا، اور جس نے اس سے منہ پھیرا وہ یقیناً گمراہ ہے، اس پر عمل کرنے میں خیر کثیر ہے، اور اس پر عمل نہ کرنا خُسرانِ مبین ہے، آنحضرتؐ کے کلام میں (جس کا دوسرا نام حدیث ہے) امر و نہی، یا بالفاظ دیگر احکام شرعیہ کی تشریح ہے، آپؐ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ حدیث کو بھی قرآن مجید کی طرح اہمیت حاصل ہے اور احادیث نبویہ کی مقدار، احکام قرآنی کے برابر یا اس سے بھی زائد ہے۔

چراغ راہ اسلامی قانون نمبر صـ۹۳ بحوالہ ... حجۃ اللہ البالغہ، ترجمہ از مولانا عبد الرحیم صاحب ج ا ص ۱۲۷

۴۔ طبقاتِ کتب حدیث کے عنوان سے شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

واضح ہو کہ ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے علاوہ اور ایسا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ جس میں شریعت کے احکام معلوم کئے جائیں، جہاں تک مصالح کا تعلق ہے وہ غور و فکر اور

تجربہ سے بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں، ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث معلوم کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے کہ وہ روایتیں بہم پہنچیں، جن کی سند آپ تک پہنچتی ہو۔ اصل کتاب کے الفاظ یہ ہیں۔

إعلم لا سبيل لنا إلى معرفة الشرائع والاحكام الاخبار النبي صلى الله عليه وسلم بخلاف المصالح فانها قد تدرك بالتجربة والنظر الصادق والحدس ونحو ذالك، ولا سبيل لنا الى معرفة اخباره صلى الله عليه وسلم الا تلقى الروايات المنتهية اليه بالاتصال والعنعنة۔

(حجة الله البالغه ج ۱ ص ۱۳۲ طبع لاہور)

الشیخ محمد عبدہ، علامہ رشید رضا اور سنت نبوی

۱۔ یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول الآیہ کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ رشید رضا لکھتے ہیں:

قال الاستاذ (اى محمد عبده) أمر بطاعة الله وهى العمل بكتاب الله العزيز وبطاعة الرسول لانه هو الذى يبيّن للناس ما نُزل إليهم، وقد أعاد لفظ الطاعة لتاكيد اطاعة الرسول الخ

۲۔ فإن تنازعتم في شئ فردوه إلى الله والرسول الآية:

وذالك ان يعرض على كتاب الله وسنة رسوله وما فيهما من القواعد العامة والسيرة المطّردة فما كان موافقا لها علم أنه صالح لنا ووجب الأخذ به وما كان منافرًا، عُلِم أنّه غير صالح ووَجب تركه وبذالك يزول التنازع وتجتمع الكلمة الخ

(تفسیر المنار ج ۵ ص ۱۸۲-۱۸۰)

۱۔ استاذ محمد عبدہ نے فرمایا کہ (اس آیت میں) اللہ تعالٰے نے انہیں اطاعت کا حکم دیا ہے، اس حکم کی تعمیل اللہ تعالٰے کی کتاب پر عمل پیرا ہونے سے ہو سکتی ہے اور طاعۃ رسول کا حکم دیا ہے اس لئے کہ آپ ہی نازل شدہ وحی کی وضاحت فرماتے ہیں، اس آیت میں "اطاعت" کا لفظ دوبارہ لایا گیا ہے، تاکہ اطاعتِ رسول کی تاکید واضح ہو جائے۔

۲ - اگر تمہارا آپس میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کی طرف رجوع کرو، اور جو عام قواعد وضوابط اور وسیع سیرت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، اُسے رہنما بناؤ، جو معاملہ کتاب وسنت کے موافق ہو۔ وہ ہمارے لئے مفید ہے تو اُسے اختیار کرنا ضروری ہے اور جو کام ان دونوں کے منافی ہو تو وہ ہمارے لئے مفید نہیں ہے تو ایسے کام کو ترک کرنا ضروری ہے۔ اس طریقے سے نزاع ختم ہو جائے گا اور ایک کلمہ پہ اُمت کی وحدت قائم ہو جائے گی۔

علّامہ اقبال اور سُنّتِ نبویؐ

عام طور پہ ایک گروہ علامہ اقبال کو منکرینِ سنت میں سے شمار کرتا ہے۔ حالانکہ ان کی نثر ونظم گواہ ہے کہ وہ دینِ مبین میں سنّت کو شرعی حجت مانتے تھے۔

چند شواہد ملاحظہ ہوں،

۱ - ایک خط میں نشانِ ہلال کے بارے میں حدیث سے استدلال کرتے ہیں، تمام اُمت کا صدیوں سے اس پہ اجماع ہے۔ جن اسلامی قوموں کا نشان اور ہے، وہ اس نشان پہ کبھی معترض نہیں ہوئیں، اور حدیث صحیح ہے کہ میری اُمّت کا اجماع ضلالت پہ نہیں ہوگا۔ اس واسطے اس کو (یعنی نشانِ ہلال) کو ضلالت تصوّر کرنا درست نہیں ہے۔ اقبال نامہ ج ۱ ص ۳۳۷

۲ - ان (احادیث) میں، ایسے بیش بہا اصول ہیں کہ سوسائٹی باوجود اپنی ترقی اور تعلّی کے اب تک ان کی بلندیوں تک نہیں پہنچی، حوالہ مذکورہ صـ۱۰۲

۳ - ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان (علامہ اقبال) کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "اصحاب ثلاثہ" (حضرات ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم) کے ساتھ اُحد (پہاڑ) پر تشریف رکھتے تھے، اتنے میں اُحد لرزنے لگا، اور حضورؐ نے فرمایا کہ "ٹھہر جا" تیرے اوپہ ایک نبیؐ، ایک صدیقؓ اور دو شہیدوںؓ کے سوا کوئی نہیں ہے۔" اس پہ پہاڑ ساکن ہوگیا، اقبال نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے؟ میں اسکو استعارہ، مجاز نہیں بلکہ ایک مادّی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے لئے کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے، اگر تم حقائق سے آگاہ ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی کے نیچے، مادّے کے بڑے بڑے تودے بھی لرز اٹھتے ہیں، مجازی نہیں واقعی لرز اٹھتے ہیں۔"

(روحِ اقبال صـ۳۸ نیز اقبال کامل صـ۶۴ تا صـ۶۶)

۴ - شعر اقبال ہے از بلاترسی حدیث مصطفی است مرد را روز بلا روز صفا است

چراغ راہ اسلامی قانون نمبر بحوالہ اقبال نامہ ج ا ص ۱۵۲

مسلمانوں کے زوال کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب سنت نبوی کو چھوڑ دینا ہے ۔

تا شعارِ مصطفٰی از دست رفت

قوم را رمزِ حیات از دست رفت

(حوالہ مذکور)

لانبی بعدی ز احسان خدا است

پردہ ناموس دین مصطفٰی است

از تلمیحاتِ اقبال مؤلفہ پروفیسر ڈاکٹر اکبر حسین صاحب بحوالہ رموز بے خودی ص ۱۰۲

اسی شعر میں اسی روایت کی طرف اشارہ ہے ۔

عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِعَلِیٍّ اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی، اِلَّا اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (مشکوٰۃ صفحہ ۵۶۳ بحوالہ بخاری، مسلم)

یعنی حضرت سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا کہ تم میرے لئے ایسے ہو جیسے حضرت موسیٰ کے لئے ہارون تھے اِلّا یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے ۔

آں امنّ الناس بر مولائے ما آں کلیم اول سینائے ما

(حوالہ مذکور ص ۱۵۶)

اس شعر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل میں جو روایت ہے، اس کی طرف اشارہ ہے ۔

اِنَّ مِنْ اَمَنِّ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِہٖ اَبُوْبَکْرٍ، وَلَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَکْرٍ خَلِیْلًا، (مشکوٰۃ ج ص ۵۵۴ بحوالہ بخاری، مسلم)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں میں حسن سلوک کے اعتبار سے سب سے زیادہ احسان مجھ پر ابوبکر نے کیا ہے، اگر میں کسی کو (اللہ تعالیٰ کے علاوہ) خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا ۔

مزید ایک شعر ملاحظہ ہو

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

گر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است ،

مکتوب گرامی حافظ محمد صاحب محدث گوندلوی رحمہ اللہ

محمد گوندلوی آبادی حاکم رائے گل حسن شاہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بمطالعہ عزیزم مولوی عبدالغفار صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ وعافاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ آپ کا لفافہ ملا ۔ آپ کے مکتوب سے آپ کی محبتِ حدیث معلوم ہوتی ہے۔ اللھم زد فزد ۔

ماہنامہ "ترجمان القرآن" سے مسلکِ[1] اعتدال کو نقل کر کے بھیجا ہے۔ اس پر مفصل تنقید کے لئے کتبِ اصولِ حدیث کی ضرورت ہے۔ "ترجمان" میں جو جزئیات حالات ائمہ میں اختلافات کا ذکر کیا ہے ان کے جواب کے لئے کتب اسماء الرجال کی مفصل عبارت کا دیکھنا نہایت ضروری ہے۔ بہرکیف اس بے سرو سامانی کی صورت میں مختصر جواب عرض کر دیتا ہوں۔

حفاظتِ حدیث کے متعلق دو نظریئے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ بمضمون إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۔ شریعت کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسے اسباب پیدا کر دیئے جائیں جن کی بنا پر قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ضروری باتیں محفوظ ہو جائیں۔ پس اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے متعلق یہ اسباب پیدا کر دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لکھوا دیا اور لوگوں نے آپ کے زمانے میں بلفظہ یاد کر لیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد ایک جلد میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لکھ لیا گیا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس کی مختلف نقلیں کروا کر مختلف شہروں میں بھیجدی گئیں۔ اس کے بعد بذریعہ کاتبوں اور حافظوں کے ہم تک پہنچا۔

حفاظت حدیث :۔ بعض احادیث جن کا عمل کے ساتھ تعلق ہے۔ جیسے حج، زکوٰۃ

---

[1] دیکھئے "مسلک اعتدال" تفہیمات جلد دوم از مولانا مودودی رحمہ اللہ۔

نماز، اخلاق، معاملات، ان پر آپؐ نے عمل کیا۔ اس کے بعد صحابہؓ نے کیا۔ اس کے بعد تابعین نے وَھَلُمَّ جَرًّا۔ وہ احادیث جو ہم تک بذریعہ عمل پہنچیں اکثر حصہ ان کا متواتر ہے۔ پھر امتِ مسلمہ اہل سنّت کا ان پر اجماع ہے۔ بعض امور ان سے قرآن مجید سے بڑھ کر پایۂ ثبوت کو پہنچتے ہیں۔ مثلاً نماز کی تعداد، رکعات کی تعداد، ان میں افعالِ ضروریہ کی ترتیب ان کے لئے اذان واقامت کا ہونا یہ سب باتیں تواترِ عملی کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کا تواتر قرآن مجید سے بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ قرآن مجید صرف کاتبوں اور حافظوں کے واسطہ سے ہم تک پہنچا ہے اور یہ امور نماز پڑھنے والوں کے واسطہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ نمازیوں کی تعداد ہمیشہ کاتبوں اور حافظوں سے زیادہ رہتی ہے۔ پھر زکوٰۃ کے مسائل قرآن مجید کی طرح آنحضرتؐ نے لکھوا دیئے تھے۔ ان کی نقلیں لے کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عاملوں کو جو مختلف شہروں میں تحصیل زکوٰۃ کے لئے مقرر تھے، بھیجدیں۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے پاس بھی یہ مسائل لکھے ہوئے موجود تھے۔ مؤطا امام مالک میں حضرت عمرؓ کے خط کی نقل موجود ہے۔ حضرت علیؓ کے پاس فوجداری کے مسائل لکھے ہوئے تھے۔ بلکہ آنحضرتؐ نے خود فوجداری کے مسائل لکھ دیئے تھے۔ پھر زکوٰۃ کو حکومت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے ردو بدل سے محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح آپؐ نے جس سال حج کیا اس سال آپؐ کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ کے قریب آدمی تھے۔ پھر ہر سال خلفاء حج کرتے رہے یہاں تک کہ کتابتِ حدیث کا دور آ پہنچا۔ پس اکثر حصہ احادیث کا عملی رنگ میں تواتر کے ساتھ کتابتِ احادیث کے زمانہ میں پہنچ گیا۔ مگر عمل میں سستی کی وجہ سے مختلف شہروں میں کچھ اختلاف سا نظر آتا ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق رفع یدین۔ آمین بالجہر۔ وضع الیدین اور مقامِ وضع۔ جلسۂ استراحت میں اختلاف۔ اصل وجہ اختلاف کی یہ ہے کہ یہ امور قائلین کے نزدیک بھی سنّت ہی ہیں۔ سنّت کے چھوڑنے سے چونکہ انسان فاسق نہیں ہوتا اس لئے اس کا زیادہ اہتمام نہ کیا گیا۔ خصوصاً جب کہ نماز بھی امراء کے سپرد تھی۔ اُن کے ترک پر علماء نے انکار نہ کیا۔ آہستہ آہستہ امراء کی روش کا عام رواج ہو گیا۔ اس پر محدثین نے غور کیا۔ ان کی نظرِ ناقد نے دیکھا تعامل کے ساتھ دین کا تمامہ محفوظ رہنا مشکل ہے اس واسطے ضروری ہے کہ آنحضرتؐ کے طرزِ عمل کو ضبط کر لیا جائے۔ پس خلیفہ عمر بن عبد العزیز جو پہلی صدی کے آخر میں بنی امیّہ کے سلسلہ حکومت میں تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے تمام شہروں میں لکھ بھیجا کہ احادیث کو لکھ لیا جاوے۔ اگرچہ لکھنے کا

رواج ان سے قبل بھی تھا۔ مگر شاہی حکم نئے نہ تھا۔

پس ان اختلافی امور میں رفع یدین کی احادیث تواتر کو پہنچتی ہیں۔ اور رفع الیدین کی حدیث صحاحِ ستّہ کی سب کتابوں میں موجود ہے۔ بلکہ امام مالک جن سے ان کے خلاف عمل مروی ہے وہ بھی اس کو اپنی کتاب میں لائے ہیں۔ باقی آمین بالجہر اور جلسہ استراحت اور مقامِ وضع یہ تین مقام ایسے ہیں جن میں روایتیں متواتر نہیں مگر صحیح ضرور ہیں۔ اسی طرح مسئلہ فاتحہ خلف الامام کا ہے پس ان چار مقام میں مولوی صاحب کی بحث چل سکتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ میں چند مسائل میں اختلاف ہے۔ دلائل طرفین میں موجود ہیں۔ پس اکثر حصہ شریعت کا تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور جو تواتر کے ساتھ ثابت نہیں ان سے بعض مسائل اجتماعی ہیں۔ پس مولوی صاحب کی بحث صرف اختلافی مسائل کی ان احادیث میں چل سکتی ہے جو تواتر کے ساتھ نہیں آئیں۔ پھر جو احادیث صحیحین میں موجود ہیں اور ان پر کسی محدث متاخر نے تنقید نہیں کی ان کی صحت پر محدثین کا اجماع ہے۔ یہ بحث ان میں بھی نہیں چل سکتی۔ کیونکہ اجماع کی بنا پر ان کی صحت قطعی اور ان کے مضمون کا ثبوت بھی قطعی ہو جاتا ہے۔ جیسے اس پر "دراسات اللبیب" میں مفصل بحث موجود ہے۔ پس اب دین کا وہی حصہ باقی رہ گیا جو اس سے باہر ہو۔ اور وہ بالکل قلیل ہے۔ ان میں بھی احادیثِ صحیحہ موجود ہیں۔ صاحبِ ترجمان کی بحث کا تعلق صرف انہی چند معدودے احادیث کے ساتھ ہے۔ پس شرعی نقطہ نظر سے ان احادیث کے قطعی ہونے میں بھی کلام نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اگرچہ عقلاً ان احادیث کے مضامین کے قطعی ہونے میں کلام ہو سکتا ہے، وہی باتیں جو صاحبِ ترجمان نے ذکر کی ہیں وہی اور اس قسم کی اور باتیں ذکر کی جا سکتی ہیں۔ مگر عقلاً کسی انسان کے بیان و تحقیق میں غلطی کا امکان ہونا الگ چیز ہے اور نفس الامر میں غلطی کا وقوع امر دیگر ہے۔ اس کی مثال خبر متواتر ہے۔ خبر متواتر چونکہ مجموعۂ احاد ہے اور ہر واحد میں خطا کا امکان ہے لہذا مجموعہ میں بھی خطا کا امکان ہے۔ امکانِ خطا امرِ دیگر ہے اور وقوعِ خطا امرِ دیگر ہے۔ دوسری مثال انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ ان سے بلحاظ بشریت خطا ہر مسئلہ میں ممکن ہے اور اسی خطا پر ان کا دوام بھی ممکن ہے مگر جن امور کا تعلق رسالت کے ساتھ ہے ان میں ان کا خطا پر دوام واقع کے خلاف ہے اور

اپنے منشا کے خلاف ہونے کی صورت میں ردّ کرنا تھا۔

کسی حدیث کا عقل کے خلاف ہونے کی صورت میں قابلِ ردّ ہونا امر مسلّم ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ احادیث جب محدثین کے طریق پر صحیح ہو جائیں تو پھر عقل کیخلاف ہوتی ہیں بلکہ حدیث جب بھی صریح عقل کے خلاف ہو تو ضرور ہے کہ محدثین کے نزدیک بھی وہ صحیح نہ ہوگی۔ یہ بحث تھی شرعی نقطۂ نظر سے۔

بحث کی دوسری شکل تحقیقاتِ عقل ہے۔ اس پر اعتماد کرنے سے عام طور پر بعض الناس غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس وقت اس پر بحث کی گنجائش نہیں۔

باقی جو سلف کے اقوال ایک دوسرے کے بارے میں نقل کئے گئے ہیں بعض فی نفسہٖ صحیح ہیں۔ مثلاً ایک نے اگر دوسرے پر جھوٹ کا الزام لگایا ہے تو اس سے جھوٹ عمداً بولنا مراد نہیں لیا ہے بلکہ نفس الامر خلاف بات کہنا لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ نفس الامر کے خلاف بات کہنا عمداً موجب جرح ہے اور سہواً اگر کبھی کبھی ہو تو جرح نہیں۔ اس سے کوئی انسان نہیں چھوٹتا اور محدثین نے تنقید کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ کلام رواۃ کے بارے میں اس وقت مفید ہوتا ہے جب کسی عداوت یا جوشِ غضب کی بنا پر نہ ہو۔ ان باتوں کی تصریح محدثین کے کلام میں موجود ہے۔ امام زہریؒ کا ریمارک جمیع اہل مکہ کے لئے نہیں۔ اسی طرح ابراہیم کا بلا نسبت مسئلہ کو بیان کرنا کوئی جرح نہیں۔ اسی طرح ابراہیم کا شعبی کو کذّاب کہنا اس معنے سے کہ واسطہ کو بیان نہیں کیا اس طرح کی جرح جرح نہیں گرچہ قائل سچّا ہے۔ امام مالکؒ کا اہلِ عراق کے متعلق فرمانا اس بنا پر تھا کہ وہ ان کے حالات کو پوری طرح جانتے نہ تھے اور جس راوی کا حال معلوم نہ ہو اس کی حدیث کو سب محدثین واجب التوقف قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح حماد کا یہ کہنا کہ اہلِ حجاز کو علم نہیں اس سے مراد اُن کے نزدیک استنباطی مسائل ہیں۔

میں سرِدست اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ والباقی باق۔ اور بقی الخبایا فی الزوایا۔

اپنے منشا کے خلاف ہونے کی صورت میں رد کرنا تھا۔

کسی حدیث کا عقل کے خلاف ہونے کی صورت میں قابلِ رد ہونا امر مسلّم ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ احادیث جب محدثین کے طریق پر صحیح ہو جائیں تو پھر عقل کیخلاف ہوتی ہیں بلکہ حدیث جب بھی صریح عقل کے خلاف ہو تو ضرور ہے کہ محدثین کے نزدیک بھی وہ صحیح نہ ہوگی۔ یہ بحث تھی شرعی نقطۂ نظر سے۔

بحث کی دوسری شکل تحقیقاتِ عقل ہے۔ اس پر اعتماد کرنے سے عام طور پر بعض الناس غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس وقت اس پر بحث کی گنجائش نہیں۔

باقی جو سلف کے اقوال ایک دوسرے کے بارے میں نقل کئے گئے ہیں بعض فی نفسہٖ صحیح ہیں۔ مثلاً ایک نے اگر دوسرے پر جھوٹ کا الزام لگایا ہے تو اس سے جھوٹ عمداً بولنا مراد نہیں لیا ہے بلکہ نفس الامر خلاف بات کہنا لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ نفس الامر کے خلاف بات کہنا عمداً موجب جرح ہے اور سہواً اگر کبھی کبھی ہو تو جرح نہیں۔ اس سے کوئی انسان نہیں چھوٹتا اور محدثین نے تنقید کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ کلام رواۃ کے بارے میں اس وقت مفید ہوتا ہے جب کسی عداوت یا جوشِ غضب کی بنا پر نہ ہو۔ ان باتوں کی تصریح محدثین کے کلام میں موجود ہے۔ امام زہریؒ کا یہ مارک جمیع اہل مکہ کے لئے نہیں۔ اسی طرح ابراہیمؒ کا بلا نسبت مسئلہ کو بیان کرنا کوئی جرح نہیں۔ اسی طرح ابراہیم کا شعبی کو کذّاب کہنا اس معنے سے کہ واسطہ کو بیان نہیں کیا اس طرح کی جرح جرح نہیں گرچہ قائل سچّا ہے۔ امام مالکؒ کا اہل عراق کے متعلق فرمانا اس بنا پر تھا کہ وہ ان کے حالات کو پوری طرح جانتے نہ تھے اور جس راوی کا حال معلوم نہ ہو اس کی حدیث کو سب محدثین واجب التوقف قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح حماد کا یہ کہنا کہ اہل حجاز کو علم نہیں' اس سے مراد اُن کے نزدیک استنباطی مسائل ہیں۔

میں سردست اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ والباقی باق۔ اور بقی الخبایا فی الزوایا۔

روایت اور درایت

از : مولانا حافظ عبد اللہ روپڑی رحمۃ اللہ علیہ

محدثین اور فقہاء کے فیصلے یکساں نہیں قرار پا سکتے۔ ان دونوں میں کئی وجوہ سے فرق ہے۔

(۱) مجتہد کا اجتہاد زیادہ تر احادیث ہی میں ہوتا ہے جن میں اجتہادی دخل کی وجہ سے خطا کا امکان ہوتا ہے۔ پھر اس اجتہادی چیز میں اجتہاد، خطا کا ڈبل امکان پیدا کر دیتا ہے تو لامحالہ فیصلہ مجتہد فیصلہ محدث سے مرتبۃً مؤخر ہوا۔

(۲) اور اگر یہ مجتہد زمانہ سابق میں گذرا ہے تو پھر اس کا اجتہادی فیصلہ روایۃً ہی ہم تک پہنچیگا۔ ایسی صورت میں خطا کے امکانات خالص محدثانہ فیصلے سے بمراحل بڑھ جاتے ہیں۔

(۳) محدثانہ تعدیل و تضعیف کا زیادہ تر حکم محسوسات اور مشاہدات پر ہوتا ہے۔

(و عباد الرحمٰن الذین الخ۔ اذا رأیتم احدا یتعاھد المسجد فاشھدوا له بالایمان[1] یہ ضروری نہیں کہ تمام اجتہادی چیزیں مرتبۃً برابر ہوں) قدرے اجتہاد کا بھی دخل ہو سکتا ہے۔ بخلاف فیصلہ مجتہد کے کہ اس کا سارا دار و مدار رائے اور عقلیت پر ہوتا ہے جس میں خطا کا امکان زیادہ ہے۔

روایت سے زیادہ درایت میں غلطی کا امکان ایسی حقیقت ہے جس سے کسی سلیم العقل کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے کہا اذا صح الحدیث فھو مذھبی اور یہی وجہ ہے کہ امام صاحب حدیث صحیح تو کجا حدیث ضعیف کے مقابلہ میں بھی رائے و قیاس کے

(۱) ترمذی۔ ابواب الایمان۔ باب حرمۃ الصلاۃ ج ۸ ص ۹۰؟۔ سنن الترمذی مع تحفۃ الاحوذی، ابن ماجہ مع تحقیق فؤاد عبد الباقی ص ۲۶۳۔ مسند احمد ج ۳ ص ۶۸، ابن خزیمہ ج ۲ ص ۳۷۹۔

کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ (عدم فساد الصوم حین اکل ناسیا قال ابو حنیفۃ لولا الروایۃ لقلت بالقیاس۔)

اور جیسا کہ حدیث قہقہہ سے معلوم ہوتا ہے۔ حجۃ اللہ ص۱۲۹ محض رائے و قیاس سے ظاہر حدیث کو ترک کرنا الگ چیز ہے اور قرائن و امارات اور کتاب و سنت کی دوسری معلومات واضحہ کی بنا پر ظاہر حدیث کا ترک امر دیگر ہے۔ ثانی الذکر طریقہ کچھ حدیث کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ ظاہر قرآن بھی چھوڑا جا سکتا ہے مثلاً فرمایا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ۔ حالانکہ ایک وضوء سے پانچوں نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ آگے قرینہ موجود ہے۔ وَلٰکِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَھِّرَکُمْ۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے زمانہ قحط میں چور کے ہاتھ نہیں کاٹے۔ (اعلام ص۱۷ ج ۲)۔

یہ قول درست نہیں کہ فقہاء نے صحیح الاسناد روایت کو محض درایت کی بنا پر ترک کر دیا بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ فقہائے نے حدیث نہ پہنچنے کی صورت میں عمومات قرآن و سنت سے استنباط کیا۔ کیونکہ ابتداءً محض ہر ہر بستی کی احادیث جمع ہوئی تھیں امام بخاری کے زمانہ میں پوری طرح استقصا کیا گیا۔

وکان الرجل لا یتمکن الا من جمع حدیث بلدہ واصحابہ۔ (الانصاف لولی اللہؒ ص۳۳)

تضعیف و توثیق محدثین میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ایک کو قوی سند سے پہنچی اور دوسرے کو ضعیف سند سے یا اوّل کو شواہد و متابعات مل گئے۔ دوسرے کو حاصل نہ ہو سکے۔

فقہ اور حدیث کے درمیان فرق

(۴) فقیہ کو اپنے اجتہاد پر وہ اعتماد نہیں ہوتا[1] جو محدث کو اپنی روایت پر ہوتا ہے المحدثون اتفقوا علی وجوب العمل بکل ما صح۔ حدیث قطعیت میں مثل قرآن ہے شبہ محض نقل کی وجہ سے ہے۔

قال السخاوی احتج رحمہ اللہ ای الامام احمد بالضعیف حیث لم یکن فی الباب وغیرہ وتبعہ ابو داؤد وقدماہ علی القیاس ویقال عن ابی حنیفۃ مثل ذلک۔ وعن الشافعیؒ یحتج بالمرسل اذا لم یجد غیرہ (فتح المغیث ج ۱ ص۸۲) قال عبد الحی الکھنوی فی شرح المختصر۔ لان الخبر یقین باصلہ محتمل فی کل وصف علی الخصوص فکان الاحتمال فی الرائ اصلاً و فی الحدیث عارضا فلا بد ان یقدم الحدیث علی القیاس۔

---

[1] قال ابو حنیفۃ ھذا الذی نحن فیہ رائ ولا نجبر علیہ احدا ولا نقول یجب علی احد قبولہ۔ حجۃ اللہ۔

مفتی اعظم پاکستان کا مکتوبِ گرامی

اس مکتوبِ گرامی کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۵۸ء میں طلبہ کی ایک تربیت گاہ میں جو کیماڑی کے قریب منوڑا میں منعقد ہوئی تھی' اس میں راقم الحروف کو درس حدیث کے لئے اور حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم و مغفور کو تدوین فقہ کے عنوان پر خطاب کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔

محترم مفتی صاحب مرحوم کے خطاب میں شرکت اور استفادے کا مجھے بھی موقع ملا۔ مفتی صاحب مرحوم نے اپنے خطاب کے دوران فرمایا کہ ہندوستان کے علماء کرام نے گذشتہ دور میں تقلیدِ شخصی کو بطور تدبیر اختیار کیا تھا نہ کہ بطور تشریع"۔

کچھ عرصہ کے بعد راقم الحروف نے اس جملہ کی مزید وضاحت کے لئے عریضہ ارسال کیا تو مفتی صاحب مرحوم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ :-

" آپ نے جو کیماڑی کی میری ایک تقریر کا ذکر کیا ہے اور اس میں یہ جملہ کہ "تقلیدِ شخصی کو بطور تدبیر اختیار کیا گیا تھا نہ کہ بطور تشریع" یہ جملہ میرا نہیں تھا بلکہ ہمارے رئیس الطائفہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا تھا"۔

مکتوب گرامی از مفتی صاحب مرحوم بنام مؤلف کتاب بتاریخ ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ از کراچی' اصل خط میرے پاس محفوظ ہے۔

اس خط کے شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ

۱۔ اہل حدیث اور احناف کے درمیان اختلافات کی وسیع خلیج پائی جاتی ہے اس کو پاٹا جاسکتا ہے اور از سرِ نو مثبت طور پر محبت و اخوت کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے۔ اور باہمی ربط و ضبط اور میل ملاپ میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ خبر واحد کے رد و قبول کے بارے میں محدثین اور فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اس میں بہت حد تک کمی آسکتی ہے اور متأخرین فقہاء حنفیہ کے اس طرز عمل پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے کہ بعض روایات کو قرآن مجید یا قیاس کے خلاف ہونے کی بنا پر رد کیا جا سکتا ہے۔ اور اس راجح مسلک کو اختیار کیا جا سکتا ہے کہ ہر صحیح الاسناد حدیث لازماً قابل قبول ہے۔ اور اس طرح روایت و درایت کا نزاع بھی ختم ہو سکتا ہے۔ اس بارے میں مزید تفصیل حضرت مولانا حافظ عبد اللہ صاحبؒ روپڑی امرتسری کے مکتوبِ گرامی میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

علامہ محمد اسد اور حدیث نبویؐ

علامہ محمد اسد لکھتے ہیں :۔

" آج جبکہ اسلامی ممالک میں مغربی تہذیب کا اثر و نفوذ بہت بڑھ چکا ہے، ہم ان لوگوں کے تعجب انگیز رویہ میں جن کو " روشن خیال مسلمان کہا جاتا ہے ایک اور سبب پاتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ ایک ہی وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنا اور زندگی میں مغربی تہذیب کو اختیار کرنا ناممکن ہے۔ پھر موجودہ مسلمان نسل اس کے لئے تیار ہے کہ ہر مغربی چیز کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور باہر سے آنے والے ہر تمدن کی اس لئے پرستش کرے کہ وہ باہر سے آیا ہے اور طاقتور اور چمکدار ہے۔ مادی اعتبار سے یہ افرنگ پرستی ہی اس واقعہ کا سب سے بڑا سبب ہے کہ آج احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سنت کا پورا نظام رواج نہیں پا رہا ہے۔ سنت نبوی اِن تمام سیاسی افکار کی کھلی اور سخت تردید کرتی ہے، جن پر مغربی تمدن کی عمارت کھڑی ہے، اس لئے وہ لوگ جن کی نگاہوں کو مغربی تہذیب و تمدن خیرہ کر

چکا ہے، وہ اس شکل سے اپنے کو اس طرح نکالتے ہیں کہ حدیث و سنت کا بالکلیہ یہ کہکر انکار کر دیں کہ سنتِ نبوی کا اتباع مسلمانوں پر ضروری نہیں، کیونکہ اس کی بنیاد ان احادیث پر ہے جو قابلِ اعتبار نہیں ہیں، اور اس مختصر عدالتی فیصلہ کے بعد قرآن کریم کی تعلیمات کی تحریف کرنا اور مغربی تہذیب و تمدن کی روح سے انھیں ہم آہنگ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔"

فاضل مصنف محمد اسد نے اپنی کتاب میں جس کا عنوان ہے "اسلام دوراہے پر" اسلام دشمنی کے حقیقی اسباب اور اس سازش کی خطرناکی جو مسلم معاشرہ کو اس بے بدل قوت سے محروم اور اس بے نظیر خزانہ سے خالی کر دینا چاہتی ہے، بڑی اچھی تشخیص کی ہے، وہ کہتے ہیں:

"سنتِ نبویؐ ہی وہ آہنی ڈھانچہ ہے جس پر اسلام کی عمارت کھڑی ہے، اگر آپ کسی عمارت کا ڈھانچہ ہٹا دیں تو کیا آپ کو اس پر تعجب ہوگا کہ عمارت اس طرح ٹوٹ جائے جس طرح کاغذ کا گھروندا"

انکارِ حدیث کا اثر اور اتباعِ سنت کی ضرورت اور اس کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:—

"لیکن یہ اعلیٰ مقام جو اسلام کو اس حیثیت سے حاصل ہے کہ وہ ایک اخلاقی، عملی، انفرادی اور اجتماعی نظام ہے، اس طریقہ سے (یعنی حدیث اور اتباعِ سنت کی ضرورت کے انکار سے) ٹوٹ کر اور بکھر کر رہ جائیگا[1]

---

[1] اسلام دوراہے پر۔

معتزلہ، خوارج، اہل تشیع اور

سنّتِ نبوی ﷺ

معتزلہ، خوارج اور اہل تشیع اسلامی بنیادی عقائد کے بارے میں وسیع اختلاف رکھتے ہیں اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طور پر سنت کو شریعت کی بنیاد مانتے ہیں، اور حجت ودلیل تسلیم کرتے ہیں۔

معتزلہ اور سنّت نبوی ﷺ

علامہ زمخشری آیت فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ، کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، یعنی اگر تمہارے اور حکام کے درمیان نزاع واختلاف برپا ہو جائے تو اس معاملہ کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، یعنی اس معاملہ میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرو۔" (تفسیر کشاف ج ۱ صـ ۵۲۴)

فقہ جعفریہ کے حامی اور حدیثِ نبوی ﷺ

ولا خلاف فی أنّ الکتاب والسنة، هما الاصلان الاساسیان للتشریع .... لا یختلف اثنان من المسلمین فی أنّ اطاعة الله والرسول انما تکون بالعمل بکتاب الله وسنة نبیه ....

س وتسأل: لما ذا کرر لفظ الاطاعة عند ذکر الرسول ولم یکررها عند ذکر الأئمة،

الجواب للتنبیه علی أنّ اطاعة الرسول اصل بذاته تماما کاطاعة الله،

ومن هنا کان قول کل منهما، مصدرا من مصادر الشریعة، و لیس کذالك اطاعة اولی الامر الخ (التفسیر الکاشف لشیخ محمد جواد مغنیه ج ۲ صـ ۳۵۸)

ترجمہ :-

۱ - اُمّت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کتاب و سنت، قانون سازی کے لئے دو اصلی بنیادیں ہیں

۲ - مسلمانوں میں سے دو فرد بھی یہ اختلاف نہیں کرتے کہ اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ اللہ تعالےٰ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت پر عمل کیا جائے -

۳ - آپ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تذکرے کے وقت لفظ اطاعت کو دوبارہ لایا گیا ہے، لیکن "اولی الامر" کے ساتھ لفظ اطاعت کو نہیں ذکر کیا گیا، آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟

جواب :- اس اندازِ بیان کے ذریعے یہ بتلانا مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت فی نفسہٖ شریعت کی اصل بنیاد ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کو شریعت کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے، لیکن اولی الامر کی اطاعت کو یہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہے -

فرقہ زیدیہ اور سُنّتِ نبویؐ

۱ - سید العلوم ما یتعلق بکتاب اللہ وسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

- ما تبتنی السعادۃ الدنیویۃ والاخرویۃ وبہما یتم صلاح المجتمع الانسانی وعلیہما تتکئ الاخلاق الشریفۃ،

۲ - نحن نقول کتاب اللہ وسنۃ رسولہ ونفرق فیہما حسب الظاہر والا فانہما شیٔ واحد، غایۃ الامران الکتاب متعبد بلفظہ وتحدی اللہ بہ البشر فی ابان بلوغ اللغۃ العربیۃ اوج کمالہا ولا یزال یتحدا ہم، معجزۃ دائمۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واما السنۃ فیعمل باحکامہا بقطع النظر عن اعجاز اللفظ وعدمہ،

(مقدمۃ الروض النضیر ج ۱ ص۲)

ترجمہ :-

۱ - تمام علوم کا سردار وہ علم ہے جس کا تعلق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ دنیا و آخرت کی سعادت و کامیابی کی بنیاد یہی دونوں (کتاب و سنت) ہیں - انسانی معاشرہ کی صلاحیت ان دونوں ہی کے ذریعے کمال کو پہنچتی ہے، اور اچھے اخلاق کا سرچشمہ یہی دونوں ہیں -

۲ - کہتے ہیں "کتاب اللہ، اور سنت رسول اللہ" بظاہر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں شئ واحد ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ الکتاب (قرآن حکیم) کے الفاظ بھی تعبدی ہیں۔ یعنی عبادت میں یہ الفاظ بعینہ استعمال ہوتے ہیں۔ جس وقت عربی زبان (اپنی فصاحت و بلاغت کی بنا پر) اوج کمال پر تھی۔ اس وقت اللہ تعالےٰ نے تمام انسانوں کو تحدی (چیلنج) کیا تھا کہ وہ اس کے مثل لائیں) اور یہ ہمیشہ باقی رہے گی، یہ حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معجزہ ہے، لیکن سنت کا معاملہ دوسرا ہے، اس کے احکام پر عمل کیا جائے گا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اس کے الفاظ میں اعجاز ہے یا نہیں۔ یعنی قرآن کے الفاظ نماز میں پڑھے جا سکتے ہیں بلکہ ان کی قراءت ضروری ہے، لیکن سنت، حدیث کے الفاظ کی یہ شان نہیں ہے۔

خوارج اور سنتِ نبوی[۳]

امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ خوارج سے یہ بھی منقول ہے کہ :-
وہ قرآن کے علاوہ مفسرِ قرآن، سنت ہی مانتے ہیں"
تعلیقات مولانا عطاء اللہ حنیف بر حیاۃ ابن تیمیہ ص ۶۷۳ بحوالہ الرسائل والمسائل ج ۳ ص ۲۰ - اس قول سے اتنا اندازہ ہوا کہ خوارج بھی کسی نہ کسی درجہ میں سنت کی حجیت کے قائل ہیں۔

چند مستشرقین کی آراء

مولانا سید سلیمان ندوی اپنی بے نظیر کتاب "خطبات مدراس" میں لکھتے ہیں :-
"جان ڈیون پورٹ صاحب نے ۱۸۷۰ء میں انگریزی میں سب سے زیادہ ہمدردانہ کتاب Apology for Mohammad & the Quran محمد (صلعم) اور قرآن سے معذرت، لکھی ہے، اس کتاب کو وہ ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں :-
" اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مقننین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے، کہ جس کے وقائع عمری محمدؐ کے وقائع عمری سے زیادہ تر مفصل اور سچے ہوں "

ریورنڈ باسورتھ اسمتھ Bosworth Smith فیلو آف ٹرینٹی کالج اوکسفورڈ نے ۱۸۷۴ء میں "محمد اینڈ محمڈنزم" کے نام سے رائل انسٹیٹیوشن آف گریٹ برٹین میں جو لیکچر دیے تھے، کتاب کی صورت میں چھپے ہیں، ان میں ریورنڈ موصوف نے نہایت خوبی سے کہا ہے :-

"جو کچھ عام طور سے مذہب کی ابتدا نا معلوم ہونے کی نسبت صحیح ہے، وہی بدقسمتی سے ان تین مذہبوں اور ان کے بانیوں کی نسبت بھی صحیح ہے، جن کو ہم کسی بہتر نام موجود نہ ہونے کے سبب سے تاریخی کہتے ہیں، ہم مذہب کے اولین اور ابتدائی کارکنوں کی نسبت بہت کم اور ان کی نسبت جنہوں نے ان کی محنتوں میں بعد کو اپنی محنتیں ملائیں، شاید زیادہ جانتے ہیں، ہم زرتشت اور کنفیوشس کے متعلق اس سے کم جانتے ہیں، جو سولن اور سقراط کے متعلق جانتے ہیں، موسیٰ اور بودھ کے متعلق اس سے کم واقف ہیں جو ہم امبریس Ambrose اور سیزر کے متعلق جانتے ہیں۔ ہم درحقیقت مسیح کی زندگی کے ٹکڑے میں سے ٹکڑا جانتے ہیں، ان تیس۳ برس کی حقیقت سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے، جس نے تین سال کے لئے راستہ تیار کیا جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس نے دنیا کی ایک تہائی کو زندہ کیا ہے۔ اور شاید اور بہت زیادہ کرے "ایک آئیڈیل لائف" جو بہت دور بھی ہے اور قریب بھی، ممکن بھی ہے اور نا ممکن بھی، لیکن اس کا کتنا حصہ ہے، جو ہم جانتے ہی نہیں، ہم مسیحؑ کی ماں، مسیحؑ کی خانگی زندگی، ان کے ابتدائی احباب، ان کے ساتھ ان کے تعلقات، ان کے روحانی مشن کے تدریجی طلوع، یا ایک بیک ظہور کی نسبت ہم کیا جانتے ہیں؟ ان کی نسبت کتنے سوالات ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو ہمیشہ سوالات ہی رہیں گے۔

لیکن اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے۔ یہاں دھندلا پن اور راز نہیں ہے، ہم تاریخ رکھتے ہیں، ہم محمدؐ کے متعلق اس قدر جانتے ہیں، جس قدر لیوتھر اور ملٹن کے متعلق جانتے ہیں۔ میتھالوجی، فرضی افسانے، اور مافوق الفطرت واقعات ابتدائی عرب مصنفین میں نہیں، یا اگر ہیں تو وہ آسانی سے تاریخی واقعات سے الگ کئے جا سکتے ہیں، کوئی شخص یہاں نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے، اور نہ دوسرے کو، یہاں پورے دن کی روشنی ہے۔ جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے، اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے"[1]

---

[1] خطبات مدراس ص ۶۷-۶۸

اِسلام میں اِسناد کی اہمیّت

سند کا معنی

حدیث نبویؐ دو اجزاء پر مشتمل ہے،

(الف) سَنَد یا اِسناد،

(ب) مَتن۔ لغت میں "سند" کا معنی معتمد کے ہیں، کہا جاتا ہے فلانٌ سَنَدٌ ای معتمد۔ حدیث کی صحت وضعف کا مدار سند پر ہے، اس لئے راویانِ حدیث کے سلسلے کو سند کہا جاتا ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں سند کی تعریف ہے "اَلطَّرِیْقُ اِلیٰ الْمَتْنِ" یعنی متنِ حدیث تک پہنچنے کا ذریعہ اور راستہ۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تدریب الراوی للسیوطی ص۵)

متن کا معنی

متن حدیث سے مراد حدیث کی وہ عبارت ہے جو کلماتِ نبویہؐ پر مشتمل ہوتی ہے۔ تدریب میں ہے اَلْمَتْنُ ھُوَ اَلْفَاظُ الْحَدِیْثِ الَّتِیْ تَتَقَوَّمُ بِہٖ الْمَعَانِیْ۔ یعنی متن سے مقصود حدیث کے وہ الفاظ ہیں جن سے معانی کا وجود اور قوام حاصل ہوتا ہے۔ لغت میں سخت اور بلند زمین کو "متن" کہا جاتا ہے۔

اِسناد کی اہمیت قرآن میں

(۱) قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَھُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَآ اَوْ اَثٰرَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ

کہو کہ بھلا تم نے ان چیزوں کو دیکھا ہے جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو، (ذرا) مجھے بھی دکھاؤ کہ انھوں نے کونسی زمین پیدا کی ہے یا آسمان میں ان کی شرکت ہے، اگر سچے ہو تو

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ — اس سے پہلے کی کوئی کتاب میرے پاس لاؤ یا علم (انبیاء میں) سے کچھ منقول چلا آتا ہو تو اسے پیش کرو۔

(پ ۲۶ سورۃ الاحقاف آیت ۴)

اس آیت میں لفظ "اثارۃ" محل استدلال ہے، لفظ اثارۃ کی اصل "اثر" ہے جس کے معنی روایت کے ہیں اس کے تین مصدر مستعمل ہیں، اَثْرَةٌ اَثَارَةٌ اَثْرٌ۔ قاضی شوکانی فتح القدیر میں لکھتے ہیں،

اَصْلُ الْكَلِمَةِ مِنَ الْأَثَرِ وَهِيَ الرِّوَايَةُ، يُقَالُ آثَرْتَ الْحَدِيْثَ وآثره اثرة واثارة واثرا، اذا ذكرته عن غيرك وقال عطاء او شيء تأثرونه عن نبي كان قبل محمد صلى الله عليه وسلم، قال مقاتل او رواية من علم الانبياء۔ (تفسیر مذکور ج ۴۔ ص ۱۳)

یہ لفظ 'اثر' کے مادے سے ہے۔ جب کسی دوسرے سے بات نقل کی جائے اسی موقع پر یہ کلمہ بولا جاتا ہے۔ عطاء تابعی کہتے ہیں "یا کوئی ایسی چیز پیش کرو جس کو تم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی نبی سے روایت کرتے ہو"۔ مقاتل مفسر کہتے ہیں "یا علم انبیاء میں کوئی روایت پیش کرو"۔

قاموس میں ہے۔ الأثرة المكرمة لمتوارثة، كالماثرة والبقية من العلم تؤثر كالأثرة والأثارة ج ۱ ص ۳۶۲۔ یعنی اثرۃ اس خوبی کو کہتے ہیں جو آباؤ اجداد سے اولاد کی طرف منتقل ہوتی چلی آتی ہے اور اس بقیہ علم کو بھی کہتے ہیں جو منقول ہوتا چلا آتا ہے جیسا کہ اثرہ آثارہ کا مفہوم ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ لفظ اثارہ نقل اور روایت کا مفہوم رکھتا ہے۔ آیت مذکورہ بالا میں مشرکین سے ان کے شرک کے ثبوت میں دو چیزوں کا مطالبہ کیا گیا ہے (الف) کسی سابق کتاب سے اسکی دلیل لاؤ۔ (ب) یا کوئی ایسی نقل و روایت پیش کرو جس کی بنیاد علم پر ہو۔ ظاہر ہے کوئی سی نقل و روایت بغیر ناقل و راوی کے اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی اس لئے سند یعنی سلسلہ رُواۃ کا اہتمام ضروری ہے اس کے بغیر کلام منقول کا صحت وضعف واضح نہیں ہو سکتا۔

۲۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ — اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس

جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْا ۔ کوئی فاسق (غیر ذمہ دار شخص) خبر لائے
(سورۃ الحجرات پ ۲۶ آیت ۶) تو اُس کی چھان بین کر لو ۔

اس آیت اور اس کے ہم معنی دوسری آیات و روایات کی بنیاد پر محدثین کرام نے راویوں کو پرکھنے کے لئے جرح و تعدیل جیسے اہم علم کی بنیاد ڈالی [۱] ۔

۳ ۔ وَأَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ۔ اور اپنے میں سے دو منصف افراد
(پ ۲۸ سورہ الطلاق آیت ۲) کو گواہ کر لو ۔

شہادت و روایت میں کئی وجوہ سے فرق پایا جاتا ہے لیکن کئی اعتبار سے ان دونوں میں مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے ۔ اس لئے جس طرح گواہ کے لئے عادل و قابل اعتماد ہونا ضروری ہے ۔ اس طرح راوی کا بھی بنیادی وصف یہی عدالت (سیرت کی پاکیزگی) ہے [۲] ۔

---

[۱] یہ خیال درست نہیں ہے کہ " محدثین کرام نے ضرورت اور حکمت عملی کے ماتحت راویوں پر جرح اور غیبت کو جائز قرار دے دیا جب کہ قرآن مجید اور صحیح احادیث میں غیبت کی شدید ممانعت آئی ہے اور اس پر سخت وعید سنائی گئی ہے " یہ اس لئے کہ ضعیف راویوں پر جرح اور ان کے معائب و نقائص کا بیان غیبت کے حدود ہی سے خارج ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ابوتراب نخشبی نے امام احمد بن حنبل کو راویوں پر جرح و قدح کرتے ہوئے سُنا تو کہا ۔ " کیا آپ علماء کی غیبت کرتے ہیں ؟ " امام نے جواب میں فرمایا " ارے بھائی " یہ نصیحت و خیر خواہی ہے غیبت نہیں ہے " اختصار علوم حدیث ص ۲۴۳ مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۵۰ ۔
یہی مفہوم الوجہم والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے ۔ اس کی تفصیل آئندہ آئے گی ۔ انشاء اللہ ۔

[۲] " شہادت " کے لئے مندرجہ ذیل امور بطور شرط کے ہونے ضروری ہیں ۔
(الف) حریت (آزادی) (ب) مرد ہونا، عورت تنہا انہی معاملات میں گواہ بن سکتی ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ (ج) عدد یعنی گواہ کم سے کم دو ہونے ضروری ہیں (د) گواہ کا بینا ہونا ضروری ہے ؟ (ہ) قرابت یا عداوت کی بنا پر گواہی معتبر نہیں ہو سکتی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الفروق للقرافی ج ۱ ص ۲۲ طبع تونس، توضیح الافکار ج ۲ ص ۱۱۸ ، ان کے علاوہ وہ تمام امور جو شہادت میں معتبر ہیں وہی روایت میں بھی ملحوظ ہیں ۔

وضاحت : گواہ کے بینا ہونے کی شرط کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے ۔

سند کی اہمیت سُنّت میں

(۱) عَنِ ابْنِ اَبِیْ بَکْرَۃَ عَنْ اَبِیْہِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ (فِیْ خُطْبَۃِ یَوْمِ النَّحْرِ) لِیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ فَاِنَّ الشَّاھِدَ عَسٰی اَنْ یُّبَلِّغَ مَنْ ھُوَ اَوْعٰی لَہٗ مِنْہُ۔

(صحیح بخاری کتاب العلم)

ابن ابی بکرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن خطبہ میں ارشاد فرمایا جو (مجمع میں) حاضر ہیں وہ (میری باتیں) ان کو پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ حاضر کی بہ نسبت غائب زیادہ قوتِ حافظہ رکھتا ہو۔

غائب سے مراد دو قسم کے افراد ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ جو زندہ موجود تھے لیکن حجۃ الوداع میں شریک نہ ہو سکے۔

۲۔ بعد میں آنے والی نسلیں۔ اسی فرمان کی بنا پر صحابۂ کرام نے جو کچھ سنا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا وہ تابعین تک منتقل کر دیا۔ اور تابعین نے یہ مبارک ذخیرہ اپنے تلامذہ تبع تابعین تک پہنچا دیا اس طرح یہ احادیثِ نبویہ سینہ بسینہ اور سفینہ در سفینہ (کتاب در کتاب) ہم تک پہنچ گئیں۔

(۲) عَنْ سَمُرَۃَ بْنِ جُنْدُبٍ وَالْمُغِیْرَۃِ بْنِ شُعْبَۃَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ حَدَّثَ عَنِّیْ بِحَدِیْثٍ یُرٰی اَنَّہٗ کَذِبٌ فَھُوَ اَحَدُ الْکَاذِبِیْنَ۔

سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مجھ سے حدیث روایت کرتا ہے یہ جانتے ہوئے کہ وہ جھوٹ ہے تو ایسا شخص جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

(صحیح مسلم مع شرح النووی ج ا ص ۶۲)

(۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اِتَّقُوا الْحَدِيْثَ عَنِّيْ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی ابواب تفسیر القرآن ج ۸ ص ۲۷۷)۔	مجھ سے حدیث بیان کرنے میں پرہیز کرو مگر ایسی احادیث جنکا تم علم رکھتے ہو۔ اس لئے جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھتا ہے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے۔

ان دونوں حدیثوں سے واضح ہوا کہ (الف، موضوع من گھڑت روایات کا بیان کرنا اور ان کو لوگوں میں پھیلانا جائز نہیں ہے۔

ب۔ جس طرح وضع حدیث، روایت گھڑنا، اپنی طرف سے پیش کرنا جرم عظیم ہے۔ اسی طرح ایسی روایات کی عوام میں اشاعت بھی گناہ کبیرہ ہے۔ اس قسم کی روایات کا بیان اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جبکہ ان کی اصلیت اور حقیقت بھی بے نقاب کر دی جائے۔

علماء سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ موضوع روایات، فضائل اعمال، اور ترغیب و ترہیب میں بھی بیان نہیں کی جاسکتیں۔ مقدمہ ابن الصلاح ص۸۹ ؏۱

اسی طرح جس روایت کا ماخذ (سرچشمہ) یا سند معلوم نہ ہو اس کو بھی بلا تحقیق لوگوں میں پھیلانا جائز نہیں ہے، اس طرح کی بے احتیاطی سے بہت سی بے بنیاد روایات اور گمراہ کن خرافات مسلمانوں کے لٹریچر میں شامل ہو گئی ہیں جن کی بنا پر عقائد و اعمال کے لحاظ سے بہت سی ضلالتیں اور بے اعتدالیاں مسلم معاشرہ میں جڑ پکڑ گئی ہیں۔ ؏۲

مذکورہ بالا روایات سے سند کی اہمیت واضح ہو گئی کہ راوی کے صادق و کاذب ہونے کی پہچان سند کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۴۔ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ ذَكَرْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ مُعَاوِيَةَ بْنَ اَبِيْ سُفْيَانَ وَاَبَا جَهْمٍ خَطَبَانِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ	فاطمہ بنت قیس سے روایت ہے وہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ معاویہ بن ابی سفیان اور ابو جہم نے مجھے پیغام نکاح بھیجا ہے

؏۱ حدیث ضعیف فضائل اور ترغیب و ترہیب میں بیان ہو سکتی ہے یا نہیں اس کی تفصیل آئندہ بیان ہو گی، ان شاء اللہ العزیز۔ ؏۲ ان کے نمونے آئندہ بیان ہوں گے۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَّا اَبُوْجَہْمٍ فَلَا یَضَعُ عَصَاہُ عَنْ عَاتِقِہٖ وَ فِیْ رِوَایَۃٍ فَرَجُلٌ ضَرَّابٌ لِلنِّسَاءِ وَاَمَّا مُعَاوِیَۃُ فَصُعْلُوْکٌ لَا مَالَ لَہٗ۔

(صحیح مسلم کتاب النکاح مع شرحہ للنووی ج ۱۰ ص ۱۰۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رہے ابوجہم تو وہ اپنی لاٹھی اپنے کندھے سے نہیں ہٹاتے ایک اور روایت میں ہے کہ یہ عورتوں کے حق میں بڑے مرکھنے ہیں اور رہے معاویہ تو وہ فقیر قلاش ہیں۔ ان کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔

اس حدیث میں ایک عورت کی خیرخواہی کی بنا پر دو صحابیوں کے عیب ان کی غیر حاضری میں بیان کئے گئے ہیں کیونکہ اس سے مقصود ایک خاتون بلکہ ایک خاندان کی خیرخواہی ہے تو اس کو غیبت قرار نہیں دیا جائے گا۔ اسی طرح بدرجہ اولیٰ دین کے تحفظ کے لئے راویوں پر جرح و قدح بھی اُمت مسلمہ کی خیرخواہی شمار ہوگی حقیقت میں یہ تعمیل ہے اس حدیث نبوی کی جس میں ارشاد ہے۔

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ قَالُوْا لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ۔

(صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۲ ص ۳۷)

دین نام ہے نصیحت کا صحابہؓ نے دریافت کیا کس کے لئے آپؐ نے فرمایا اللہ کے لئے، اس کی کتاب کے لئے، اور مسلمانوں کے سربراہوں کے لئے اور ان کے عوام کے لئے۔

۵ عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَکْذِبُوْا عَلَیَّ فَاِنَّہٗ مَنْ یَکْذِبْ عَلَیَّ یَلِجِ النَّارَ۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۶۶)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر جھوٹ مت باندھو اس لئے کہ جو مجھ پر جھوٹ باندھتا ہے وہ دوزخ میں داخل ہو کر رہے گا۔

۶۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَکُوْنُ فِیْ اٰخِرِ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخری زمانے میں ایسے جھوٹے دجال

الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ يَأْتُوْنَكُمْ مِنَ الْاَحَادِيْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا اَنْتُمْ وَلَا اٰبَائُكُمْ فَاِيَّاكُمْ وَاِيَّاهُمْ لَا يُضِلُّوْنَكُمْ وَلَا يَفْتِنُوْنَكُمْ۔

پیدا ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی روایات لائیں گے جن کو نہ تم نے سنا اور نہ تمہارے باپ دادوں نے، تم ان سے دور رہو وہ تم کو گمراہی اور فتنہ میں ڈالنے نہ پائیں۔

(مقدمہ صحیح مسلم ج ۱ ص ۷)

۷۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انسان کے جھوٹے ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ بس جو کچھ وہ سنے دوسروں کے سامنے اگل دے۔

(مقدمہ صحیح مسلم ج ۱ ص ۷)

یعنی راوی کی تحقیق کئے بغیر سنی سنائی باتوں کو دوسروں تک پہنچانا بھی جھوٹ ہی کی ایک قسم ہے خصوصاً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں جو یہ بے احتیاطی برتتا ہے اسے ذیل کی حدیث سے سبق لینا چاہیئے۔

۸۔ عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ كَذِبًا عَلَیَّ لَيْسَ كَكَذِبٍ عَلٰى اَحَدٍ، فَمَنْ كَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا، مجھ پر جھوٹ اور افترا پردازی کسی عام انسان پر جھوٹ باندھنے کی طرح نہیں ہے اس لئے کہ جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا (جانتے بوجھتے) تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے۔

(مقدمہ مسلم ج ۱ ص ۶۹)

آثارِ صحابہؓ میں سند کی اہمیت

۱۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ الشَّيْطَانَ لَيَتَمَثَّلُ فِیْ صُوْرَةِ

عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ شیطان انسان کی شکل اختیار کرکے لوگوں

الْاِنْسَانِ فَيَأْتِي الْقَوْمَ فَيُحَدِّثُهُمْ بِالْحَدِيْثِ مِنَ الْكَذِبِ يَتَفَرَّقُوْنَ فَيَقُوْلُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ سَمِعْتُ رَجُلًا اَعْرِفُ وَجْهَهٗ وَلَا اَدْرِيْ مَا اسْمُهٗ يُحَدِّثُ۔

کے پاس آتا ہے اور ان کو جھوٹی سچی باتیں سُناتا ہے پھر لوگ منتشر ہو جاتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے کہ میں نے ایک آدمی کو فلاں بات کرتے ہوئے سُنا ہے۔ میں اس کی صُورت پہچانتا ہوں لیکن اس کے نام سے واقف نہیں ہوں۔

(مقدمہ صحیح مسلم ج ۱ ص۱۲)

کسی راوی کی بات پر یقین و اعتماد کرنے کے لئے اس کی شخصیت سے پُوری طرح واقفیت ضروری ہے، محض صُورت شناسی کافی نہیں ہے۔ جب عام بات چیت کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تنبیہ فرما رہے ہیں تو حدیث نبویؐ میں تو بدرجہ اولی احتیاط کی ضرورت ہے۔

۲۔ عَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ جَاءَ بُشَيْرُ نِ الْعَدَوِيُّ اِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ فَجَعَلَ يُحَدِّثُ وَيَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَا يَاْذَنُ لِحَدِيْثِهٖ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِ فَقَالَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ مَالِيْ لَا اَرَاكَ تَسْمَعُ لِحَدِيْثِيْ اُحَدِّثُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا تَسْمَعُ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِنَّا كُنَّا اِذَا سَمِعْنَا رَجُلًا يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْتَدَرَتْهُ اَبْصَارُنَا وَاَصْغَيْنَا اِلَيْهِ بِاٰذَانِنَا فَلَمَّا رَكِبَ النَّاسُ الصَّعْبَ وَالذَّلُوْلَ لَمْ نَاْخُذْ

مجاہد سے روایت ہے کہ بشیر عدوی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور لگے حدیثیں بیان کرنے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا، اور یہ فرمایا، لیکن حضرت ابن عباسؓ کا یہ حال تھا کہ نہ ان کی بات پہ کان دھرا اور نہ نگاہ اٹھا کر دیکھا، آخر کار بشیر نے کہا کیا معاملہ ہے آپ میری بات نہیں سنتے میں آپ سے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرتا ہوں اور آپ توجہ نہیں دیتے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، ہمارا یہ حال تھا کہ جب ہم کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتے "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" تو ہماری

مِنَ النَّاسِ اِلَّا مَا نَعْرِفُ ۔
مقدمہ صحیح مسلم مع
(النووی طبع مصر ج ۱ ص ۸۱)

نگاہیں اس کی طرف فوراً اٹھ جاتیں اور یہ کان اس کی طرف لگ جاتے لیکن جب لوگوں نے رطب و یابس بیان کرنا شروع کر دیا تو ہم وہی روایت قبول کرتے ہیں جس کو ہم جانتے ہوں (کہ یہ حدیث نبوی ؐ ہے)۔

۳ ۔ قَالَ اَبُوْذَرٍّ لَوْ وَضَعْتُمُ الصَّمْصَامَةَ عَلٰی هٰذِهٖ وَاَشَارَ اِلٰی قَفَاهُ ثُمَّ ظَنَنْتُ اَنِّیْ اُنْفِذُ كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ تُجِیْزُوْا عَلَیَّ لَاَنْفَذْتُهَا ۔
(صحیح بخاری مع فتح الباری کتاب العلم ج ۱ ص ۱۶۱) ۔

حضرت ابوذر رضؓ نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر اس پر تلوار رکھ دو اور مجھے یہ اندازہ ہو کہ تمہاری تلوار چلانے سے پہلے میں ایک کلمہ بھی زبان پر لا سکتا ہوں جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے تو میں ضرور اسے لوگوں کو سنا کر رہوں گا ۔

صحابہ کرام رضؓ کا یہی شوق و ذوق تھا اور یہی جرأت و ہمت تھی جس کی بنا پر احادیث نبویہ کا ذخیرہ محفوظ طریقے سے ہم تک پہنچ سکا ۔

۴ ۔ مشہور تابعی عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مشہور جلیل القدر صحابی ابو ایوب انصاری رضؓ عقبہ بن عامر کے پاس تشریف لے گئے (یہ مدینہ سے مصر کا سفر صرف ایک حدیث سننے کے لیے تھا)،
جب ابو ایوب رضؓ انصاری مصر کے امیر مسلمہ بن مخلد کے مکان پر پہنچے تو اطلاع ملنے پر مسلمہ فوراً باہر آئے اور گلے ملے دریافت کیا، کیسے یہ سفر فرمایا؟ ابو ایوب رضؓ نے فرمایا، ایک حدیث میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی اب اس کے سننے والوں میں سے میرے اور عقبہ کے سوا اور کوئی باقی نہیں رہا ہے ۔ آپ میرے ساتھ کسی کو بھیج دیجیے جو عقبہ کا مکان مجھے بتلا دے ۔ جب ابو ایوب، عقبہ کے پاس پہنچے تو وہ فوراً باہر تشریف لائے، معانقہ کیا اور اس سفر کی زحمت گوارہ کرنے کی وجہ دریافت کی ۔ حضرت ابو ایوب نے فرمایا "ستر المومن"

کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست حدیث سننے والا میرے اور آپ کے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے حضرت عقبہ بن عامرؓ نے فرمایا جی ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے :-

"مَنْ سَتَرَ مُؤْمِنًا فِي الدُّنْيَا عَلٰى خِزْيَتِهٖ سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"

جس نے کسی مومن کے شرمناک عمل پر پردہ پوشی کی تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے عیوب پر پردہ ڈال دے گا۔

یہ روایت سننے کے بعد ابوایوب نے فرمایا "صَدَقْتَ" عقبہؓ! آپ نے سچ فرمایا۔ اس کے بعد ابوایوبؓ اپنی سواری کی طرف پلٹے اور مدینہ منورہ واپسی کے لئے اس پر سوار ہو گئے۔ امیر مصر کا عطیہ ان کو اس وقت ملا جبکہ وہ مصر کی سرحد پر پہنچ چکے تھے۔

(معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص۸)

حضرت ابوایوبؓ نے مدینہ منورہ سے مصر تک کا طول طویل سفر صرف ایک حدیث کی خاطر کیا، تاکہ اس کے الفاظ میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہ جائے۔ حضرت ابوایوبؓ چاہتے تو ان الفاظ کی تصدیق مدینہ منورہ ہی میں صحابہ کرامؓ کے شاگردوں سے معلوم کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ضروری سمجھا کہ براہ راست عقبہؓ سے معلوم کریں جنہوں نے بلا واسطہ یہ حدیث آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔

محدثین کرام نے اس حدیث سے سند عالی (جس میں نسبتاً واسطے کم ہوں) کی اہمیت پر استدلال کیا ہے یہ اس لئے کہ جس قدر واسطے کم ہوں گے اسی لحاظ سے غلطی کا امکان کم ہو گا۔

۵ - ابن عقیل سے روایت ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ طلب حدیث کے لئے اپنے سفر کا قصہ خود بیان کرتے ہیں۔ کہ میں نے اونٹ خریدا اور ایک ماہ کا سفر طے کر کے ملک شام میں عبداللہ بن انیس کے مکان پر پہنچا۔ قاصد کے ذریعہ اندر اطلاع کرائی گئی۔ وہاں سے سوال کیا گیا کہ جابر بن عبداللہ تشریف لائے ہیں؟ میں نے جواب اثبات میں دیا تو فوراً عبداللہ بن انیس باہر تشریف لائے اور مجھے گلے لگا لیا، میں نے ان سے کہا، مجھے ایک حدیث کا علم ہوا ہے جسے براہ راست میں نے آپ سے نہیں سنا ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں ہم دونوں میں سے کسی کو موت کا پیغام نہ آ جائے اس لئے میں نے سفر میں جلدی کی، عبداللہ بن

اُنیس نے فرمایا :-

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے :-

يَحْشُرُ اللّٰهُ الْعِبَادَ أَوِ النَّاسَ عُرَاةً، غُرْلًا بُهْمًا قُلْنَا مَا بُهْمًا، قَالَ لَيْسَ مَعَهُمْ شَيْءٌ فَيُنَادِيهِمْ بِصَوْتٍ يَسْمَعُهُ مَنْ بَعُدَ أَحْسِبُهُ، قَالَ كَمَا يَسْمَعُهُ مَنْ قَرُبَ أَنَا الْمَلِكُ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَاحِدٌ مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَطْلُبُهُ بِمَظْلَمَةٍ وَلَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَدْخُلُ النَّارَ وَاحِدٌ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَطْلُبُهُ بِمَظْلَمَةٍ قُلْتُ وَكَيْفَ ؟ وَإِنَّا نَأْتِي اللّٰهَ عُرَاةً بُهْمًا قَالَ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ -

(جامع بیان العلم وفضلہ ص۹۳ ج ۱
الادب المفرد للبخاری ص۳۳۷)

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو جمع کرے گا اس حال میں کہ وہ برہنہ بدن، بے ختنہ اور بے سر و سامان ہوں گے، ہم نے پوچھا بہما کے معنی کیا ہیں ؟ آپ نے فرمایا، ایسے اشخاص جن کے پاس کچھ نہ ہو پھر اللہ تعالیٰ ان کو پکارے گا ایسی آواز جس کو دور والے بھی سنیں گے، راوی کا بیان ہے کہ میرا گمان ہے کہ آپؐ نے اس کے بعد فرمایا، جیسے قریب والے سنتے ہیں (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) "میں ہی بادشاہ ہوں، کوئی جنتی، جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس حال میں کہ کوئی دوزخی ظلم کی بنا پر اس سے (قصاص) کا مطالبہ کر رہا ہو، اور کوئی دوزخی دوزخ میں داخل نہ ہو گا اس حال میں کہ کوئی جنتی اس سے ظلم کی وجہ سے بدلہ کا تقاضا کر رہا ہو"

میں نے کہا ہم تو خدا کے حضور برہنہ بدن، بے سر و سامان حاضر ہوں گے۔ تو کیسے ظلم کا مداوا ممکن ہوگا، آپؐ نے فرمایا، نیکیوں اور بُرائیوں کے ذریعے، یعنی ظالم کی نیکیاں چھین کر مظلوم کو دلوادی جائیں گی اور اگر نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو مظلوم کی برائیاں ظالم کے سر تھوپ دی جائیں گی، جیسا کہ دوسری حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔

اس حدیث کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اگر صحابہ کرام رضؓ کے نزدیک سند کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو صرف ایک حدیث کی خاطر اتنا لمبا دشوار گزار سفر اختیار نہ کرتے۔

مقالہ

مولانا صہیب حسن

صدر

جمعیۃ القرآن لندن

اسنادِ حدیث اور مستشرقین

تدوینِ حدیث اور اسناد کے بارے میں محدثین کرام نے انتہائی وضاحت کے ساتھ حقائق رقم کئے ہیں۔ یورپی مستشرقین نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے لیکن ان کی آراء حقائق سے زیادہ ذہنی اختراع کی مرہونِ منت ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں زیادہ تر مستشرقین کی آراء کو ہدفِ بحث بنایا گیا ہے۔

سپرنگر اور میور نے اس رائے کو تقویت دی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم (م ۱۱۷ھ) کو احادیث لکھنے کی ہدایت کی تھی(۱) اور جس کے بموجب ۱۲۰ھ سے قبل کتب حدیث ناپید تھیں (۲)۔

گولڈ زیہر، عمر بن عبدالعزیز سے منسوب اس روایت کو جعلی قرار دیتے ہوئے تدوینِ حدیث کا زمانہ دوسری صدی کا آخر قرار دیتا ہے۔ گولڈ زیہر، سپرنگر کی اس رائے سے اتفاق رکھتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں نوٹس اور منفرق تحریروں کی شکل میں حدیث پر مواد موجود تھا لیکن حدیث کے باضابطہ مجموعے دوسری صدی ہجری ہی کی پیداوار ہیں۔ اُس کی رائے میں دوسری صدی کے ابتدائی نصف حصہ میں حدیث پر مشتمل ریکارڈ زیادہ تر فقہی نوعیت کے تھے۔ اس ذیل میں امام ابوحنیفہ (۱۵۰ھ) عبدالملک بن جریج (۱۵۰ھ) سعید بن ابی عروبہ (۱۵۶ھ) امام مالک (۱۷۹ھ) امام شافعی (۲۰۴ھ) کے نام آتے ہیں۔ حدیث کے ابتدائی مجموعے مصنف اور مُسند شکل میں منظرِ عام پر آئے جنہیں نمایاں مقام مسند امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) اور امام محمد بن اسماعیل بخاری (۲۵۶ھ) کی الجامع الصحیح کو حاصل ہے۔

شاخت(۳) ان آراء سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا اظہار کرتا ہے کہ فقہی موضوعات پر مشتمل احادیث دوسری صدی کے دوسرے رُبع کے محدثین کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ وہ وِنسک کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ عقائد پر مشتمل احادیث اُموی دور میں ظہور

پذیر ہوئیں (۴)

مغربی حلقوں میں حدیث اور دوسرے اسلامی موضوعات پر علمی کاموں کی ابتداء کا سہرا گولڈزیہر کی کتاب (مطالعہ محمڈنزم) کو جاتا ہے جس کی اشاعت ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔ متاخرین علماء غرب اسی کتاب کے خوشہ چین ہیں۔

شاخت نے گولڈزیہر کی آراء کو اپنی کتاب (محمدی فقہ کی اساس) میں تفصیلی جامہ پہنایا ہے۔ محمد مصطفیٰ اعظمی نے دور حاضر میں اس موضوع پر مزید تحقیق کی ہے (۵)

اعظمی کی رائے کے مطابق مستشرقین کے تدوین حدیث کی ابتداء کے بارے میں غلط تاثرات چند عربی اصطلاحات جیسے تدوین، تصنیف، رسالہ وغیرہ کے مفہوم کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

ان کی رائے کے مطابق "رسائل" کی شکل میں حدیث کے مجموعوں کا ایک بڑا ذخیرہ پہلی صدی میں متفرق طور پر موجود تھا۔ کسی خاص موضوع کی تحدید کے بغیر صحیفہ یا رسالہ کے نام سے ایسا مواد اس دور میں بکثرت دستیاب تھا۔ ایک نمایاں مثال صحیفہ ہمام بن منبہ (۱۰۱ھ) کی ہے۔ جنہوں نے حضرت ابوہریرہ (۵۸ھ) سے روایت کی ہے (۶)

محدثین کی ایک بڑی تعداد نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کے صحیفہ الصادقہ کا تذکرہ کیا ہے (۷)۔ گو اس تمام ذخیرے کی موضوع کے مطابق تصنیف دوسری صدی ہجری کے محدثین نے کی۔ بر سبیل مثال چند محدثین کا ذکر کیا جاتا ہے جنہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔

عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج (۱۵۰ھ)

محمد بن اسحاق (۱۵۳ھ)

سعید بن ابی عروبہ (۱۵۶ھ)

محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی ذئب (۱۵۸ھ) جن کے مجموعے کا نام مؤطا ہے۔

عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی (۱۵۸ھ)

سفیان بن سعید الثوری (۱۶۱ھ)

امام مالک بن انس صاحب مؤطا (۱۷۹ھ)

فواد سزگین کی تحقیق کے مطابق حدیث کے قدیم ترین مجموعوں میں سے معمر بن راشد (۱۵۳ھ) کی کتاب "الجامع"، قتادہ (۱۱۸ھ) کی کتاب المناسک اور ربیع بن حبیب البصری (۱۶۰ھ) کی کتاب

'الجامع' اب بھی موجود ہیں۔ متاخرین محدثین جیسے بخاری اور مسلم بن حجاج قشیری (۲۶۱ھ) نے احادیث کے مجموعوں کی تدوین میں مندرجہ بالا مواد سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔

سزگین تدوین حدیث کے ضمن میں گولڈزیہر کی عمر بن عبدالعزیز سے منسوب روایت کو جعلی قرار دینے کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ روایت کئی مصادر سے منقول ہے اور ناقلین میں ابو محمد عبداللہ عبدالرحمٰن الدارمی (۲۵۵ھ) ابن سعد (۲۳۰ھ)، اور امام بخاری شامل ہیں۔ ابو حاتم رازی (۲۷۷ھ) کی روایت کے مطابق ابوبکر بن حزم نے عمر بن عبدالعزیز کے اس حکم کو عملی جامہ پہنایا تھا۔

امام مالک روایت کرتے ہیں:

"مدینہ میں فقہی موضوعات کے بارے میں ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم سے بڑا ہمارے پاس اور کوئی عالم نہ تھا۔ وہ عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے عہدہ قضا پر مقرر کئے گئے تھے اور خلیفہ نے انہیں عمرۃ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے علم کو اُن تک پہنچانے کے لئے لکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جواباً تحریر لکھ بھیجی۔ اس وقت انصار مدینہ میں ابوبکر بن حزم کے علاوہ اور کوئی امیر یا قاضی نہ تھا۔" (۱۰)

گولڈزیہر نے عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے ابوبکر بن حزم کو خط لکھنے کی نفی اس بنیاد پر کی ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ابوبکر بن حزم کے جوابات بھی دستیاب ہوتے لیکن جیسا کہ پہلے رقم کیا جا چکا ہے اس دور کی اکثر تحریریں بعد کے مجموعہ احادیث میں شامل کر لی گئی تھیں۔

اعظمی کی تحقیق کے مطابق مندرجہ ذیل تعداد اُن راویوں کی ہے جن سے منسوب شدہ تحریری مواد، رسالہ یا نسخہ کے نام سے معروف تھا اور جن کی طرف متاخرین محدثین نے اپنی تالیفات میں اشارہ کیا ہے۔

صحابہ میں سے ۵۰ راوی

پہلی صدی ہجری کے تابعین میں ۴۸ راوی

پہلی صدی کے اواخر اور دوسری صدی کے آغاز میں ۸۶ راوی

دوسری صدی کے ۲۵۶ راوی

مُسند احمد نے اپنے دامن میں زیادہ تر اس ذخیرہ کو سمو لیا ہے۔ جسے بجا طور پر حدیث کی قدیم اور عظیم ترین کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔

یہ واقعات ۶۴ھ اور ۷۲ھ کے ہیں جبکہ مکہ میں عبداللہ بن زبیر محصور کر دیئے تھے۔ چونکہ ابن سیرین کی پیدائش ۳۳ھ کی ہے وہ اس زمانہ میں عمر کی پختگی کے اس مرحلہ میں تھے کہ پورے وثوق کے ساتھ اپنی بات کہہ سکتے تھے۔

شاخت کے اس نظریہ سے اختلاف کی گنجائش ہے کہ پُرامن دور کا اختتام ۱۲۶ھ تک ہو چکا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ "میرا زمانہ بہترین زمانہ ہے۔ پھر اُس کے بعد کا دور اور پھر اُس سے اگلا دور"

ایک دوسری روایت میں شُبہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے بعد تیسرے دور کا ذکر کیا تھا یا نہیں؟ یہ روایت اس بات کی مقتضی ہے کہ متذکرہ بالا ادوار کے بعد حالات بگڑنے شروع ہو جائیں گے۔ دیکھا جائے تو ابن زبیر کے ایام پر اس روایت کا خوب مصداق ہوتا ہے۔ اس روایت سے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ حالات کی خرابی میں التواء کو دوسری صدی تک مؤخر کر دیا جائے۔ اس لئے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ابن سیرین سے منسوب قول صحیح ہے، اور اگر یہ نتیجہ صحیح ہے تو ہورووتز کا یہ نظریہ ماننا پڑے گا کہ حدیث سے متعلق لٹریچر میں اسناد کا اضافہ پہلی صدی کے تیسرے ثُلث میں ہوا ہے کیونکہ ابتدائی زمانہ میں اس کے رائج ہونے کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس زمانے کی تحریروں میں اس کا عکس نظر آئے۔"

مصطفیٰ اعظمی[۲۱] ایک قدم اور آگے جاتے ہیں اور فتنہ کی ابتداء کا زمانہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین خانہ جنگی کو ان دو وجوہ کی بنا پر قرار دیتے ہیں:

اوّل یہ کہ آنحضورؐ اور پہلے تین خلفاء کی بہ نسبت حضرت علیؓ، اُن کی زوجہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت معاویہؓ کے متعلق موضوع احادیث کا ذخیرہ کہیں زیادہ ہے۔

دوئم، خود ابن سیرین کا قول جس کے بارے میں اُن کا کہنا ہے:

"اس قول کو ضعیف قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ابن سیرین کے قول کا مقتضیٰ یہی ہے کہ وہ اپنے زمانہ سے ماقبل دستور کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ وہ نسبت اپنی طرف نہیں کرتے بلکہ یوں کہتے ہیں "لوگ نہیں پوچھا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یا یہ کہ "اپنے راویوں کے نام بتاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ، جس سے ظاہر ہوا کہ اُن کے زمانہ میں تو یہ معمول تھا ہی، وہ تو اپنے سے پہلے زمانہ کی روایت کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ پھر اُن کا یہ کہنا "وہ لوگ نہیں پوچھا کرتے تھے۔) اس بات کو ظاہر کر رہا ہے کہ اُس زمانہ میں اسناد کا چلن

تھا۔ گو لوگ اُس کی تحقیق میں زیادہ نہ اُلجھتے تھے اور یہ راوی پر منحصر تھا کہ وہ اپنے ذرائع روایت کا افشا کرے یا نہ کرے۔"

شاخت (۲۲) اور اس کے پیشرو گولڈ زیہر کا یہ کہنا کہ اسنادیں پیچھے کی طرف بڑھنے کا رجحان پایا جاتا ہے اور "جتنی اسناد مکمل ہو گی اتنی ہی روایت بعد کی ہو گی" علماء کے نزدیک قابلِ بحث رہا ہے۔

بقول اعظمی احادیث کا پھیلنا ایک قدرتی امر تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حدیث کی ابتداء آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے جس کی روایت ایک سے زائد صحابی کرتے ہیں اور پھر اُن کے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد ان روایات کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتی ہے۔ مزید برآں یہ روایات کسی خاص علاقہ سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ مختلف مسلم علاقوں سے مروی ہیں۔ چنانچہ اگر کسی ایک اسناد میں کہیں انقطاع پایا جاتا ہے تو اُسی حدیث کی دوسری اسنادیں گمشدہ کڑی کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ شاخت نے اسناد کے پیچھے کی طرف بڑھنے کے رجحان کے نظریہ کی تقویت میں مؤطا امام مالک، امام شافعی اور امام شیبانی کی تالیفات کا سہارا لیتے ہوئے کئی مثالیں رقم کی ہیں۔

اعظمی (۲۴) اس قول کی تردید میں لکھتے ہیں۔

" مالک اور دوسرے محدثین کی روایت کردہ ہزاروں احادیث میں سے شاخت اپنے مطلب کی چند سقیم روایات پر اپنے نظریہ کی بنیاد کھڑی کرتا ہے اور یہی اس کی تحقیق کا نمایاں انداز ہے لیکن جن حوالہ جات کا اس نے سہارا لیا ہے وہی اس کی تردید کے لئے کافی ہیں۔ مثال کے طور پر جہاں زرقانی کے حوالہ سے امام مالک کی غلطی کی نشاندہی کی گئی ہے وہاں شاخت نے پورا پیرا گراف نہیں نقل کیا ہے۔ کیونکہ خود زرقانی نے لکھا ہے کہ امام مالک کے شاگرد امام شافعی نے اس غلطی کا نوٹس لے لیا تھا۔ محدثین نے مالک کی روایت کردہ حدیث کا چند معاصر محدثین کی روایت سے موازنہ کرتے ہوئے اس غلطی کا انکشاف کیا تھا۔ آٹھ میں سے سات محدثین مالک کی روایت کردہ حدیث کے بالمقابل دوسری روایت کی صحت پر متفق تھے اور اس طرح اس غلطی کی نشاندہی بخوبی ہو سکی۔ اگر موضوع احادیث کے ساتھ خود ساختہ اسانید وضع کرنے کی عادت عام ہوتی تو روایات کے اس سُقم کو واضح کرنا ناممکن ہوتا۔ اسناد کے بارے میں تحقیق کا پایا جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اول تو بناوٹی اسانید بہت کم

تھیں اور اگر پائی بھی گئیں تو محققین کی نگاہ سے بچ نہ سکیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ناقلین روایات نقل کرتے وقت کبھی نہ کبھی غلطی کر سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ شاخت کی پیش کردہ مثالیں اس کی تحقیق انیق کے لئے واقعی بنیاد فراہم کر سکتی ہیں"

شاخت کی پیش کردہ ایک مثال کو ہم موضوع بحث بناتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ غلطی کہاں واقع ہوئی ہے۔ پہلے ہم شاخت کے دعویٰ کو لیتے ہیں (۲۵)

"موطا ۳ : ۱۰۶ مالک عن داؤد بن حصین عن ابی سفیان مولیٰ ابن ابی احمد عن ابی سعید الخدری جو روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزابنہ سے منع فرمایا ہے جو کہ بیع کی ایک قسم ہے"۔

موطا ۔ ۳ : ۱۰۲ متذکرہ اسناد میں ابو سعید خدری کی جگہ ابو ہریرہؓ کے فرق کے ساتھ دوسری روایت جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرایا کی رخصت عطا کی ہے جو کہ مزابنہ کے تحت کھجور کی بیع سے متعلق ہے" (۲۶)

دونوں روایات متضاد احکامات پر مشتمل ہیں جن میں مالک اور شافعی نے مصنوعی طور پر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں میں ایک روایت کے ساتھ دوسری روایت کی اسناد جوڑ دی گئی ہے، بظاہر مزابنہ کی ممانعت والی روایت کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا ہے کیونکہ یہی روایت مالک عن الزھری عن ابن مسیب عن النبی (موطا ۳ : ۱۰۶) کی اسناد کے ساتھ مرسل حیثیت میں وارد ہوئی ہے۔ بطور حدیث اسے اولیت حاصل ہے۔ اس کے بالمقابل عرایا کی رخصت والی حدیث پیش کی گئی اور بعد ازاں اس کی اسناد بھی اس روایت کے ساتھ جوڑ دی گئی ۔"

شاخت حاشیہ میں ابن مسیب والی مرسل حدیث کے بارے میں لکھتا ہے :

" اس روایت کو بعد ازاں مکمل اسناد حاصل ہو گئی ۔ حوالہ زرقانی از ابن عبدالبر ۳ : ۱۰۶"

شاخت کے دعویٰ کا تجزیہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل پہلو برآمد ہوتے ہیں :

۱ ۔ مزابنہ کے بارے میں ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ سے دو متضاد روایات منقول ہیں جن کے مابین بعد میں مالک اور شافعی نے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲ ۔ ابن مسیب کی روایت کو اس سلسلہ کی قدیم ترین روایت قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کا

مقابلہ عرایا کی رخصت والی حدیث سے کیا گیا اور پھر اُس کے ساتھ دوسری حدیث کی اسناد جوڑ دی گئی ۔

۳ - ابن مسیّب کی مُرسل روایت کو بھی بعد ازاں مکمل اسناد نصیب ہو گئی ۔

موضوع سے انصاف کا تقاضا ہے کہ اس بحث سے متعلق تمام احادیث کا جائزہ لیا جائے ۔

مزابنہ کی ممانعت والی احادیث

یہ احادیث مندرجہ ذیل چار صحابہ اور ایک تابعی سے مروی ہیں ۔

۱ - ابو سعید خدری والی حدیث جسے امام مالک نے داؤد اور ابو سفیان کے واسطہ سے روایت کیا ہے ۔

۲ - عبد اللہ بن عمر والی حدیث جسے امام مالک نے نافع کے واسطہ سے روایت کیا ہے ۔

۳ - ابن مسیّب والی حدیث جسے امام مالک نے زہری کے واسطہ سے روایت کیا ہے

۴ - ابن عباس والی حدیث جسے امام بخاری نے عکرمہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے ۔

۵ - جابر بن عبد اللہ والی روایت جسے امام مسلم نے ابو الولید کے واسطہ سے روایت کیا ہے ۔

ان تمام احادیث کا متن اس بات پر متفق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزابنہ کو ممنوع قرار دیا ہے ۔

امام بخاری کی روایت پر شُبہ کرنے کا کوئی جواز نہیں کیونکہ انہوں نے امام مالک کی روایت کردہ ابن مسیّب والی حدیث ، اسناد یا متن میں کوئی حذف و تبدیلی کئے بغیر روایت کی ہے ۔

امام مسلمؒ ابن مسیّب تک مالک عن الزُھری کے واسطہ سے نہیں بلکہ عقیل عن الزُھری کے واسطہ سے پہنچتے ہیں ۔ امام مسلم نے مندرجہ بالا متن سے مشابہ ایک اور حدیث زُھری عن ابن مسیّب اور ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن عن ابی ھریرۃ کے واسطہ سے روایت کی ہے اس روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : پھلوں کو اس وقت تک فروخت نہ کرو جب تک کہ وہ پکنے کے قریب نہ ہو جائیں اور کھجور کے بدلہ میں کھجور نہ فروخت کرو۔" (۲۷)

عرایا کے بطورِ رخصت جواز پر مشتمل احادیث :

مندرجہ بالا تمام راویوں نے ماسوائے ابو سعید خُدری ، ابن عباس اور ابن مسیّب ، یہ

روایات بھی نقل کی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گو مزابنہ سے منع فرمایا تھا۔ لیکن آپ نے عرایا کی بیع بطور رخصت جائز رکھی ۔

ان راویوں کی تفصیل یوں ہے ۔

۱ ۔ ابو ہریرہؓ والی حدیث جسے امام مالک نے داؤد اور ابو سفیانؓ کے واسطہ سے روایت کیا ہے ۔ مسلم اور ابو داؤد نے بھی اس روایت کو لیا ہے ۔

۲ ۔ جابرؓ بن عبداللہ والی روایت جسے مسلم نے ابو الولید اور عطاء کے واسطہ سے نقل کیا ہے ۔

۳ ۔ عبداللہؓ بن عمر والی روایت جسے امام بخاریؒ اور مسلم نے سالم اور نافع کے واسطہ سے نقل کیا ہے ۔

نافع کہتے ہیں :

"عبداللہؓ بن عمر نے زیدؓ بن ثابت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ رسولؐ اللہ نے عرایا کا تبادلہ خشک یا تازہ کھجور کے ساتھ بطور رخصت جائز رکھا ۔ دوسرے کسی معاملہ میں آپ نے اس رخصت کی اجازت نہیں دی" (۲۹)

۴ ۔ سہلؓ بن ابی حثمہ والی روایت جسے مسلم نے بشیر بن یسار کے واسطہ سے روایت کیا ہے ۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزابنہ کی بیع سے منع فرمایا تھا لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ باغ کے مالک اس وقت کافی دقت محسوس کرتے ہیں جبکہ وہ لوگ کھجور توڑنے کے لئے بار بار باغ میں داخل ہوتے ہیں جنہیں نخلستان کے مالک نے چند کھجور کے درخت بطور عطیہ دیئے ہوتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاقی بنیاد پر ۔ نہ کہ تجارتی بنیاد پر ۔ عرایا کی رخصت مرحمت فرمادی تھی ۔ اور یہ رخصت بھی ابو ہریرہؓ سے مروی مندرجہ ذیل حدیث کے مطابق صرف پانچ وسق (۳۰) تک محدود تھی ۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ وسق کے برابر عرایا کی بیع کی اجازت دی تھی" (۳۱)

امام مالک اور امام شافعی پر بظاہر دو متضاد احادیث کے درمیان توافق پیدا کرنے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا ۔ امام مالک نے دونوں احادیث کو نقل کرکے صورت حال کو واضح کردیا تھا ۔

چونکہ ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ کی روایات متضاد ہیں لیکن ایک جیسی اسناد پر مشتمل ہیں تو شاخت کو یہ کہنے کا بہانہ مل گیا کہ ایک روایت پر دوسری روایت کی اسناد جوڑ دی

گئی ہے لیکن کیا ابوہریرہؓ وہ واحد راوی ہیں جو عرایا کی رخصت والی حدیث بیان کر رہے ہیں؟
ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابوہریرہؓ کے علاوہ تین دوسرے راوی اس روایت کو بیان کر رہے ہیں ،
نتیجۃً اسناد جوڑنے والے نظریہ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ۔ اگر اسناد جوڑنے والا مسئلہ ہی ہوتا تو ابن مسیّب اور ابن عباس والی اسانید اپنی اصلی حالت پر کیسے محفوظ رہ گئیں ؟ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوجاتا کہ امام مالک ، بخاری اور مسلم نے احادیث کو پوری دیانتداری کے ساتھ ویسے ہی روایت کیا ہے جیسے اُن تک پہنچی تھیں ۔

ان تمام مرویات کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ ابوسعید ، ابن عباس اور ابن مسیّب کے شیخ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مزابنہ سے منع کرتے ہوئے سُنا جبکہ ابوہریرہ ، عبداللہ بن عمرؓ (بواسطہ زید بن ثابت) جابر اور سہل بن ابی حثمہ کو بعد ازاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرایا کے جواز کے بارے میں علم ہوا ۔

یہاں ایک سوال تشنہ رہ جاتا ہے کہ سعید بن المسیّب والی مزابنہ کی ممانعت پر مشتمل حدیث کو تحقیق ابن عبدالبر مکمل اسناد کیسے نصیب ہوگئی ؟ یہ سوال گولڈ زیہر اور شاخت نے مؤطا میں موجود مرفوع احادیث کے مقابلہ میں آثار ، موقوف اور مرسل روایات کی کثرت کی نشاندہی کرتے ہوئے بھی اٹھایا ہے :-

مثال کے طور پر مؤطا کی ۱۷۲۰ روایات میں صرف چھ سو احادیث مسند ہیں یعنی جن کی سند آنحضورؐ تک بغیر کسی انقطاع کے پہنچتی ہے ۔ باقی مرویات یا تو مُرسل ہیں ۔ (تعداد ۲۲۲) یا موقوف (تعداد ۶۱۳) اور یا تابعین کے اقوال (تعداد ۲۸۵)

ان دونوں مستشرقین کے خیال میں ان آثار اور مراسیل کے ساتھ مکمل اسانید ، بعد کا اضافہ ہیں لیکن اصل حقیقت کی وضاحت کے لئے تابعین کے دور میں اسناد کی حیثیت کو متعین کرنا ہوگا ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سعید بن المسیّب جو حضرت عمرؓ کے دور میں پیدا ہوئے ، صحابہؓ کی ایک کثیر تعداد سے ملے ہوں گے ۔ ان کا ذریعہ علم بہت حد تک صحابہؓ ہی کی ذواتِ گرامی رہی ہوں گی ۔ تاہم وہ خود بھی صحابی کا نام حذف کرکے اپنی مرویات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں ۔ حسن بصری اور دیگر کئی تابعین کا بھی یہی معمول ہے ۔ ایسی ہی روایات کو مرسل کہا جاتا ہے ۔ حسن بصری سے یہ قول مروی ہے :

"اگر چار صحابہ کسی حدیث پر اتفاق کرلیں تو میں اُسے مرسل طریق سے روایت کرتا ہوا ۔" (۳۳)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کم از کم حسن بصری سے منقول روایات ایک سے زائد صحابی سے منقول ہیں، ابوزرعہ کہتے ہیں:

"جہاں کہیں حسن بصری نے یہ کہا کہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا) میں نے سوائے چار احادیث کے باقی سب جگہ انہیں صحیح پایا"

یونس بن عبید نے حسن بصری سے پوچھا:

"ابوسعید! آپ کہتے ہیں کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) حالانکہ آپؒ نے رسول اللہ ؐ کو نہیں دیکھا؟" انہوں نے جواب دیا: "تم نے ایسا سوال کیا ہے جو اس سے قبل کسی نے نہیں کیا۔ اگر تمہاری رعائت نہ ہوتی تو میں اس سوال کا جواب کبھی نہ دیتا۔ تم موجودہ حالات سے باخبر ہو۔ (یہ زمانہ حجاج کی امارت کا تھا)

جب کبھی تم مجھے یہ کہتے سنو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں علی بن ابی طالب سے روایت کرتا ہوں لیکن ان دنوں میں اُن کا نام نہیں لے سکتا" یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ سعید بن المسیّب کی اکثر روایات کی چھان بین کی گئی تو وہ ابوہریرہؓ سے مروی پائی گئیں جس کا سبب دونوں کے مابین رشتہ مصاہرت تھا۔ اس لئے ان کی مُرسل کا درجہ مُسند کا ہے" (۳۵) اُعمش نے ابراہیم نخعی سے کہا: "جب کبھی تم محمد بن موسیٰ سے روایت کرو تو مجھے مُسند طریقہ سے بیان کرو (یعنی اپنے شیخ کے نام کے ذکر کے ساتھ حدیث بیان کرو)۔

انہوں نے جواب دیا: اگر میں یہ کہوں کہ فلاں اور فلاں نے عبداللہ سے یہ روایت کی تھی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ فلاں اور فلاں نے واقعی مجھے بتایا تھا۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ (عبداللہ نے کہا) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک سے زائد شخص نے وہ روایت مجھے بیان کی تھی۔

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:

"سعید بن المسیّب مدینہ کے فقہاء کے سرخیل اور عبداللہ بن عمر کی فقہی آراء اور ابوہریرہ کی احادیث کے ان میں سب سے بہتر ناقل تھے۔ ابراہیم کوفہ کے فقہاء کے سردار تھے چنانچہ اگر وہ بغیر واسطہ کے کچھ بیان کریں تو وہ روایت دراصل اُن کے کسی نہ کسی شیخ سے صراحۃً یا کنایۃً مروی ہوتی ہے۔" (۳۷) متاخرین علماء میں سے ابن عبدالبر (۳۸) نے یہ معلوم کرنے کے لئے کافی چھان بین کی کہ موطا میں مذکور مراسیل اور بلاغات (۳۹) امام مالک کے واسطہ

کے بغیر کسی دوسرے ذریعہ سے بطورِ مُسند نقل ہوئی ہیں یا نہیں اپنی تحقیق کے نتیجہ کو وہ یُوں رقم کرتے ہیں :

" مؤطا میں وہ تمام روایات جو بغیر اسناد کے یا بَلَغَنِی (مجھے یہ بات پہنچی) کے صغیہ سے نقل ہوئی ہیں ان کی تعداد اکسٹھ ہے ۔ ان میں سوائے چار کے، باقی تمام مرویات کی امام مالک کے علاوہ دوسرے واسطوں سے غیر منقطع سند پائی گئی ۔ چنانچہ سعید بن المسیب کی مُرسل روایت سہیل بن ابی صالح عن أبیہ ابی صالح عن ابی ہریرہؓ کے واسطہ سے مسند پائی گئی " (۴۰)

أعظمی کے تحقیقی مقالہ میں سہیل بن ابی صالح کے نسخہ کی اسانید پر سیر حاصل بحث شامل ہے (۴۱)
مغربی ناقدین کو یہ غلط فہمی بھی لاحق رہی ہے کہ محدثین نے ہزار ہا احادیث کے ذخیرہ سے چند ہزار احادیث کو کیسے منتخب کیا ۔

گیوم یہ سوال کرتا ہے کہ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے چار ہزار احادیث کا انتخاب کیسے کیا ؟ (۴۲)

اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہر اسناد بطورِ خود ایک روایت شمار ہوتی ہے ۔ ایک محدث ایک ہی حدیث کو دس واسطوں سے سُن سکتا ہے اور اسی لحاظ سے اُنہیں دس شمار کیا جائے گا ۔

طبرانی میں عرایا کی رخصت پر مشتمل احادیث اس نقطہ کی وضاحت کے لئے موزوں ہیں ، طبرانی (۴۳) نے اپنے متعدد شیوخ کا ذکر کرتے ہوئے اسی ایک حدیث کو آٹھ مختلف شیوخ سے زہری عن سالم عن ابن عمر عن زید بن ثابت تک پہنچایا ہے اور سولہ مختلف ذریعوں سے نافع عن ابن عمر عن زید بن ثابت تک پہنچایا ہے ۔

بخاری نے ان مذکورہ چوبیس روایات میں سے صرف تین کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ امام بخاری کس طرح ہزار ہا تعداد میں موجود روایات میں سے چند ہزار حدیثوں کا انتخاب کر سکے ۔

نوٹ : مندرجہ بالا فصل مؤلف کی کتاب

Criticism of Ḥadīth among the Traditionists with reference to Sunan Ibn Māja

کے مقدمہ کا اُردو ترجمہ ہے ۔

حوالہ جات اور تشریحات

۱ ۔ ولیم میور The Life of Mahamet, ط لندن ۱۸۵۸ء ۱: ۳۲
سپرنگر Ueber das Traditionswesen bei den Arabern. ص ۱ — ۱۷

۲ ۔ جے رابسن Tradition, the second foundation of Islam.
بحوالہ MW 41 نمبر ۱ ۔ ص ۲۲ ۔ ۲۳

۳ ۔ گولڈ زیہر Muslim Studies. لندن ۱۹۷۱ء ۔ ۲ : ۱۹۵

۴ ۔ جوزف شاخت A revaluation of Islamic tradition.
۱۹۴۹ء ۔ ص ۱۸۱ — ۲۱۶

۵ ۔ محمد مصطفیٰ اعظمی (دوسری اور تیسری فصل)
بیروت ۔ ۱۹۶۸ ۔ فصل ۲ ۔ ۳

۶ ۔ محمد حمید اللہ ۔ صحیفہ ہمام بن منبہ ط ہندوستان ۱۹۶۱ء

۷ ۔ اعظمی ۔ ص ۹۰

۸ ۔ فؤاد سزگین ۔ تاریخ التراث العربی ۔ قاہرہ ۱۹۷۷ء ۔ ص ۹۲

۹ ۔ ایضاً ص ۹۰

۱۰ ۔ عبدالرحمٰن بن ابی حاتم الرازی ۔ کتاب الجرح والتعدیل ۔ حیدر آباد ۔ ۱ : ۲۱

۱۱ ۔ اعظمی ۔ فصل ۳

۱۲ ۔ سخاؤ Das Berliner Fragment des Musa Ibn Ukba
سنہ ۱۹۰۴ء ۔ ص ۴۴۵ ۔ ۴۷۰

۱۳ ۔ اعظمی ۔ ص ۱۵۳

۱۴ " ص ۱۶۲

۱۵ ۔ رابسن The Isnad in Muslim Tradition.
۵۴ — ۱۹۵۳ء ۔ ص ۱۵ ۔ ۲۶

۱۶ - اعظمی - ص ۲۱۳

۱۷ - جوزف شاخت The origins of Muhammadan Jurisprudence,

آکسفورڈ ۔ ۱۹۵۰ء - ص ۳۶ - ۳۷

۱۸ - رابسن - حوالہ سابقہ

۱۹ - ایضاً Isnad in Muslim Traditions,

۲۰ - رابسن

ص - ۲۱ - ۲۲

۲۱ - اعظمی - ص - ۲۱۷

۲۲ - شاخت : حوالہ سابقہ ص ۱۴۷

۲۳ - اعظمی - فصل سادس

۲۴ - " ص ۲۲۷ - ۲۳۱

۲۵ - شاخت Origin, ص ۱۵۳ - ۱۵۴

۲۶ - مزابنہ : خشک کھجوروں کو تر کھجوروں کے عوض، زبیب کو انگوروں کے عوض اور اسی طرح دوسرے پھلوں کی اندازاً افروخت۔

مزابنہ کی تعریف ابن عمر کی حدیث میں بھی وارد ہوتی ہے بحوالہ صحیح مسلم ۳ : ۸۰۸

۲۷ - مسلم بن حجاج قشیری (۲۰۶ — ۲۶۱ ھ)

صحیح مسلم : ایڈٹ کردہ محمد فوأد عبدالباقی ۳ : ۱۱۶۸

۲۸ - عرایا سے مراد کھجور کے وہ درخت ہیں جن کا پھل نخلستان کا مالک فقراء کو بطور عطیہ ہبہ کرتا ہے - مسلم ۳ : ۸۰۶ (انگریزی ترجمہ)

۲۹ - مسلم ۳ : ۱۱۶۸ (عربی ایڈیشن)

۳۰ - ایک وسق، ساٹھ صاع کے اور ایک صاع تقریباً چار سیر کے برابر ہوتا ہے -

بحوالہ مسلم ۳ : ۸۰۶ (انگریزی ترجمہ)

۳۱ - مسلم ۳ : ۱۱۷۱ (عربی ایڈیشن)

مالک : مؤطا - ط دارالنفائس بیروت ۱۹۷۷ء - ص ۴۲۷

۳۲ - حدیث مرفوع : جس کی نسبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو -
موقوف : جس کی نسبت صحابی کی طرف ہو -
مرسل : وہ حدیث جس کی اسناد سے صحابی کا نام ساقط ہو -
اثر : کا اطلاق قول رسول اور قول صحابہ و تابعین دونوں پر ہوتا ہے -
لیکن یہاں پر اقوال تابعین مراد لئے گئے ہیں -

۳۳ - ابوزہرہ : مالک ، ط قاہرہ ۱۹۶۴ء - ص ۲۹۶

۳۴ - جلال الدین بن عبدالرحمن بن ابی بکر سیوطی : تدریب الراوی ط مدینہ منورہ ۱۹۵۹ء - ص ۱۲۱

۳۵ - ایضاً -

۳۶ - ابوزہرہ - حوالہ سابقہ -

۳۷ - شاہ ولی اللہ دہلوی : حجۃ اللہ البالغہ - ص ۱۴۳

۳۸ - ابو عمر یوسف بن عبداللہ ابن عبدالبر - (۳۶۸ — ۴۶۳ھ)

۳۹ - بلاغات ، وہ احادیث جنہیں امام مالک نے مؤطا میں بصیغہ بلغنی (مجھ تک یہ بات پہنچی) روایت کیا ہے -

۴۰ - سیوطی - بحوالہ سابقہ ص ۱۲۰

۴۱ - اعظمی : نسخہ سہیل بن ابی صالح -

۴۲ - آلفورڈ گیوم : (The tradition of Islam.) ط آکسفورڈ ۱۹۲۴ء - ص - ۲۹

۴۳ - ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (۲۶۰ — ۳۶۰ھ) بغداد ۱۹۷۸ء